مدّ و جزر

(خودنوشت)

مصنّف

پروفیسر ولی الحق انصاری

پیش لفظ

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

رام پور رضا لائبریری

مدّ و جزر

(خودنوشت)

مُصنّف

پروفیسر ولی الحق انصاری

پیش لفظ

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

رام پور رضا لائبریری

مدّ و جزر

پروفیسر ولی الحق انصاری

پیش لفظ : ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

سنہ اشاعت : 2007ء

تعداد : 550

قیمت : 550روپے

ناشر : ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

(سابق ڈائریکٹر آثار قدیمہ حکومت ہند)

افسر بکار خاص، رام پور رضا لائبریری

مطبع : پرنٹولوجی اِنک

2660، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی 110002

انتساب

میں اپنی اس تصنیف کو اپنی تیسری نسل کے بچّوں

زید ہاشمی، آفرین انصاری

حسن کامران اور حمزہ وجیہ الحق

کے نام معنون کرتا ہوں

اس دُعا کے ساتھ

کہ خدا انھیں

ان کے اجداد کی زبان

اُردو پڑھنے کی توفیق عطا کرے۔

فہرست

پیش لفظ

ابتدائے آفرینش سے بنی نوع انسان کی دیرینہ خواہش رہی ہے کہ اس کی تخلیقات شاہکار ہوں۔ غالباً دہلی میں عہد مملوک کا قطب مینار اور آگرہ میں عہد مغلیہ کا حسین شاہکار تاج محل جسے حال ہی میں دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا گیا ہے انسان کی اسی آرزو کی تکمیل ہے۔

جہاں تک سفرناموں اور سوانحی حالات کا تعلق ہے تو ہمیں ایران میں حکیم ناصر خسرو کا وہ سفرنامہ ملتا ہے جو عالم اسلام کی سیاحت کے بعد رقم کیا گیا۔ اِسی طرح البیرونی نے عہد وسطیٰ میں ہندوستانی ثقافت کو اپنے اسفارِ ہند میں موضوع بحث بنایا تھا۔

عہد وسطیٰ کے عظیم شہنشاہ بابر نے اپنی خودنوشت سوانحِ حیات کو تزُکِ بابری کے نام سے ترکی میں ترتیب دیا اور عبدالرحیم خانخانان نے اِسے فارسی کا جامہ عطا کر کے یادگار بنا دیا۔ شہنشاہ جہانگیر نے بھی فارسی میں اپنی خودنوشت تزک جہانگیری لکھی تھی جس میں اس عہد کے واقعات، حالات اور بادشاہ کے مشاہدات کی تفصیل درج ہے۔ طور پر جنگلی جانوروں اور چڑیوں کے بارے میں اچھی معلومات ملتی ہیں۔ مزید عہد آخر میں ہمیں آنند رام مخلص کا سفرنامہ بھی ملتا ہے جس کا ایک قلمی نسخہ رامپور رضا لائبریری کی زینت ہے۔

رامپور رضا لائبریری کی کوشش ہے کہ وہ مشاہیر کی سوانح حیات کو شائع کرے جس سے ہمارے عہد کے مشاہیر کی زندگی کے واقعات اور حالات کو صحیح زاویۂ نظر سے تاریخ کے حوالے کیا جائے جو ہمارا تہذیبی وِرثہ ہو۔ پروفیسر وارث کرمانی صاحب کی تصنیف ''گھومتی ندی'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

میرے استاد گرامی پروفیسر ولی الحق انصاری صاحب کی خودنوشت سوانح حیات ''مدّ وجزر'' قارئین کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔

''مدّ وجزر'' وہ داستان ہے جو گذشتہ 75 سالوں کے دوران وقوع پذیر ہوئے جس میں خوشیاں بھی ہیں، غم بھی ہیں، ادب بھی ہے، شاعری بھی ہے، احساسات، جذبات اور تعلق وتاثرات کی روانی بھی ہے اور لمحات کی سرگوشیاں بھی۔

انصاری صاحب کا تعلق علمائے فرنگی محل سے ہے جن کے شاندار ماضی کو کسی شاہد کی ضرورت نہیں اور بقول مؤلف:

''اس میں زندگی کے مشاہدات بھی ہیں اور تجربات بھی، اس میں تخلیاں بھی ہیں اور شیرینی بھی، اس میں مسکراہٹیں بھی ہیں اور سسکیاں بھی۔''

ان جملوں سے والہانہ انداز اور تخاطب کا وہ جذبہ بظاہر معلوم ہوتا ہے جو مصنف کی پختہ اور بامحاورہ زبان پر گرفت کا غمازؒ ہے۔ انصاری صاحب نے اس خودنوشت کو ایک مقدمہ، ضمیمہ اور اختتامیہ کے علاوہ اکیس ابواب میں منقسم کیا ہے جس میں ہندوستان میں میرے سفر، جلوہ ہائے ایران، میری سخن سنجی' میرا مذہب اور سماجی سرگرمیاں اور خاص طور سے حلقۂ احباب اور خوشہ چینانِ علم نہایت دلچسپ اور اہم ہیں۔

پروفیسر ولی الحق انصاری صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے صدر کی حیثیت سے 1987ء میں سبکدوش ہوئے مگر ان کی علمی اور ادبی خدمات کی قدردانی 1984ء میں حکومت ہند کی طرف سے صدر جمہوریہ ہند کے سرٹیفکیٹ آف آنر کی شکل میں ہو چکی تھی۔ وہ فارسی ادب کے ایک سینئر استاد اور فارسی واردو کے مشہور شاعر اور ادیب ہیں وہ ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب

کے بھی علمبردار ہیں۔

''مدوجزر'' میں پروفیسر انصاری صاحب کی زبان نہایت شستہ ورفتہ ہے جس میں جابجا اودھ کا وِرثہ غیر شعوری طور پر ان کی تحریروں کو ایک خاص لطف سے مزّین کرتا ہے۔

''مدوجزر'' میں کچھ واقعات ذاتی نوعیت کے ہیں جو مؤلف کی زندگی میں گزرے اور اس کا احساس اُنہیں اپنی قدیم روایات اور تہذیبی ورثے کی پاسبانی پر مجبور کرتا ہے۔ کتاب میں بعض موقعوں پر کسی مسئلے کی وضاحت میں مؤلف نے جذباتی انداز میں بیانیہ تخاطب سے بھی کام لیا ہے مگر اس کی نفسیات اور شعور میں یہ بات بھی محفوظ ہے کہ وہ کسی کے دل کو ٹھیس پہنچانے کا قطعی ارادہ نہیں رکھتا ہے البتہ ان کے جذبات میں ایک والہانہ تاثر ضرور ملتا ہے۔

پروفیسر ولی الحق انصاری صاحب شاعری میں وؔلی تخلص کرتے ہیں ان کا پہلا اردو شعری مجموعہ ''غزالان خیال'' کے نام سے 1980 میں شائع ہوا جو غزلیات کا مجموعہ ہے اور اس کے بعد تو گویا یہ سلسلہ چل نکلا 1982 میں دوسرا مجموعہ کلام ''فروغ شعلۂ دل'' 1986 میں چوتھا مجموعہ ''گلزار'' 1994 میں پانچواں مجموعہ نقوشِ زیبا اور 2006 میں اردو کلام کا چھٹا مجموعہ ''کہکشاں'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اردو کے چھ مجموعہ کلام کے علاوہ ولی الحق صاحب نے فارسی کلام کے تین مجموعے بھی شائع کیے ہیں پہلا مجموعہ 1987 میں ''شعلۂ ادارک'' دوسرا مجموعہ 1989 میں ''خرمنِ گل'' اور تیسرا مجموعہ 2006 میں ''شبِ چراغِ'' کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے موصوف فارسی کے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کے مجموعے ایران میں بھی دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

بہر حال مجھے قوی امید ہے کہ پروفیسر ولی الحق انصاری صاحب کی خودنوشت سوانح

حیات ''مدوجزر'' کو علمی وادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ملے گی اور بقول شاعر ؎

دیکھو مُجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

کی مانند دینائے شعروادب میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا پروفیسر ولی الحق انصاری شرافت، نجابت، خلوص، ملنساری اور ہمدردی کا مُجسّم پیکر ہیں اوران کی خودنوشت سوانح حیات کو انہی کے ایک ایسے شعر سے خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں جس میں انہوں نے تصورِ عشق کی وضاحت کردی ہے:

عشق ہمدردی کامل کا فقط ہے اک نام
حسن کچھ بھی نہیں پاکیزہ شمائل کے سوا

میں خدا سے موصوف کی درازی عمر اور صحت وتندرستی کے لئے دعا گو ہیں اس امید کے ساتھ ؎

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

اس کتاب کی اشاعت کے لیے مہامہم شری ٹی وی راجیسور، گورنر اتر پردیش اور صدر رام پور رضا لائبریری بورڈ، شری سری جیسوال، وزیر حکومتِ ہند، نئی دہلی کا شکر گزار ہوں اور محترمہ امبکا سونی، وزارتِ ثقافت ہند، سکریٹری کے بادل داس، آئی اے ایس اور جوائنٹ سکریٹری شری لوورما، آئی اے ایس نیز مسز الکا جھا، ڈائریکٹر کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے رضا لائبریری کے اشاعتی پروگرام کے لیے خاطر خواہ گرانٹ فراہم کی۔ ساتھ ہی ساتھ بورڈ کے ممبران اور رضا

لائبریری کے لائبریری اور انفارمیشن آفیسر ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی، محترمہ بلقیس فاروقی، مِس موہنی رانی کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کے دفتری کاموں میں میری مدد کی اور مسٹر تنظیم رضا قریشی، پرنٹو لوجی اِنک، نئی دہلی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کتاب ڈیزائن کی اور اچھی طرح شائع کی۔

رنگ محل قلعہ رام پور

12 جون 2007ء

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

افسر بکار خاص

رامپور رضا لائبریری

مقدمہ

''میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے''

چند سال پہلے کی بات ہے جب ایک موقع پر میری اور عزیز گرامی ڈاکٹر نیر مسعود کی لکھنوی تہذیب اور معاشرت کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ دورانِ گفتگو موصوف نے فرمایا کہ میرزا جعفر حسین مرحوم کے بعد شاید اب آپ تنہا شخص ہیں جس نے اس مٹتی ہوئی تہذیب کا آخری دور دیکھا ہے لہٰذا مناسب ہے کہ آپ آئندہ نسل کے لیے اس تہذیب سے متعلق کچھ تحریری شکل میں چھوڑ جائیں۔ اسی زمانے میں سلی گوڑی کے قیام کے دوران وہاں کے حالات اور قدرتی مناظر پر دو قسطوں میں میرا ایک مضمون روزنامہ صحافت میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو پڑھ کر دوست محترم سبط محمد نقوی مرحوم نے بھی مجھ سے اپنی یادداشتیں قلم بند کرنے کو کہا تھا تاکہ اس قسم کے حالات آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہو جائیں۔ عزیز گرامی ڈاکٹر فدا عباس کی نظر سے بھی یہ مضمون گزرا تھا اور ان کا بھی اصرار تھا کہ اپنے مشاہدات پر مبنی واقعات کو کتابی شکل دے دوں۔ علاوہ ازیں میری زندگی عجیب اتار چڑھاؤ کے ادوار سے گذری ہے اور اس میں کچھ ایسے بھی واقعات پیش آئے ہیں جن پر مشکل ہی سے یقین کیا جا سکتا ہے لیکن جن کے چشم دید گواہ آج بھی موجود ہیں اور ایسے ہی واقعات میرے اس اعتقاد کا سبب ہوئے کہ خدا جو کرتا ہے بندے کے حق میں بہتر ہوتا ہے خواہ وقتی طور سے حالات ناساز گار نظر آئیں۔ اس کی مثالیں یہ ہیں کہ ۸؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو والد کے انتقال کے بعد ایک بڑا بار میرے سر آ پڑا تھا اور بظاہر اسے اٹھانے کا کوئی

ذریعہ نہ تھا۔ اس وقت مسلمانوں کو ملازمت ملنے کا کیا سوال تھا، اس ملک میں رہ جانا ہی مشکوک تھا۔ ان حالات میں محض ایک مہینہ میں ملازمت مل جانا اور وہ بھی اس طرح جو عام حالات میں ناممکن ہے، محض تائیدِ ایزدی نہ تھی تو اور کیا تھا، یہی حال یونیورسٹی میں ملازمت کا تھا۔ تین جگہ رد ہوا جو بہت تکلیف دہ تھا اور جہاں تقرر ہونے کے امکانات روشن تھے وہاں عارضی ملازمت کا خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد جب مجھے میرے وطن کی یونیورسٹی میں ملازمت ملنا تھی اور محض بارہ سال میں پروفیسر ہونا تھا تو رام پور، علی گڑھ اور دہلی میں میرا تقرر کیسے ہوتا۔ اسی طریقہ کا ایک معاملہ میری شادی کا تھا۔ جب ہر حال میں میرے تصوّر کے مطابق ایک خاص خاتون کو میری شریک حیات بننا تھا تو پھر غلط جگہوں کے رشتے کیسے پایۂ تکمیل کو پہنچتے۔ یہی حال زندگی کے اور شعبوں کا بھی رہا ہے جن میں وقتی طور سے میرا نقصان ہوا یا ذہنی تکلیف میں مبتلا ہوا لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ قدرت کے وہ فیصلے میرے حق میں تھے۔ دوستوں کے اصرار کے علاوہ زندگی کے تجربات بھی جو دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں، اس بات کے محرّک ہوئے کہ زندگی میں جو کچھ اچھا بُرا پیش آیا ہے صفحۂ قرطاس پر قلم بند کردوں۔ ممکن ہے کہ وہ کسی کی راہ حیات متعین کرنے میں مدد کر سکے۔ اسی جذبے کے تحت ابواب پر مشتمل یہ کتاب اہلِ نظر کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔ اس میں زندگی کے مشاہدات بھی ہیں اور تجربات بھی، اس میں تلخیاں بھی ہیں اور شیرینی بھی، اس میں مسکراہٹیں بھی ہیں اور سسکیاں بھی۔ ممکن ہے کہ اس کے کچھ جملوں سے کچھ حضرات کے جذبات کو ٹھیس لگے جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ جب زندگی کے تمام تجربوں کو تحریر کر رہا ہوں تو ایسی باتوں کو نظرانداز کرنا ممکن نہ ہوسکا۔

دوسال قبل جس وقت اس کتاب کو لکھنا شروع کیا تھا ایک زاویہ سے اطمینان سے لکھ پڑھ سکتا تھا لیکن اس وقت جب اسے ختم کر رہا ہوں اپنا لکھا ہوا خود پڑھنا بےحد دشوار معلوم ہو رہا

ہے۔ان حالات میں ممکن ہے کہ بہت سی باتوں کو مکرر تحریر کر گیا ہوں لیکن یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ تحریر کیا ہے اس میں تضاد نہیں ملے گا اس لیے کہ وہ سب حقائق پر مبنی ہے۔

محمد ولی الحق انصاری

۲۱/ربیع الاوّل ۱۴۲۸ھ

مطابق

۱۰/اپریل ۲۰۰۷ء

پہلا باب

میرے اجداد

''ہمہ قبیلۂ من عالمان دین بودند''

میرا تعلق ہندوستان کے مشہور علمی خانوادے ''علمائے فرنگی محل'' سے ہے جس کے افراد کا ذکر علمائے علوم مشرقیہ سے متعلق ہر کتاب میں ملتا ہے اور جس پر خود متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں اردو زبان میں تذکرہ علمائے فرنگی محل آخری کتاب تھی جسے مصنف کتاب مولانا عنایت اللہ صاحب مرحوم کے صاحبزادے محمد حامد انصاری صاحب کے ارشاد کے مطابق راقم الحروف نے اس سلسلہ میں اضافات کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ اس کے بعد اس خاندان سے متعلق تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل لکھی جانے والی ایک دوسری فارسی تصنیف (مصنفۂ مولانا خلیل اللہ) بنام تحفۃ الاحباب معہ اردو ترجمہ کے امیر الدولہ پبلک لائبریری سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔ ۲۰۰۴ء میں اس خاندان سے متعلق خود راقم الحروف کی ایک انگریزی تالیف بنام (Farangi Mahal-- past & present) پردۂ شہود پر آئی۔ ان تمام کتابوں کی موجودگی میں خاندان کے روشن ماضی کے متعلق لکھنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی ناظرین کی اطلاع کے لیے مختصراً یہ لکھا جانا مناسب ہے کہ اس خاندان کے اجداد کا تعلق اولاد صحابی و میزبان

رسولؐ حضرت ابوایوب انصاری خزرجی سے ہے۔ موصوف کی نسل میں ایک یگانہ عصر صوفی بزرگ اور فارسی زبان کے ایک معروف مصنف حضرت عبداللہ انصاری ہروی (متوفی ۱۰۸۸ء) گزرے ہیں جن کا شمار آج تک افغانستان کی محترم ترین شخصیت کی حیثیت سے ہوتا ہے ۱۲۲۰ء میں چنگیز کے خراسان پر حملہ کے دوران، ان کی اور ان کے بھائی اور دوسرے عزیزوں کی اولادیں جو ایک قبیلہ کی شکل اختیار کر چکی تھیں ہرات سے ہجرت کر کے ہندوستان آئیں لیکن بقول مصنف چشتیہ بہشتیہ (مصنفہ علاء الدین برنادہ) چند پشتوں کے بعد ناسازگار حالات کی وجہ سے سوائے ایک صاحب شیخ شرف الدین کے (جن کی نسل سے آئندہ خاندان علمائے برناوہ وجود میں آیا) باقی پورا قبیلہ ہرات واپس چلا گیا لیکن یہ واپسی عارضی ثابت ہوئی اور چند ہی پشتیں گذرنے کے بعد غالباً تیمور کے حملے کی شورش کی وجہ سے اس قبیلہ کے متعدد افراد کو دوبارہ ہندوستان کا رخ کرنا پڑا۔ ان دونوں ہجرتوں میں ہندوستان آنے والوں کے اخلاف آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں موجود ہیں چنانچہ اکبر کے عہد کے مشہور عالم مخدوم الملک بھی پنجاب میں سلطانپور کے ایک ایسے ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے خاندان کے علاوہ پاکستان سے شایع ہونے والی ایک اردو تصنیف ''پنجاب اور اہلِ پنجاب'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع جھنگ میں دریائے جھیلم کے کنارے آباد چنیوٹ نامی ایک قصبے میں انصاریان ہرات کی ایک شاخ آج بھی آباد ہے۔ شمالی ہندوستان میں انصاریانِ ہرات کے مراکز برناوہ ضلع میرٹھ، شہر سہارنپور اور اس کے مختلف قصبات مثلاً انبہٹہ، گنگوہ، دیوبند وغیرہ، سنبھل ضلع مرادآباد، پانی پت (موجودہ صوبہ ہریانہ)، ضلع بارہ بنکی کے مختلف قصبات سہالی، فتح پور، سدّھور، وغیرہ، یوسف پور ضلع غازیپور میں قائم ہوئے اور جو اطلاعات ملتی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ یہ تمام خاندان علمی گھرانے تھے۔ شمالی ہندوستان کے علاوہ

جنوبی ہند میں بھی ایک انصاری خاندان کا پتا چلتا ہے جس کا تعلق شیخ علاء الدین نامی ایک بزرگ سے بتایا جاتا ہے جن کا مزار گلبرگہ کے قریبا ایک مقام اُلند میں آج تک موجود ہے۔

سہالی ضلع بارہ بنکی میں آباد ہونے والے انصاری خاندان کے مورث اعلیٰ قطب عالم شیخ علاء الدین ہروی تھے اور وہ بھی انصاریانِ ہرات کی اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے جو تیمور کے حملہ کے دوران دوبارہ ہندوستان آئے۔ان کے ساتھ آنے والوں میں انصاریانِ پانی پت اور انصاریانِ سنبھل کے اجداد بھی شامل تھے۔شیخ علاء الدین ہروی کے سہالی میں آباد ہونے والے اخلاف میں آخری بزرگ ملا قطب الدین شہید اورنگ زیب کے معاصر تھے۔ان کی شہادت کے بعد اورنگ زیب کے ایک فرمان کے مطابق جو اُن کے بیٹوں ملا اسعد اور ملا سعید کے نام جاری ہوا، ان کے خاندان کے باقی ماندہ افراد کو لکھنؤ بھیج دیا گیا اور احاطۂ چراغ بیگ میں دو عمارتیں جنھیں کوئی یورپین تاجر خالی کر گیا تھا (اور جو اسی مناسبت سے فرنگی کا محل کہلاتی تھیں) ان کے قیام کے لیے مختص ہوئیں۔ ملا قطب الدین شہید کے تیسرے بیٹے ملا نظام الدین نے اپنے چھوٹے بھائی ملا رضا اور بھتیجوں ملا احمد عبدالحق ،اور ملا عبدالعزیز وغیرہ کے ساتھ اسی فرنگی کے محل میں مسندِ درس آراستہ کی اور اسی مناسبت سے آئندہ جو علمی ادارہ وجود میں آیا وہ فرنگی محل کہلایا۔خود میرا تعلق انھیں ملا نظام الدین کے منجھلے بھائی ملا سعید (جو اولادِ ملا قطب الدین کو فرنگی محل میں آباد کر کے اورنگ زیب کے پاس دکن چلے گئے تھے) سے ہے جو آٹھ پشت پہلے میرے جد تھے۔

یہاں یہ لکھنا بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ فرنگی محل لکھنؤ میں آٹھ نو پشتوں تک اولادِ ملا قطب الدین شہید ایک متحدہ گروہ (Compact Group) کی حیثیت سے رہی اور یہاں ہر نسل میں کم از کم ایک یگانۂ عصر عالم پیدا ہوتا رہا۔خاندان کے تمام افراد، خواہ ان کی رشتہ داریاں کتنی

ہی دور کی ہو چکی ہوں مثل سگے عزیزوں کے رہتے رہے اور ہر شخص کے ذاتی مسئلہ کو خاندانی مسئلہ سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ یہ خصوصیت ۱۹۴۷ء تک قائم رہی، البتہ خاندان کے وہ حضرات جو معاشی ضروریات کے تحت ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں آباد ہو گئے ان کا تعلق خاندان سے منقطع ہوتا گیا۔ ایسے افراد کا تعلق زیادہ تر ملا قطب الدین کے بڑے بیٹے ملا اسعد کے اخلاف سے ہے۔ ان کے افراد مرزا پور، ناگپور، رامپور، کان پور وغیرہ چلے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ ان کی اولادیں آج بھی وہاں ہوں۔ چھوٹے بھائی ملا رضا کی اولاد بھی، کئی پشتوں تک لکھنؤ سے باہر رہی اور ان کی نسل کے لوگ بھی خاندان سے الگ ہو گئے لیکن بعد کو وہ فرنگی محل واپس ہو گئے لیکن تقسیم ہند کے بعد یہ کیفیت باقی نہ رہی۔ خاندان کے متعدد افراد پاکستان چلے گئے اور وہاں بھی حالات کو ناسازگار پانے کے بعد ان میں سے بیشتر مختلف مغربی ممالک، کنیڈا، امریکہ، نیوزی لینڈ، ملیشیا وغیرہ ہجرت کر گئے۔ یہی حال کچھ ہندوستان میں رہ جانے والوں کا بھی ہوا۔ بعد کو ان میں سے بھی بہت سے حضرات دوسرے ملکوں میں آباد ہو چکے ہیں جن میں میرے بھائی ڈاکٹر زبیر رشید الحق بھی شامل ہیں جو اَب انگلینڈ کے شہری ہو چکے ہیں۔ جو حضرات اب بھی لکھنؤ میں ہیں اُن میں سے بیشتر فرنگی محل سے باہر جا کر نئی کالونیوں میں آباد ہیں اور صرف گنتی کے چند ہی خاندان ہیں جو اب بھی وضعداری نباہے ہوئے ہیں اور فرنگی محل میں مقیم ہیں۔ خاندان کی نہ صرف علمی مرکزیت ختم ہو چکی ہے بلکہ خاندانی اتحاد بھی ویسا نہیں رہ گیا ہے جیسا ساٹھ سال پہلے تھا۔ خاندان کی وہ زبردست عصبیت بھی ختم ہو چکی ہے جس کے نتیجہ میں اگر کوئی شخص چند مستند خاندانوں کے علاوہ کسی غیر معروف خاندان میں شادی کر لیتا تھا تو اس کی اولاد کا پھر خاندان میں رشتہ ہونا ناممکن ہو جاتا تھا۔

دوسرا باب

لکھنؤ۔ (دورِ عروج)

''یہ پاک شہر یہ مرے اجداد کا وطن''

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اورنگ زیب کے ایک فرمان کے مطابق میرے اجداد سہالی سے لکھنؤ آئے۔ یہ ۱۶۹۳ء کا واقعہ ہے جب لکھنؤ صرف ایک معمولی قصبہ تھا جس پر شیوخ لکھنؤ کا تسلط تھا۔

لکھنؤ کے متعلق مختلف روایتیں ہیں جن میں سب سے غیر معتبر وہ روایت ہے جس کے مطابق لکھنؤ کو شری رام چندر جی کے بھائی لکشمن جی سے نسبت دی جاتی ہے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق مسلمانوں کی آمد کے پہلے یہاں بھار اور پاسی راجاؤں کی حکومت تھی۔ انہیں حکمرانوں میں ایک لکھن پاسی بھی تھا اور کہا جاتا ہے کہ اسی نے اس آبادی کی بنیاد ڈالی جو آج شہر لکھنؤ ہے۔ یہ روایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اودھ اور اس کے مضافات میں بہت سی آبادیاں ہیں جس کے ناموں کے آگے ''مئو'' لکھا جاتا ہے جیسے بھان مئو، پھاپھا مئو، بانگر مئو، گوپا مئو، دل مئو وغیرہ۔ ممکن ہے جو قریہ لکھن پاسی نے آباد کیا ہے اس کا نام اس کی مناسبت سے لکھن مئو ہو، جو کثرت استعمال سے لکھنؤ ہو گیا۔ یہ بھی صرف ایک قیاس ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔ تاریخی حیثیت سے غالباً ابوالفضل پہلا شخص ہے جس نے لکھنؤ کا ذکر شرقی سلطنت کے سلسلے میں کیا ہے

۔یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ شرقی حکومت کے خاتمے کے بعد بہلول لودی نے اپنے بھائی کو جو کالا پہاڑ کے نام سے موسوم تھا جونپور کا گورنر بنایا تھا۔ پرانے لکھنؤ میں آج بھی ایک محلّہ ہے جو کالا پہاڑ کے نام سے موسوم ہے، ممکن ہے کہ بہلول لودی کے بھائی کالا پہاڑ کا انتقال لکھنؤ ہی میں ہوا ہو اور اس کے مدفن کا علاقہ اس کے نام سے مشہور ہو گیا۔ عہدِ اکبری میں یہ باقاعدہ سلطنت مغلیہ کا حصّہ تھا اور حکومت کی طرف سے شیخ عبدالرَّحیم یہاں کے گورنر تھے۔ عبدالرحیم وہی ہیں جو شیوخ لکھنؤ کے جد تھے اور جس کا مزار موجودہ نادان محل روڈ کے کنارے ایک پارک میں موجود ہے۔ شیخ عبدالرحیم کے بعد بھی لکھنؤ پر ان کے اخلاف کا تسلط برقرار رہا۔ ان کا رہائشی قلعہ دریائے گومتی کے کنارے اس ٹیلہ پر تھا جس پر آج (King George Medical University) کی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ برہان الملک کے اودھ کے صوبیدار ہونے کے بعد شیوخ لکھنؤ پر زوال آ گیا۔ ان کا قلعہ جس کا پھاٹک شیخن دروازہ کہلاتا تھا مسمار ہو گیا، اور انہیں لکھنؤ کے قرب و جوار کے قصبوں میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔

برہان الملک کا لکھنؤ پر قبضہ ضرور ہوا لیکن انہیں اس شہر کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی۔ ان کے جانشین اور داماد صفدر جنگ کی پوری زندگی دہلی کی سیاسی سرگرمیوں میں گذری اور ان کی طرف سے ان کے نائب گورنر اودھ پر حکومت کرتے رہے۔ صفدر جنگ کے بعد شجاع الدولہ مستقل طور سے اودھ آ گئے۔ لیکن ان کا مستقل قیام نو آباد قصبۂ فیض آباد میں رہا۔ اس کے بعد خاندانی مناقشہ شروع ہوا۔ بہو بیگم اور آصف الدولہ میں اقتدار کی رسّہ کشی ہونے لگی۔ وارن ہسٹنگز کی ایما پر بہو بیگم سے زبردستی روپیہ وصول کیا گیا۔ اس شر میں ایک خیر کا پہلو یہ نکلا کہ پھر آصف الدولہ فیض آباد میں نہ ٹھہر سکے اور انہوں نے لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ اس واقعہ سے لکھنؤ کی ایک نئی تاریخ کی ابتداء ہوتی ہے۔

نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں نے دہلی کو برباد کر دیا۔ رہی سہی کسر مرہٹوں، جاٹوں، اور روہیلوں کی لوٹ مار نے پوری کر دی۔ نام نہاد ''شہنشاہ ہندوستان'' شاہ عالم نے ۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر کے بعد چھبیس (۲۶) لاکھ روپیہ کی سالانہ پنشن کے عوض پورے بنگال کو (جس میں موجودہ بہار بھی شامل تھا) انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا اور بعد کو غلام قادر کے ہاتھوں اندھا ہونے کے بعد وہ اس حد تک مجبور ہو گیا کہ اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کے لیے مہاراجہ سندھیا کو بیٹا اور بیگم سمرو کو بیٹی بنانا پڑا۔

اس افراتفری کے دور میں شرفا کا دلی میں رہنا دشوار ہو گیا اور انہیں جائے پناہ صرف فیض آباد نظر آئی۔ دلّی اجڑتا گیا اور فیض آباد آباد ہوتا گیا لیکن یہ آبادی اور رونق چند روزہ تھی۔ آصف الدولہ کے لکھنؤ آنے کے بعد وہ تمام رونق لکھنؤ منتقل ہو گئی اور یہاں اس تہذیب کے ارتقا کا آغاز ہوا جو اپنی خصوصیات کے لیے ہندوستان بھر میں امتیازی حیثیت سے دیکھی جاتی تھی۔ اس تہذیب کے خصوصی اجزاء، نفاست، نزاکت، نرم گفتاری اور اعلیٰ اخلاق تھے لیکن بدقسمتی سے اجڈوں نے جو اس تہذیب سے نہ صرف ناواقف تھے بلکہ احساسِ کمتری میں بھی مبتلا تھے اس نزاکت کا مفہوم جسمانی نزاکت یعنی زنانہ پن سمجھ لیا، جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اس ابھرتی ہوئی تہذیب میں ان بانکوں کا بھی ہاتھ تھا جو اپنی وضعداری کے لیے جان دے دینا ایک معمولی بات سمجھتے تھے اور جو بات کے اتنے دھنی ہوتے تھے کہ ان کے مونچھ کے بال کو رہن رکھ کر قرض کی رقمیں دے دی جاتی تھیں۔ اس بات کا اندازہ ان مشہور قصّوں سے کیا جا سکتا ہے جن کے حوالے کتابوں میں اب تک ملتے ہیں۔ مثلاً ایک بانکے نے اپنے مکان کے سامنے راستے میں تلوار لٹکا دی تھی اور اس کا حکم تھا کہ سب کو تلوار کے نیچے سے سر جھکا کر جانا ہے۔ نواب سعادت علی خاں کو خبر ہوئی انہوں نے خود اس راستے سے جانا طے کیا اور یہ دیکھنا چاہا کہ بانکے کا کیا ردِ عمل

ہوتا ہے نواب صاحب جب وہاں پہنچے تو بانکے نے بڑھ کر صرف اتنا عرض کیا کہ حضور ادھر سے نہ گذریں ورنہ اس غلام کی جان جائے گی۔ یعنی یہ کہ اگر آپ بھی بغیر سر جھکائے گزرنا چاہیں گے تو بزور آپ کو بھی روکا جائے گا اس میں خواہ جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ یا کسی دوسرے بانکے کا قصّہ ہے کہ وہ کسی مہاجن کے پاس گیا اور مونچھ کا بال اکھاڑ کر اسے رہن رکھ کر روپیہ دینے کو کہا۔ مہاجن سمجھتا تھا کہ بانکا اپنی مونچھ کے بال کو اپنی عزّت سمجھتا ہے چنانچہ اس نے روپیہ دے دیا۔ ایک دوسرا شخص یہ تماشا دیکھ رہا تھا اس کو مہاجن سے روپیہ وصول کرنے کا یہ آسان طریقہ معلوم ہوا، چنانچہ وہ بھی مہاجن کے پاس گیا اور مونچھ کے بال اکھاڑ کر اسے دے کر روپیہ طلب کیا۔ مہاجن کو اس کے بانکے ہونے پر شبہ ہوا چنانچہ اس نے کہا کہ میاں جی یہ بال ٹھیک نہیں ہے دوسرا دے دیجئے۔ وہ شخص بات کی نزاکت کو نہ سمجھ سکا اور دوسرا بال اکھاڑ کر دے دیا۔ مہاجن سمجھ گیا کہ وہ شخص بانکا نہیں ہے اور مکّار ہے اس لیے کہ کوئی بانکا اپنے مونچھ کے بال کی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ نزاکت جس پر طنز کیا جاتا رہا ہے زبان کی نزاکت تھی، رہن سہن کے طور طریقوں کی نزاکت تھی، لباس کی نزاکت تھی، اندازِ گفتگو کی نزاکت تھی نہ کہ جسمانی نزاکت جیسا کہ نادان سمجھتے ہیں۔ اس تہذیب کے ارتقا میں لکھنؤ کے سبھی باشندوں کا ہاتھ تھا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ اس تہذیب کا خاص عنصر اُردو زبان تھی اور اس تہذیب کو اُردو تہذیب کہنا غلط نہ ہوگا۔ ایک سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ اس تہذیب کی ابتدا کیسے ہوئی۔ حقیقتاً وہ ایرانی تہذیب کی دین تھی۔ ۱۹۷۶ء میں پہلی بار ایران میں اصفہان جا کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں لکھنؤ میں ہوں۔ لوگوں کا انکساری سے ملنا، مہمان نوازی، نرم گفتاری وغیرہ وہی تھے جس کا پرتو لکھنؤ کی شائستگی تھی اور انہیں تہذیبی عناصر کی وجہ سے اصفہان نصف جہان کہلاتا تھا۔ میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ اگر اصفہان نصف جہاں تھا تو بقیہ نصف جہاں لکھنؤ تھا۔ اصفہانی اور لکھنوی

تہذیبوں کی مماثلت کا اندازہ ایک دوسری بات سے ہوتا ہے۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا مقصد وہ نہیں ہوتا تھا جو ظاہر کیا جاتا تھا مثلاً لکھنوی تہذیب کا جز ہے کہ اگر کوئی شخص کھانا کھا رہا ہو اور کوئی دوسرا شخص آ جائے تو اسے کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی لیکن اس کا مقصد یہ نہ ہوگا کہ دوسرا شخص واقعی کھانے میں شریک ہو جائے۔ یہ بات محض اخلاقاً کہی جاتی ہے اور اگر دوسرا شخص تہذیبی قدروں سے ناواقف ہے تو وہ اس بات کو سمجھ کر صرف یہ کہہ دے گا کہ بسم اللہ فرمائیں۔ اصفہانی تہذیب میں بھی کچھ یہی بات ہے۔ جس شخص سے آپ کی ملاقات ہوگی وہ آپ سے اپنے یہاں چلنے کو ضرور کہے گا لیکن اس کا مقصد یہ نہ ہوگا کہ آپ واقعی اس کے یہاں پہنچ جائیں۔ یہی حال کچھ ''پہلے آپ۔ پہلے آپ'' کا ہے۔ یہ بات بھی اصفہانی اور لکھنوی تہذیبوں میں مشترک ہے اور تہذیبی انکساری اور شائستگی کی مظہر ہے لیکن اس کی باریکی کو نہ سمجھتے ہوئے لکھنوی تہذیب کے باہری نقالوں نے اسے اس طرح برتنا شروع کر دیا کہ وہ ایک مضحکہ خیز بات بن گئی۔ آپ اِن کو اور ایسی ہی دوسری باتوں کو تہذیبی عناصر سمجھیں یا دنیا داری، بناوٹ، اور منافقت، یہ آپ کی مرضی۔

اُردو زبان، جو تہذیب کی سب سے بڑی علامت ہے، کی اصلاح کرنے والوں نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ زبان سے کرخت الفاظ کو نکال دیا جائے۔ چنانچہ لکھنوی تہذیب کا کوئی پیرو سوائے آپ کے تم اور تو کر کے بات نہ کرے گا خواہ مخاطب کوئی بچہ یا کم مرتبہ شخص ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وہ اندازِ گفتگو ہے جس سے دوسری جگہوں پر اہل لکھنؤ کی شناخت ہوتی ہے جس کا خود مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ کلکتہ کے دورانِ قیام ایک مرتبہ ایک قصاب کی دوکان پر جانے کا اتفاق ہوا، مجھ سے دو جملے سننے کے بعد ہی وہ پوچھ بیٹھا کہ کیا آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں؟ لکھنوی زبان کے نادان بیرونی نقّالوں نے زبان کی اس باریکی کو بھی نہ سمجھا اور آج بھی ہم

دیکھتے ہیں یہ لوگ جس میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر تک شامل ہیں کس طرح زبان کو بگاڑتے ہیں۔لباس کی نزاکت کا بھی یہی حال تھا۔آب وہوا کو دیکھتے ہوئے ہلکے سے ہلکے کپڑے ایجاد ہوئے جن میں ململ کا کرتا، انگرکھا، دوپلی ٹوپی اور چوڑی دار پائجامہ شامل تھے اور یہی گذشتہ لکھنؤ کا عام لباس تھا۔وقت کے بدلنے کے ساتھ انگرکھا اب متروک ہو چکا ہے۔ نازک چکن کے کرتوں کی جگہ بدقطع تمبونما موٹے دھاگوں سے بنی ہوئے چکن کے کرتوں نے لے لی ہے اور خوبصورت چکن کی دوپلّی ٹوپیاں پہننے کا رواج یا تو ختم ہو گیا یا ان کی جگہ بھدّی ٹوپیوں نے لے لی ہے۔اہلِ لکھنؤ نے بھی مجبوراً اس لباس کو ترک کر دیا لیکن میرے ہی ایک باہری کرم فرمانے جو اپنے کو اہلِ زبان بھی خیال فرمانے لگے تھے لکھنؤ آ کر یہ متروک وضع اختیار کر لی اور ایک تماشہ بن گئے۔ یہ نفاست و نزاکت آدابِ محفل میں بھی نمایاں تھی۔ ہر چھوٹا اپنے بزرگ کے لیے آگے جگہ خالی کر دیتا تھا خواہ وہ اس کا مخالف ہی کیوں نہ ہو۔جب کوئی نیا شخص محفل میں آجاتا تھا تو اہلِ محفل احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے اور آنے والا آداب کرتا ہوا اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا تھا۔ عام محفلوں کے علاوہ آدابِ دسترخوان بھی مقرر تھے۔اگر کوئی شخص دوسروں سے پہلے کھانا ختم کر کے دسترخوان سے اُٹھ جاتا تھا تو اسے بدتمیز خیال کیا جاتا تھا۔یہی کچھ حال ادبی محفلوں کا بھی ہوتا تھا۔ ہر شخص اپنے مقام کو سمجھتا تھا اور وہیں بیٹھ جاتا تھا۔مشاعروں میں اگر شعر پر داد ملتی تو آداب عرض کرنا بھی ایک فریضہ تھا۔

لکھنؤ میں نوابی دور سعادت علی خاں کے عہد حکومت کے ساتھ ختم ہو گیا اور عہد غازی الدین حیدر سے بادشاہی دور شروع ہوا۔نوابینِ اودھ جو بظاہر سلطنت دہلی کے وزیر تھے حقیقتاً خودمختار تھے لیکن لارڈ ولزلی کی پالیسی (Subsidiary Alliance) کے تحت دوسری بہت سی دیسی ریاستوں کی طرح اودھ کی خودمختاری بھی عملی طور سے ختم ہو گئی اور حکمراں انگریز رزیڈنٹ

کے سامنے بے بس تھے۔ یہ بے بسی بادشاہت (جو خود انگریزوں کی مصلحتوں کے تحت قائم ہوئی تھی) کے دور میں اور بڑھ گئی اور ان نام نہاد بادشاہوں کو یہ اختیار بھی نہ تھا کہ اپنی بیگمات کو اپنی مرضی کے مطابق خطابات بھی دے سکیں۔ ان بیچاروں کی عملی حیثیت تعلقداروں سے زیادہ نہ تھی اور انہیں ہر بات میں رزیڈنٹ کی مرضی کا تابع رہنا پڑتا تھا۔ ان حالات کا ایک مثبت پہلو بھی تھا۔ حکومت کی اہم ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر ان کی توجہ ثقافتی امور اور مذہبیات کی طرف مبذول ہوگئی۔ دولت کی زیادتی نے عوام کو بھی عیش و عشرت کی طرف راغب کیا اور تفریح کے نئے نئے مشغلے وجود میں آئے۔ مغل شاہنشاہوں کے عہد میں ہاتھیوں کی لڑائی ایک دلچسپ مشغلہ تھا، اس عہد میں اس کی جگہ مرغ، تیتر، اور بٹیر، کی لڑائیوں نے لے لی۔ بٹیر بازی ایک فن بن گئی جس کے باقاعدہ استاد ہونے لگے۔ یہ لوگ نہ صرف بٹیروں کو سدھاتے تھے بلکہ ان کے پنجے درست کرنے کے لیے ناخون کو تراش کر تیز کرتے تھے تاکہ وہ حریف کو آسانی سے شکست دے سکیں۔ بٹیروں کی پالیاں ہوا کرتی تھیں جن میں شرفاء اور روسائے شہر باقاعدہ حصّہ لیتے تھے۔ بٹیروں کو صف شکن قسم کے خطابات دئے جاتے تھے۔ ایسی ہی کچھ تصوراتی پالیوں کا ذکر رتن ناتھ سرشار نے فسانہ آزاد میں کیا ہے۔ اہل لکھنؤ کا دوسرا شوق کبوتر بازی تھا۔ یہ شوق کچھ لکھنؤ کی جدّت نہ تھی۔ عہد بابر سے مغلیہ سلاطین کبوتر بازی کے شوقین تھے اور کہا جاتا ہے کہ جہانگیر اور نور جہاں کے معاشقہ کی ابتداء اسی شوق کے بدولت ہوئی۔ بٹیر بازی کی طرح کبوتر بازی بھی ایک فن بن گیا جس کے اساتذہ کبوتروں کو اس طرح سدھاتے تھے کہ وہ ان کے اشاروں کے مطابق پرواز کرتے تھے۔ کبوتروں کی دو قسمیں ہوا کرتی تھیں، گرہ باز اور گولہ، گرہ باز صرف ہرے، کاسنی، عنبر سرے اور سفید ہوتے تھے۔ سفید گرہ بازوں کی دو قسمیں ہوتی تھیں، سفید بے داغ اور کلچو نچے۔ سفید بے داغوں میں اگر چونچ کا کچھ حصّہ یا ایک بھی ناخن سیاہ ہوتا

تو وہ عیب سمجھا جاتا تھا اور کلچو نچوں میں اگر ایک بھی ناخن سفید ہوتا تھا تو وہ ان کا عیب تھا۔ گرہ باز کبوتروں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ گھر سے اڑ کر سیدھے بلندی کی طرف جاتے تھے اور کبھی کبھی اتنا بلند ہو جاتے تھے کہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ اچھے گرہ باز کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اتنا سیدھا اوپر جاتا ہے کہ وہ جہاں سے اڑتا ہے وہاں اگر تسلے میں پانی بھر کر رکھ دیا جائے تو اس کا عکس اس میں پڑتا رہے گا۔ گرہ بازوں کی اڑان کے مقابلے میں یہ دیکھا جاتا تھا کہ وہ کتنے گھنٹے فضا میں ٹھہر سکتے ہیں۔ کبوتروں کی دوسری قسم گولہ ہوتی ہے ان کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، ایک بڑے سائز کے پاموز اور دوسرے بڑے سائز کے شیرازی اور تیسرے لقّا کبوتر ہوا کرتے تھے۔ آخرالذّکر اکڑتے اکڑتے قلابازی تک کھا جاتے تھے۔ ان تینوں قسموں کے گولہ کبوتر اڑائے جانے کے لائق نہیں ہوتے تھے اور صرف اپنی خوبصورتی کے لیے پالے جاتے تھے۔ اڑنے والے گولہ کبوتروں کا سائز چھوٹا اور گرہ بازوں کی برابر ہوتا ہے۔ گرابازوں کے بر خلاف وہ اونچے نہیں اڑتے ہیں بلکہ نیچے دور تک جانے والے ہوتے ہیں اور اڑانے والے کے اشاروں کے مطابق اڑتے ہیں۔ ان کی رنگوں کے مطابق مختلف قسمیں ہوتی ہیں مثلاً شیرازی، چپ، پلنخے وغیرہ۔ ان کی یہ قسمیں اس حساب سے ہوتی ہیں کہ ان کا کتنا حصّہ ایک رنگ کا ہے اور کتنا سفید مثلاً شیرازی میں بازو رنگین (سیاہ یا کتھئی) اور پورا نچلا حصّہ سفید ہوتا ہے یا چپ میں ایک بازو اور نصف نیچے کا حصّہ رنگین اور بقیہ سفید ہوتا ہے۔ کبوتر باز اپنی فنکاری سے ان کے پروں کے رنگ بدل دیا کرتے تھے جس کو اصطلاحاً ''بنانا'' کہا جاتا تھا۔ تیسرا عام شوق جو عوام اور خواص دونوں میں مقبول تھا، پتنگ بازی تھا۔ پتنگوں میں بہت چھوٹی ''دمڑچی'' سے لے کر پون تاوے تک ہوتے تھے۔ یہ شوق ایک صنعت کو بھی وجود میں لانے کا باعث بنا جس سے کافی لوگ روزی کماتے تھے۔ ایک گروہ ان کا تھا جو صرف پتنگیں بناتے تھے، دوسرا گروہ ان لوگوں پر

مشتمل ہوتا تھا جو مختلف قسم کی ڈوریں بناتے تھے۔ مضبوط ڈور جو کنکوّے کا وزن سنبھالتی تھی اور جس کے ذریعہ اسے حرکت دی جاتی تھی ''سادی'' کہلاتی تھی۔ اس کے بنانے والے مخصوص لوگ ہوتے تھے ڈور بنانے والوں میں دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوتا تھا جو ''ریل'' سوتتے تھے۔ ''ریل'' اصطلاحاً وہ مضبوط مہین تاگا ہوتا تھا جس پر شیشے کا سفوف چڑھا دیا جاتا تھا اور پیچ لڑانے میں یہی ''ریل'' حریف کی پتنگوں کو کاٹنے کا باعث ہوتی تھی۔ پتنگ سازی کی انڈسٹری کے علاوہ یہ شوق ایک اور قسم کے لوگوں کی روزی روٹی کا ذریعہ بنتا تھا۔ یہ لوگ کٹے ہوئے پتنگ اور اس کی ڈور لوٹتے تھے اور بعد میں اسے بیچ لیا کرتے تھے۔ کنکیاں سائز کے علاوہ مختلف رنگوں اور ڈزائینوں کی بھی ہوا کرتی تھیں جن میں مانگ دار، چپ، الفیہ وغیرہ کے علاوہ ایک قسم ''مقیشیا'' بھی تھی اس میں سونے چاندی کے تاروں کے پُھندنے بنا کر پتنگ کے سرے سے آویزاں کر دئے جاتے تھے۔ ایسی پتنگوں کے اڑانے اور لڑانے کا مقصد اظہارِ امارت کے علاوہ غرباء کی مدد کرنا ہوتا تھا۔ متذکرہ مختلف بازیوں کے علاوہ کچھ مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا بھی رواج تھا۔ ان میں پٹا بانا، بانک، بنوٹ، لکڑی، پنجہ کشی، کشتی، پیراکی وغیرہ شامل تھے۔ ان تمام فنون میں استادی اور شاگردی کا ایک خاص رشتہ ہوا کرتا تھا اور جانشینی کے وقت صرف یہ دیکھا جاتا تھا کہ کون شاگرد استاد کی جگہ لینے کا واقعی اہل ہے۔ شاگرد کا مرتبہ بیٹے سے کم نہیں ہوتا تھا۔ عہد شاہی کے اس قسم کے فنکاروں کے جو نام مجھ تک پہنچے ہیں ان میں بڑے سیّد اور چھوٹے سیّد کشتی کے استاد سمجھے جاتے تھے اور ایک تیسرا نام (جو غالباً لقب تھا) میر مچھلی کا تھا جو فن شناوری کے اتنے بڑے استاد تھے کہ میر مچھلی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ جہاں تک اندازہ ہے ان تمام فنون میں خواص کی دلچسپی کم تھی۔ لکھنؤ کا یہ نوابی اور شاہی دور صرف عیش وعشرت اور تفریحات ہی کا دور نہ تھا۔ اس زمانے میں علوم کی ترویج کے معاملے میں لکھنؤ ہندوستان کا سب سے بڑا مرکز بن

چکا تھا۔ یہ مذہبی ادارۂ فرنگی محل کے عروج کا دور تھا۔ اس عہد سے قبل مختلف علماء اپنے طور پر مختلف کتابوں کا درس دیتے تھے۔ اس عہد کے ابتدائی زمانے میں ایسے درس ترتیب دئے گئے جن کے مطابق تمام مدارس میں یکساں تعلیمی معیار وجود میں آیا اور ان درسوں میں ایک وہ تھا جسے دہلی میں شاہ ولی اللہ نے ترتیب دیا تھا اور دوسرا وہ تھا جسے ملا نظام الدین نے لکھنؤ میں ترتیب دیا۔ اوّل الذکر تمام تر منقولات پر مبنی تھا اور ثانی الذکر میں معقولات اور منقولات دونوں کو شامل کیا گیا۔ یہ درس جو درسِ نظامی کے نام سے مشہور ہے ہندوستان بھر میں مقبول ہوا۔ معقولات کے شمول کی وجہ سے دوسرے مسلکوں اور مذاہب کے تشنگانِ علم کو بھی اس سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ اس عہد میں فرنگی محل کے علماء کی شاگردی یا کم از کم ان سے فاتحۂ فراغ پڑھایا جانا ایک سعادت اور فخر کی بات سمجھی جاتی تھی اور بقول مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ہندوستان بھر سے تشنگانِ علم لکھنؤ تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ علمائے فرنگی محل نے بہر حال میں اپنی آزاد مزاجی برقرار رکھی۔ ان میں سے کچھ مثلاً مفتی محمد یعقوبؒ حکومت اودھ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے مفتی تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کے شاہانِ وقت سے اختلافات رہے اور انہوں نے لکھنؤ مستقل طور پر چھوڑ دیا۔ ان میں سب سے مشہور عالم ملا بحر العلوم اور ان کے معاصر ملا حسن شامل ہیں۔ انگریزی دور میں بھی کچھ حضرات ایسے تھے جنہیں انگریزوں کی طرف سے مفتی کا عہدہ پیش ہوا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اسی عہد میں علماء کا ایک اور طبقہ وجود میں آیا۔ آصف الدولہ نے قصبۂ جائس ضلع رائے بریلی سے مولانا دلدار علی نقوی کو لکھنؤ بلایا اور اس طرح شیعہ فقہہ کی ترویج بھی لکھنؤ سے شروع ہوئی اور لکھنؤ شیعی علوم کا بھی مرکز بن گیا۔

مذہبی علوم کے علاوہ شعر و شاعری کا بھی یہ سنہرا دور تھا۔ اساتذۂ دہلی میں سے بیشتر فیض آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔ میرؔ و سوداؔ اور مصحفیؔ و انشاؔ کے بعد آتشؔ و ناسخؔ کا دور

شروع ہوا اور انہیں لکھنؤ اسکول کے بانی بننے کا شرف حاصل ہوا جس نے اساتذہ دہلی سے بھی اپنا لوہا منوا لیا پھر بھی اہلِ دلّی پورے طور سے لکھنؤ کی مرکزیت قبول کرنے کو تیار نہ تھے چنانچہ شعرائے لکھنؤ کا امتحان لینے کے لیے مصرعے بھیجے جاتے تھے تاکہ ان پر مناسب مصرعے لگائے جائیں۔ اس سلسلے میں برج نرائن چکبستؔ نے دہلی سے آنے والے تین مصرعوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک مصرعہ دیا شنکر نسیمؔ کو، دوسرا خواجہ آتشؔ کو تیسرا شیخ ناسخؔ کو دیا گیا تھا۔ نسیم کو ملنے والا مصرعہ ذہن سے اتر گیا ہے، آتشؔ اور ناسخؔ کو ملنے والے مصرعے اور ان پر لگنے والی گرہیں درج ذیل ہیں۔ آتش کو یہ مصرعہ ملا تھا ''اس لیے قبر میں رکھا انہیں زنجیر سمیت''۔ انہوں نے گرہ لگا کر شعر کو یوں مکمل کیا۔ ''حشر میں حشر نہ برپا کریں یہ دیوانے'' ''اس لیے قبر میں رکھا انہیں زنجیر سمیت''۔ ناسخ کو جو مصرعہ ملا تھا وہ یہ تھا۔ ''ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا'' ناسخ نے شعر یوں مکمل کیا: ''ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا'' ''ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا''۔ ظاہر ہے کہ ناسخؔ نے جو گرہ لگائی اس سے بہتر مصرعہ لگانا ممکن نہیں۔ سایۂ آنچل سے زیادہ ہلکا کفن کسی ناتواں کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ اسی قسم کا ایک اور مصرعہ گرہ لگانے کے لیے دلّی سے آیا تھا۔ ''رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں''۔ لکھنؤ میں کسی دل جلے نے مصرعہ لگا کر شعر کو یوں پورا کیا۔ ''سنا ہے کہ دلّی میں الّو کے پٹھے۔ ''رگِ گل سے بُلبُل کے پر باندھتے ہیں''۔ رگِ گل سے بلبل کے پر باندھنا ایک نہایت نازک خیال ہے، ساتھ ہی مضحکہ خیز بھی، پھر بھی رعایت لفظی نے کیا حسن پیدا کیا ہے۔ رگ کی مناسبت سے پٹھے اور بلبل کی مناسبت سے الّو اور رگ گل سے بلبل کے پر باندھنے کی مضحکہ خیزی کو الّو کے پٹھوں کا کام قرار دینا شاید لکھنؤ میں پروان چڑھنے والی شاعری کی بہترین مثال ہے۔ ناسخؔ نے اصلاح زبان پر خاص توجہ دی اور ان کی رائج کردہ اصلاحات کو بشمولِ دہلی، پوری اُردو دنیا میں قبول کیا گیا۔ مثلاً قلقؔ، رندؔ، صباؔ، سحرؔ، وغیرہ اصلاح زبان کے

معاملے میں ناسخ اور ان کے حریف آتش کے شاگرد ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور بہت سے پسندیدہ الفاظ بھی متروک ہو گئے۔اسی عہد میں لکھنؤ چھاپا خانے سے روشناس ہوا اور غازی الدین کے عہد میں مطبع شاہی وجود میں آیا۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے، رزیڈنٹ کی دخل اندازی کی وجہ سے شاہانِ اودھ انتظام حکومت سے بے نیاز ہو کر دوسرے مشاغل میں مصروف ہو گئے تھے جن میں سب سے اہم مذہب تھا۔شیعیت کے فروغ کی طرف تو توجہ تھی ہی اس میں نئی نئی اختراعیں بھی کی جانے لگیں۔کربلا کی شبیہیں عام طور سے تعمیر ہونے لگیں جو کوئی اعتراض کی بات نہیں تھی لیکن عوام الناس میں روضۂ کربلا اور دوسرے مقدّس مقبروں کی شکل کی عمارتوں کو ایسا مقدّس سمجھا جانے لگا گویا وہی اصل مقابر ہیں۔یہ کچھ ایسا ہی ہوا ہے جیسے کعبہ کی شکل کی کوئی عمارت تعمیر کر لی جائے اور اسے کعبہ شریف کی طرح لائق احترام سمجھا جانے لگے۔بہر حال یہ عقیدے کا معاملہ ہے جس پر مجھے تبصرہ نہ کرنا چاہئے تھا۔مذہبی اختراعات میں سب سے زیادہ دلچسپ اور عبرت انگیز اچھوتیوں کا وجود میں آنا تھا۔یہ نصیر الدین حیدر کی اختراع تھی۔سلاطینِ اودھ میں ان کی ایک عجیب وغریب شخصیت تھی جس نے اپنے بیٹے منا جان کو اپنی اولاد ماننے سے انکار کیا تھا۔اور ایک کفایت شعار بیگم کو کنگلی محل کا خطاب دیا تھا۔وہ یورپین تہذیب سے اتنا متاثر تھے کہ ان کا حجام بھی ایک انگریز تھا۔ان حضرت نے ہر امام کی ایک بیگم قرار دی تھی اور ان عورتوں کا بادشاہ سلامت ایسا ہی احترام کرتے تھے گویا وہ اماموں کی واقعی بیویاں تھیں۔ان کا پورا شاہانہ خرچ حکومت کی طرف سے اٹھایا جاتا تھا اور بادشاہ ان کے یہاں حاضری کے وقت اتنا مؤدب ہو جاتے تھے کہ جیسے واقعی وہ کسی امام کی بیوی کے سامنے کھڑے ہیں۔اس سلسلہ میں جہاں تک یادداشت کام کرتی ہے شیخ تصدق حسین مرحوم نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ان اچھوتیوں

میں سے ایک صاحبہ کا کسی سے معاشقہ ہو گیا اور شادی کرنے کے لیے اچھوتی کے منصب سے دستبرداری ضروری تھی چنانچہ ایک پلان بنایا گیا۔ اس کے مطابق ایک روز جب بادشاہ سلامت ان صاحبہ کے یہاں تشریف لائے تو انہیں سوگ منانے کی حالت میں پایا۔ گھبرا کر سبب معلوم کرنا چاہا تو بتایا گیا کہ شب میں امام تشریف لائے تھے اور غصہ کے عالم میں موصوفہ کو طلاق دے گئے اور فرما گئے کہ مہر بادشاہ سلامت سے لے لیا جائے۔ امام کے اس مفروضہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ اچھوتی صاحبہ کو امام کی زوجیت کی قید سے نہ صرف نجات مل گئی بلکہ مہر کی کثیر رقم بھی ملی۔ بادشاہت کے اس آخری دور میں عیش و عشرت نے حد سے بڑھ کر ذہنی عیاشی اور رکاکت کی جگہ لے لی تھی۔ سنجیدہ شاعری مائل بہ ابتذال تو سعادت علی خاں ہی کے زمانے سے ہونے لگی تھی جب جرأتؔ کی شاعری کو میر تقی میرؔ نے "چوما چاٹی" قرار دیا تھا۔ اور رنگینؔ اور انشاء نے ریختی کی بنیاد ڈالی تھی۔ عہد مابعد میں اس مبتذل شاعری کو سنجیدہ کلام سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی عہد میں ہوسنا کی کی شاہکار وہ مثنویاں وجود میں آئیں جو زہرِ عشق کے مصنف مرزا شوقؔ سے منسوب ہوئیں۔ واسوخت اہم صنف سخن بن گئی۔ ہوس شعر کا سب سے اہم موضوع بن گئی اور ابتذال اس حد تک پہنچا کہ چرکینؔ کا ظہور ہوا۔ تفریحی مشاغل میں بھانڈوں کو اہم جگہ ملی اور کوئی محفل ایسی نہ ہوتی تھی جس کی رونق کے لیے انہیں مدعو نہ کیا جاتا ہو۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بھانڈوں کا یہ طبقہ انتہائی ذہین افراد پر مشتمل ہوا کرتا تھا اور فی البدیہہ وہ ایسے چٹکلے چھوڑتے تھے کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے چنانچہ قائم نامی ایک بھانڈ کا قصہ ہے کہ وہ اپنی قفل کنجی کی دکان پر بیٹھا تھا کہ اُدھر سے علی نقی خاں وزیر کا گذر ہوا۔ قائم اٹھا اور دست بستہ نواب صاحب کو ان الفاظ میں دعا دی "خدا نواب صاحب کو زندہ اور بیگم صاحبہ کو قائم رکھے"۔ ایسا ہی ایک دوسرا واقعہ ہے کہ ایک محفل میں کسی نواب صاحب نے بھانڈوں کو ایک دوشالہ انعام میں دیا جو قدرے

پرانا تھا۔ ایک بھانڈ نے اسے پھیلایا اور غور سے دیکھنے لگا۔ دوسرے نے دوسری طرف سے پوچھا کہ کیا دیکھ رہے ہو، پہلے نے جواب دیا کہ لا الہ الا اللہ لکھا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ غور سے دیکھو محمد رسول اللہ بھی ہوگا۔ پہلے بھانڈ نے برجستہ جواب دیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے جب دوشالہ بعثتِ رسولؐ کے پہلے کا ہے۔ یہ بھانڈ شیعہ اور سنی دونوں مسلکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک سنی بھانڈ نماز کے سخت پابند تھے اور خیال کیا جاتا تھا کہ ان کی نماز قضا نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ نماز قضا کرانے کا ایک پلان بنایا گیا۔ بادشاہ سلامت کے یہاں محفل آراستہ کرائی گئی اور اسے اتنا طول دیا گیا کہ فجر کی نماز کا وقت ختم کے قریب آ گیا۔ اس وقت بھانڈ صاحب نے ایک نئی نقل شروع کی جو مختلف فرقوں کی نمازوں کے انداز پر مشتمل تھی اور انہیں نقلوں کے درمیان اپنی نماز ادا کر لی۔ بھانڈوں کی نقلیں درحقیقت (One act plays) کی ہندوستان میں ابتدائی شکلیں کہی جاتی ہیں۔ بھانڈوں ہی کی طرح ایک دوسرا گروہ ان کا تھا جو ''شہدوں'' کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کو شہر بھر میں ہر خوشی گی تقریب کا علم ہوتا تھا۔ اور مبارکباد پیش کر کے اپنے حق وصولنے پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے مذاق اور فقرے بازیاں بھانڈوں کی بہ نسبت غیر شائستہ اور رکیک ہوتے تھے۔ ان سے بھی پست ایک طبقہ زنانوں کا ہوا کرتا تھا لیکن ان کا نشانہ عموماً جاہل عوام ہوتے تھے۔

رزیڈنٹ کی دخل اندازیوں کو دیکھتے ہوئے آخری حکمرانوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ خاتمۂ سلطنت دور نہیں۔ امجد علی شاہ نے مذہبیت کے دامن میں پناہ لی اور واجد علی شاہ نے عیش وعشرت اور رنگ رلیوں کے دامن میں۔ میں نے کبھی فرانسیسی دانشور روسو کی کتاب (A confession) میں ایک مشرقی قصّہ پڑھا تھا کہ ایک مسافر نے راستے کے کنارے ایک کنویں میں شہد کی مکھیوں کا ایک چھتّا دیکھا۔ وہ رسی کمر میں باندھ کر کنوئیں میں اتر گیا اور چھتّے میں منہ لگا کر شہد پینے لگا

اس اثناء میں اس نے دیکھا کہ دو چوہے ایک سفید اور ایک کالا۔ (مراد رات اور دن) آئے اور رسی کو کاٹنے لگے۔ جتنی جتنی رسی کٹتی جاتی تھی (زندگی کم ہوتی جاتی تھی) اتنی ہی تیزی کے ساتھ وہ مسافر شہد پینے کی کوشش کرتا جاتا تھا۔ واجد علی شاہ کی مثال بھی اسی مسافر کی جیسی تھی۔ جتنے جتنے سلطنت کے خاتمے آثار قریب آتے جاتے تھے اتنی زیادہ ان کی خوش باشی بڑھتی جاتی تھی۔ اس کا منفی اثر کچھ بھی ہو لیکن مثبت اثر یہ ہوا کہ عوام کی خوش مذاقی Aesthetic sense بہتر ہوتی گئی۔ اردو ادب میں تمثیل نگاری (Drama) کا اضافہ ہوا۔ بڑھتی ہوئی مذہبیت نے مرثیہ نگاری کو اردو ادب کی ایک اہم صنف بنا دیا۔ اور میر انیسؔ نے اس کے ذریعہ اردو ادب کو دنیا کے اہم ترین ادبوں میں شامل کرا دیا۔ رقص و موسیقی فن کی بلندیاں چھونے لگے۔ مذہبیت اور موسیقی نے مل کر سوز خوانی کو جنم دیا اور مرثیہ خوانی کے تحت تحت اللفظ شعر خوانی کا ایک نیا انداز وجود میں آیا۔

بحیثیت مجموعی اگر صرف ثقافتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو عہد آصف الدولہ سے واجد علی شاہ تک لکھنؤ ایک ایسی انتہائی مختصر تہذیب اور شائستگی کا مرکز بنا جس کی مثال ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں تو کیا، ایران اور توران میں بھی نہیں ملتی، جہاں سے اس تہذیب کا آغاز ہوا تھا۔ جیسا لکھا جا چکا ہے اس تہذیب کے عناصر تھے نرم گفتاری، شائستگی، نفاست، زندگی کے ہر شعبہ میں نزاکت، مردانگی، فنون لطیفہ کی سرپرستی۔ یہ تھا میرے اجداد کا وطن لکھنؤ!

تیسرا باب

لکھنؤ۔ (دورِ انحطاط)

تری زمین میں ہے دفن مرے اب وجد کی خاک

۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ انگریزی سلطنت میں شامل کر لی گئی۔ واجد علی شاہ کلکتہ بھیج دیئے گئے۔ بظاہر عیش وعشرت کا دور ختم ہوا لیکن شاید اہلِ لکھنؤ کو بیدار کرنے کے لیے ایک اور تازیانے کی ضرورت تھی۔ واجد علی شاہ ''خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں'' کہتے ہوئے سفر کر گئے۔ لیکن اہلِ وطن کے کانوں پر جوں نہ رینگی جس کی عکاسی منشی پریم چند نے اپنے افسانے ''شطرنج کی بازی'' میں کی ہے۔ ایک سال بعد انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی جو غدر کے حقارت آمیز نام سے موسوم ہوئی۔ واجد علی شاہ کے ایک بیٹے برجیس قدر کو جن کی والدہ بیگم حضرت محل کلکتہ نہ گئی تھیں شہنشاہِ دہلی کی منظوری سے بادشاہ بنایا گیا اور ممّوں خاں سپہ سالار ہوئے لیکن کافی عرصہ تک محاصرہ کرنے کے بعد بھی ان کی فوج رزیڈنسی پر قبضہ نہ کر سکی۔ کانپور سے مزید انگریزی فوج آنے کے بعد ہندوستانیوں کو شکست ہوئی۔ ممّوں خان اپنے راستے چلے گئے، حضرت محل اور برجیس قدر نیپال چلے گئے۔ اور مولوی احمد اللہ ضلع ہردوئی کے ایک راجہ کی غداری سے شہید ہو گئے۔ اودھ کی سلطنت انگریزوں کے خوشامدیوں میں تقسیم ہو گئی جو تعلقدار کہلائے۔ انگریزوں کے اِن نوزائیدہ خوشامدیوں کی بے حسی کا یہ عالم تھا کہ میرے بچپن تک ان

میں کچھ ایسے بھی تھے جو انگریزوں کی پیروی میں اپنے کتوں کے نام ٹیپو سلطان کے ایسے عظیم مجاہد آزادی کے نام پر رکھا کرتے تھے اور ان کی دیکھا دیکھی جاہل اور نابلد عوام میں ''ٹیپو'' کتوں کا ایک نام قرار پا گیا۔ اس عہد میں شہر لکھنؤ کے عوام کا وہی حشر ہوا جو بہادر شاہ ظفر کے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لینے کے بعد دہلی کے عوام کا ہوا تھا۔ بقول غالب دہلی کے محلے کے محلے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے تھے اور لکھنؤ میں ست ہٹیا کے ایسے آباد محلے کے ملبے پر بنا ہوا ریل ٹریک مَیں آج بھی دیکھ رہا ہوں۔ عیش و عشرت کا دور ختم ہو کر بدحالی کا دور دورہ شروع ہوا۔ روسا کے گھروں کا اثاثہ خفیہ طور سے ان کی ڈیوڑھیوں کے داروغاؤں کے ذریعہ فروخت ہونے لگا۔ روسا روٹیوں کو محتاج ہو گئے اور ان کے داروغہ رئیسوں کی شکل میں نمودار ہونے لگے۔ رستوگیوں کی تجوریاں بھرنے لگیں اور لکھنؤ کی تمام دولت اشرف آباد اور راجہ کی بازار پہنچ گئی۔ لکھنؤ کا وہ پرانے سامان کا معمولی سا بازار ا جو نخاس کہلاتا تھا اہمیت اختیار کر گیا۔ کباڑیوں کی دوکانوں پر ایسا سامان آنے لگا جس کی قیمت کا اندازہ کرنا خود ان کے بس کی بھی بات نہیں تھی۔ میں نے بچپن میں سنا تھا کہ نخاس میں ایک میلا کچیلا حقّے کا نیچا جو کوڑیوں کے مول بکا، اصل میں سونے کا تھا۔ گھرداری کے سامان کے علاوہ کتابوں پر بھی تباہی آئی۔ شاہی کتابخانے کی بہت سی کتابیں جس میں غالباً وہ کتابیں بھی شامل تھیں جو بکسر کی لڑائی کے پہلے میر قاسم نے اپنے خزانے کے ساتھ شجاع الدولہ کو بطور امانت بھیج دی تھیں اور جن کی بنائی ہوئی اسپرنگر کی فہرست آج بھی موجود ہے، اسی نخاس میں کوڑیوں کے مول بکتی رہیں۔ نخاس میں انہیں کتابوں کو بیچ کر گزر بسر کرنے والا ایک بوڑھا کتاب فروش میرے بچپن تک موجود تھا جس کے انتقال کے بعد اس کی کتابوں کا ذخیرہ مولانا عبدالحلیم شرر کے ایک نواسے کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ استادِ محترم پروفیسر مسعود الحسن رضوی صاحب مرحوم نے راقم الحروف کو خود بتایا کہ ان کا نادر کتابخانہ زیادہ تر نخاس

سے خریدی ہوئی کتابوں پر مشتمل تھا، چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی یونیورسٹی کی ملازمت کے ابتدائی دور کا قصّہ بیان کیا کہ سخت گرمی میں دوپہر کے وقت وہی بوڑھا کتاب فروش جس کا اوپر ذکر ہوا ہے کتابوں کی ایک گٹھری لیکر ان کے مکان پر آیا اور ان سے کتابیں دیکھنے کے لیے کہلوایا جس کے جواب میں پروفیسر موصوف نے اسے پھر کسی وقت آنے کو کہا لیکن وہ اسی وقت کتابیں دکھانے پر بضد ہوا۔ اس کے اصرار پر مسعود صاحب نے گٹھری چھوڑ جانے کو کہا جس پر وہ راضی ہو گیا۔ استادِ محترم کا مجھ سے کہنا تھا کہ جب گٹھری کھول کر انہوں نے کتابوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تمام نادر خطی نسخے تھے جس میں اس وقت تک ناپید سمجھا جانے والا ذکرِ میر کا نسخہ بھی شامل تھا۔ کتابخانہ رکھنا شانِ ریاست سمجھا جاتا تھا خواہ رئیس خود جاہلِ محض ہی کیوں نہ ہوں۔ رئیسوں کے ان ذاتی کتابخانہ کی کتابوں کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہوا۔ نخاس میں آنے کے علاوہ وہ رہن کے طور پر مہاجنوں کی دوکانوں پر بھی پہنچنے لگیں جہاں سے پھر وہ کبھی مالکان تک واپس نہ پہنچیں اور کوڑیوں کے مول بک گئیں۔ یہ رئیس جو اپنے اثاثوں کو (جن میں وہ نوادرات بھی شامل ہوتے تھے جن کی قیمت خود انہیں بھی معلوم نہ ہوتی تھیں) خود بازار میں لے جا کر فروخت کرنا خلافِ شان سمجھتے ہوئے داروغاؤں کے ذریعہ فروخت کروا کر اس کی قیمت کا محض معمولی حصّہ پانے پر قانع رہتے تھے (اس لیے کہ زیادہ حصّہ تو داروغہ کی جیب میں چلا جاتا تھا) رفتہ رفتہ اس حالت تک پہنچ جاتے تھے کہ انہیں خود بہت ہی معمولی کام کرنا پڑتے تھے۔ چنانچہ بچپن میں کسی نواب پھلکی قدر کا ذکر سنا کرتا تھا جو بیچارے آخر میں پیٹ پالنے کے لیے پھلکیاں بیچنے لگے تھے اور تفریح کے طور پر لوگوں نے ان کا نام پھلکی قدر رکھ دیا تھا۔ ایسے ہی ایک نواب صاحب سے میں ذاتی طور پر واقف تھا جو نواب سن دس کہلاتے تھے۔ انتہائی وجیہ اور بادبدبہ شخصیت کے مالک تھے اور آخر میں میں نے انہیں چوک میں ہرن والے پارک کی ایک چھوٹی سی لانڈری میں

کپڑوں پر استری کرتے ہوئے دیکھا۔ میں سمجھتا تھا کہ نواب سن دس ان کا اصلی نام ہے لیکن بعد میں پتا چلا کہ ۱۹۱۰ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ وثیقہ دار نواب ہوئے اور بیدردی سے دولت اڑانا شروع کیا۔ پتنگیں نوٹ باندھ کر لڑائی جاتی تھیں اور نوٹوں کی سگریٹیں بنا کر پی جاتی تھیں چنانچہ انہیں خصوصیات کی وجہ سے اپنے نواب ہونے کے ۱۹۱۰ء کی مناسبت سے نواب سن دس کے نام سے مشہور ہو گئے۔ غالباً ان کا اصلی نام کسی کو معلوم بھی نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے میرے ہوش سنبھالنے تک نہ معلوم کتنے رئیس ہوں گے جن کا یہی حشر ہوا۔ (میں نے اپنی جوانی تک کچھ تعلقداروں کی بربادی کے بھی یہی مناظر دیکھے جس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا) عہدِ مذکور میں اقتصادی بد حالی کا دور دورہ تھا لیکن لکھنوی تہذیب برقرار تھی۔ وہی نشست و برخاست کے آداب تھے، وہی رہن سہن کے طریقے تھے، وہی شائستہ نرم لہجے میں اندازِ گفتگو تھا، وہی پاکیزہ اُردو زبان تھی، ویسی ہی مہمان نوازیاں تھیں اور ویسی ہی وضعداریاں، چنانچہ اپنے عنفوان شباب میں ایک مفلوک الحال شاعر حکیم دانشؔ کے متعلق سنا کرتا تھا کہ اکثر ایسا ہوا کہ کوئی ملنے والا آ گیا اور اس کی خاطر داری کے لیے حکیم صاحب کے پاس کچھ بھی نہ ہوا۔ اصل دروازے کی ڈیوڑھی میں حکیم صاحب مہمان سے گفتگو کرتے رہے اور پچھلے دروازے سے انگرکھا رہن رکھوانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہ حکیم دانش وہی ہیں جو آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے اور اپنے آخری مشاعرے میں انھوں نے جو طرحی غزل پڑھی تھی اس کا یہ مطلع تھا ؎

دیکھ سکتا ہوں نہ ساقی کو نہ میخانے کو
آخری وقت ہے بھر دے کوئی پیمانے کو

لکھنؤ میں اردو شاعری کا چرچا انھیں شاعروں کی آمد سے ہوا جو اساتذۂ دہلی سمجھے جاتے تھے اور جنھوں نے دبستانِ لکھنؤ کی بنیاد ڈالی۔ ان پر دہلی کے اثرات برقرار تھے۔ چنانچہ لکھنؤ کو جو

شعری آہنگ ملاوہ بھی دہلی کی دین تھا۔اس آہنگ میں خوبیاں بھی تھیں اور خرابیاں بھی۔اگران خرابیوں کو لکھنؤ کی عیش وعشرت کی فضا میں زیادہ پسند کیا جانے لگا اور اختیار کیا گیا تو صرف اسی کو لکھنوی شاعری نہ سمجھ لینا چاہئے۔لکھنؤ میں معنویت اور داخلیت سے زیادہ خارجیت کی طرف توجہ کی گئی لیکن کیا یہ بات دہلی کی شاعری میں نہ تھی اور یہ خارجیت اور بوالہوسی دین بھی کس کی تھی؟ انھیں کی جو دہلی سے لکھنؤ آئے۔ریختی کس نے ایجاد کی؟ایک دہلی والے نے۔میر تقی میر نے کس کی شاعری کو چوما چاٹی کی شاعری قرار دیا؟ جرأت کی شاعری کو جو دہلی کے تھے۔پھر لکھنؤ کی شاعری کو چوما چاٹی کی شاعری کہنا کس حد تک مناسب ہے؟رہی گل وبلبل کی شاعری تو کیا یہ استعاراتی آہنگ نہیں ہے اور کیا یہ اہلِ دہلی کے یہاں نہیں ملتا؟ حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ نے جو شاعری ورثہ میں پائی تھی اس میں حسنِ زبان اور نازک خیالی کا اضافہ کیا۔رعایتِ لفظی لکھنؤ میں انتہا تک پہنچا دی گئی لیکن امانتؔ اور شادؔ پیرومیرؔ نے اور خود میر انیسؔ تک نے اسے کامیابی سے برتا اس لیے وہ حسن شعر کا سبب بنی لیکن اس رعایت لفظی کی مثالیں کیا میر تقی میرؔ کے کلام میں نہیں ملتیں؟ اگر کچھ شاعروں نے اسے کامیابی سے نہیں برتا تو اس کا ملزم پورے دبستانِ لکھنؤ کو نہ سمجھنا چاہئے۔محبوب کے جسمانی حسن کو بیان کرنا کوئی جرم نہیں ہے بشرطیکہ اس میں ابتذال نہ ہو۔اس میں اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ برابر کے حصّہ دار ہیں۔لکھنؤ میں لکھی جانے والی خنجر عشق،لذّت عشق ،وغیرہ اگر کچھ مثنویوں میں (میرا اشارہ زہر عشق کی طرف نہیں ہے) عریانی ہے تو ویسے ہی کچھ اشعار میر اثرؔ (برادر خواجہ میر دردؔ) کی مثنوی خواب وخیال میں بھی موجود ہیں۔مقدمہ شعر وشاعری میں لکھتے ہوئے جو شاعری خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے پیشِ نظر تھی وہ دہلی کی شاعری تھی جس کے اس وقت کے نمائندہ داغؔ دہلوی تھے پھر بھی حالیؔ کی تنقید پر اہلِ لکھنؤ نے بھی غور کیا اور بیسویں صدی کی ابتداء میں اساتذۂ لکھنؤ نے وہ روایتی شاعری ترک کر دی جس کا تعلق صرف روایتی عشق

وعاشقی سے تھا۔اس عہد سے حقائق زندگی کو لکھنؤ میں بھی شاعری کا موضوع بنایا جانے لگا اور میرے خیال میں اس کا سہرا صفی لکھنوی کے سر بندھتا ہے۔انہوں نے غزلوں کے علاوہ نظموں میں جو شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کے موقعوں پر پڑھی گئیں اور جو لختِ جگر کے عنوان سے شائع ہوئیں ان تمام باتوں کا خیال رکھا ہے جس کی محمد حسین آزاد اور ان کے ساتھیوں نے سفارش کی تھی۔مولانا صفی لکھنوی سے پہلے لکھنوی شاعری کے نمائندہ شاعر جلال اور امیر مینائی اور ان کے شاگرد تھے جن میں ریاض خیر آبادی کا خمریاتی انداز منفرد تھا۔امیر کی شاعری میں رکاکت داغ کی شاعری میں نقالی سے آئی جو بدقسمتی سے اس عہد میں بھی پسندیدہ تھی اور قبول عام حاصل کرنے کے لیے امیر کو اپنی طبیعت کے خلاف اسے اپنانا پڑا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا،عہدِ واجد علی شاہ میں رقص و موسیقی نے ثقافتی اہمیت حاصل کر لی تھی۔بعد کے زمانے میں ان کے قدرداں اور سرپرست تو نہ رہے لیکن ان کی ہردلعزیزی میں کمی نہ آنے پائی۔ان فنون کے سلسلے میں طوائفوں کا ایک طبقہ وجود میں آ چکا تھا جنھیں رقص و موسیقی کے تمام رموز سے آشنا کرا دیا جاتا تھا اور روسا اور تعلقداروں کے یہاں تقریبوں میں انھیں خاص طور سے مدعو کیا جاتا تھا۔ایسی ہی طوائفوں کی زندگی پر مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا میں روشنی ڈالی ہے۔یہ طوائفیں خوش اخلاق تہذیب اور سلیقہ مند ہوتی تھیں اور نشست و برخاست اور سوسائٹی میں بیٹھنے کے آداب سیکھنے کے لیے روساء کے بچے ان کے یہاں بھیجے جاتے تھے۔ وہ صرف موسیقار اور رقاص ہی نہ ہوتی تھیں بلکہ ادبیات اور اُردو شاعری میں بھی انھیں دخل ہوتا تھا اس لیے کہ اس کے بغیر وہ اپنے مہمان باذوق لوگوں کو تسکین نہ پہنچا سکتی تھیں۔بیسویں صدی کے اوائل میں ایک ایسی ہی طوائف تھیں جو چودھرائن کے نام سے مشہور تھیں۔ان کے سلسلے میں ایک یہ دلچسپ واقعہ بزرگوں سے سنا ہے۔چودھرائن کے کوٹھے کے بالکل سامنے داروغہ حیدر

بخش کی مسجد کے نیچے خواجہ عبدالرؤف عشرت کی کتابوں کی دوکان تھی جو ادیبوں اور شاعروں کا مرکز بن گئی تھی۔ ایک روز کسی لفظ کے استعمال پر دو بہت ہی مستند علماء (جن میں ایک غالباً مولانا شبلی تھے) میں بحث چھڑ گئی تھی اور فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ معاملہ چودھرائن کے سامنے پیش کیا جائے۔ چودھرائن نے پوری بحث سننے کے بعد محض ایک شعر سند میں پیش کر دیا اور بات صاف ہوگئی۔ یہ طوائفیں آدابِ محفل کے ساتھ ساتھ لسّانی اور ضلع جگت میں بھی ماہر ہوا کرتی تھیں اور یہی باتیں تھیں کہ شرفاء کو اپنے بچوں کو ان کے یہاں بیٹھنے میں تذبذب نہیں ہوتا تھا۔ جسم فروشی ان کا پیشہ نہ ہوتا تھا اگر چہ وہ روساء کی داشتہ بن جایا کرتی تھیں لیکن داشتہ سے زیادہ ان کی حیثیت بیویوں جیسی ہو جاتی تھی۔ میرے ایک دوست کے والد جو شہر کے مشہور مزاح نگار بھی تھے کی بھی ایک ایسی ہی داشتہ تھیں جو حاملہ ہوگئیں تھیں۔ طے ہوا تھا کہ اگر بیٹی ہوگی تو باقاعدہ شادی کر لیں گے اور واقعی ایسا ہی ہوا بھی۔ طوائفوں کے علاوہ بھی رقص و موسیقی کے اساتذہ لکھنؤ میں موجود تھے۔ انہیں میں بندا دین کا گھرانا بھی تھا جس کے تمام افراد نے کتھک میں نام آوری پیدا کی۔ عرض کیا جا چکا ہے کہ بادشاہت کے آخری زمانے میں مذہبیت اور موسیقی کے امتزاج سے سوز خوانی کا فن وجود میں آیا۔ اس میں موسیقی کے راگوں کے تحت واقعۂ کربلا سے متعلق نوحے پڑھے جاتے تھے۔ سلطنت کے خاتمے کے بعد بھی ان کی مقبولیت میں کچھ کمی نہ آئی اور ایام عزا کے علاوہ بھی باقاعدہ سوز خوانی کی محفلیں سجا کرتی تھیں جن میں فنکار اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ لباس اور طرزِ رہائش پر بھی توجہ باقی تھی۔ انگرکھا، دوپلّی ٹوپی اور چوڑی دار پائجامہ اب بھی مقبول تھا۔ لیکن متعدد حضرات اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے ایک دوسرے قسم کا انگرکھا اور باریک دھوتی پہنتے تھے۔ لباس میں اس عہد میں یہ اضافہ ہوا کہ چوڑی دار پیجامے کے ساتھ ساتھ غرارہ یعنی ڈھیلا بڑے پائچوں کا پیجامہ بھی پہنا جانے

لگا اور اچکن کی ایک ترمیم شدہ شکل شیروانی اور کشتی دار ٹوپی بھی شرفاء کے لباس میں داخل ہوگئی تھیں۔ ان لباسوں کے پہننے کے آداب مقرر تھے۔ شیروانی کے ساتھ ٹوپی کا پہننا ضروری تھا اور شیروانی کے تمام بٹن بھی بند ہونا چاہئے تھے۔ بغیر شیروانی ٹوپی پہنے ہوئے بازار میں جانا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ بغیر ٹوپی پہنے گھر کے دروازے سے باہر نکلنا بھی قابلِ اعتراض سمجھا جاتا تھا۔ گھر کے باہر کی زندگی کے آداب کے علاوہ گھر کے اندر رہن سہن کے خاص طریقے تھے۔ عموماً گھر کافی بڑے اور دالانوں پر مشتمل ہوتے تھے جن پر تخلیہ برقرار رکھنے کے لیے پردے ڈال دیے جاتے تھے۔ ڈرائنگ روم کا رواج نہ تھا۔ اکثر گھروں میں زنانہ اور مردانہ حصّے الگ الگ ہوتے تھے۔ زیادہ تر گھروں میں ڈیوڑھیاں کافی بڑی ہوتی تھیں اور ان میں بید یا سینٹھے کے مونڈھے بچھے ہوتے تھے۔ گھروں کے اندر خاص دالان میں تختوں کے چوکے بچھے ہوتے تھے جن میں نفاست کے ساتھ سفید چادریں اور اکثر قالین بھی بچھا دیے جاتے تھے۔ ۱۹۳۵ء سے پہلے چائے کا رواج نہ تھا۔ مہمانوں کی ضیافت پان کی گلوریوں سے کی جاتی تھی۔ اور پاندان گھریلو ضروریات کا اہم جز تھا۔ پانوں کے رواج نے اگالدان کو بھی ضرورت زندگی بنا دیا تھا۔ سگریٹ کا رواج ہو چکا تھا لیکن حقّے کی اہمیت برقرار تھی۔ روسا اور شرفا کے یہاں عام حقّے کے بجائے پیچوان کا رواج تھا جس میں حقّے کو ایک شخص کے پاس سے دوسرے کے پاس لے جانے کی ضرورت نہ پڑتی تھی اور صرف مہنال گردش میں رہتی تھی۔ گرمی کی تمازت سے بچنے کے لیے اکثر گھروں میں تہ خانے ہوا کرتے تھے اور جن مکانوں میں تہ خانے نہ بھی ہوتے تھے ان میں گھروں کے کسی خاص حصّے کو خس کے پردوں سے گھیر کر خس خانے بنا دیے جاتے تھے۔ عموماً دالانوں میں چھت سے لٹکے ہوئے لکڑی کے جھالر دار پنکھے ہوتے تھے جنھیں ملازم یا گھر کا کوئی فرد خود کھینچا کرتا تھا۔ شیعہ حضرات کے گھروں میں دوسرے دالانوں سے بلند ایک دالان جو صحنچی

کہلاتا تھا عزاخانے کے طور سے استعمال ہوتا تھا۔

عہد شاہی میں کھانے پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی اور رکابداروں کی خاص سرپرستی ہوتی تھی۔ وہ بھی طرح طرح کے نئے کھانے اپنے سرپرستوں کے لیے تیار کرتے تھے۔ عہدِ مابعد میں بھی یہ شوق برقرار رہا۔ اس سلسلے میں ایک قصّہ سننے میں آیا ہے کہ لکھنؤ کے ایک رئیس جو پہلوان بھی تھے اپنے کسی دوست پہلوان کے یہاں کسی دوسرے شہر گئے۔ میزبان نے انتہائی خوش ذائقہ اور مقوی غذاؤں سے ضیافت کی۔ ساتھ ہی ساتھ ایسی مقوی غذائیں کھلوانے پر فخر کیا نواب صاحب کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ اور انھوں نے میزبان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ تشریف لائے۔ دسترخوان بچھایا گیا لیکن اس پر صرف دو پیالے یخنی کے رکھ دیئے گئے۔ مہمان حیران تھے کہ یہ کس قسم کی دعوت ہے۔ ان کی حیرانی دیکھ کر میزبان نے بتایا کہ پہلے انھیں نوش فرمائیں بعد کو دوسرے کھانے آئیں گے، چنانچہ یخنی پی گئی اور بعد کو جب دوسرے کھانے آئے تو انہیں ہاتھ بھی نہ لگایا گیا۔ یہ معلوم ہوا کہ رکابدار نے دو بکروںؑ کے گوشت کو (Extract) کر کے دو پیالے یخنی تیار کی تھی۔ اس عہد میں لکھنؤ فنِ طب کا بھی مرکز بنا رہا۔ حکیم ننّا صاحب جن کے ایک شاگرد میرے بچپن میں حکیم احمد حسن صاحب بھی تھے، اس عہد کے مشہور طبیب تھے۔ ان کے علاوہ جھوائی ٹولے کے کشمیری نژاد اطبا کا خاندان بھی ابھر کر سامنے آرہا تھا جن میں حکیم عبدالعزیز صاحب اور ان کے بھائیوں اور بعد میں ان کی اولادوں نے خاص شہرت حاصل کی، خطّاطی اور مختلف دستکاریاں بھی مقبول تھیں جن کا سلسلہ میرے عہد تک باقی رہا۔ فنکار خطّاط مختلف خطوں پر عبور کامل رکھتے تھے ۔ ان کے قلم اور روشنائی بنانا بھی ایک فن تھا۔ قلم عموماً بید مشک اور کلک کے بنتے تھے لیکن ان کے بنانے میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ قلم کی نوکیں اتنی برابر کی ہوتی تھیں کہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کب قلم تبدیل ہوا۔ روشنائی کے سلسلے میں ایک قصّہ سننے میں آیا ہے کہ کوئی بہت ہی مشہور روشنائی ساز تھے

۔انہیں کسی رئیس نے بلایا اور روشنائی بنانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے دیگر اجزاء کے علاوہ کچھ قیمتی جواہرات بھی طلب کئے جو انھیں فراہم کر دیئے گئے۔ ان کا سرمہ بنا کر وہ روشنائی بنانے میں مصروف ہوئے۔ کافی عرصہ کے بعد جب رئیس کو معلوم ہوا کہ اس وقت تک روشنائی تیار نہیں ہوئی ہے تو ان کی فہمائش کی گئی۔ انھوں نے ایک چکنا پتھر منگوایا اور اس نامکمل روشنائی سے اس پر لکیر کھینچ دی اور رئیس سے عرض کیا کہ پتھر کو گھسوایا جائے۔ بہت کافی پتھر گھسے جانے کے بعد بھی روشنائی کا نشان ملتا گیا اور رئیس خجل ہوئے۔ لیکن روشنائی ساز یہ کہہ کر چلے آئے کہ اگر روشنائی پورے طور سے بنانے کا موقع دیا جاتا تو یہ لکیر پتھر کے دوسری طرف بھی نظر آ جاتی۔ بہر حال خطّاطی کا فن قدیم تھا اور لکھنؤ کا اس میں صرف یہ حصّہ دیا کہ اس نے اسے برقرار رکھنے میں مدد کی۔ دستکاری میں چکن سازی لکھنؤ کا خاص فن تھا جو آج تک برقرار ہے۔ اس کے علاوہ مٹی کی مورتیاں اور کھلونے تیار کرنے کے فن کو بھی ترقی ہوئی۔ میرے بچپن تک اکبری دروازے کے دونوں طرف ایسے ہی خوبصورت کھلونوں کی دو دو دکانیں تھیں جن پر دیوالی کے موقعوں پر مٹی کے مصنوعات کی خاص نمائش ہوتی تھی اور ایک بوڑھے شخص کا مجسمہ دور دور تک مشہور رہے۔

عہدِ شاہی کے اہلِ لکھنؤ کے کچھ شوق بھی اس زوال پذیر دور میں بھی باقی تھے۔ بٹیر پروری اور مرغوں کی پالیاں بدستور لڑائی جاتی تھیں۔ کنکّوے بازی میں کوئی کمی نہ آئی تھی اور دیوالی کے بعد جمگھٹ کے روز پتنگوں کی زیادتی سے آسمان نظر آنا مشکل ہوتا تھا۔ بسنت کے روز بسنتی کنکوّے کے میچ منعقد کر کے اس قومی تیوہار کو شاندار طریقے سے منایا جاتا تھا۔ بانک، بنوٹ، پنجہ کشی، کشتی، پیراکی، بدستور مقبول تھے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا تھا کہ اقتصادی بد حالی کے باوجود غدر کے بعد بھی لکھنؤ نے اپنی تہذیب کی انفرادیت برقرار رکھی۔ لیکن اس دور کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ پیشتر عہد کی اخلاقی پستی اس عہد میں کم نظر آتی ہے۔ یہ دور وہ تھا جب خرید و فروخت

کے لیے موجودہ شکل کے بازار نہ تھے۔مختلف موقعوں خصوصاً تہواروں کے مواقع پر میلے لگا کرتے تھے جن میں کچھ کا ذکر سرشار نے فسانۂ آزاد میں کیا ہے۔ان میں آٹھوں کا میلہ، گنگا اشنان کا میلہ ، بھیروں جی کا میلہ، غازی میاں کا میلہ، عید کے بعد ٹر کا میلہ اپنی خصوصی حیثیت رکھتے تھے۔ان کے علاوہ ہفتہ وار بازار بھی لگا کرتے تھے۔جن کی مثال نخاس کا بازار نہ صرف آج بھی موجود ہے بلکہ اسی قسم کے عارضی بازار اب ہفتے کے مختلف دنوں میں شہر کے مختلف حصّوں میں بھی لگنے لگے ہیں۔میلوں ٹھیلوں، بازاروں اور دوسرے عوامی اجتماعوں میں حقّے ضیافت کے لیے موجود رہتے تھے۔ککڑ والوں کے نام سے ایک طبقہ وجود میں آچکا تھا۔یہ لوگ حقّہ تازہ کر کے ایسے اجتماعوں میں گھومتے رہتے تھے اور شوقین حضرات انھیں چند پیسے دے کر چند کش لگا لیا کرتے تھے۔

چوتھا باب

لکھنؤ۔میرا اپنا وطن (بیسویں صدی میں)

ہست اگر فردوس در عالم، تو ہی اے لکھنؤ

میری پیدائش ۱۱ دسمبر ۱۹۲۴ء کی ہے۔ میں نے عہدِ طفولیت میں گذشتہ لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کے نمونے دیکھے تو اُس صدی کے نصف آخر میں بالکل ایک دوسرا ہی لکھنؤ میرے سامنے آیا۔ میرے ہوش سنبھالنے کے وقت تک لکھنؤ اور اس کی تہذیب کی وہی کیفیت تھی جو گذشتہ باب میں بیان کی جاچکی ہے۔ زبان کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا حتیٰ کہ سبزی فروشوں اور تانگے والوں کی گفتگو میں بھی وہ شائستگی ہوتی تھی جو دوسرے مقامات کے شرفاء کی گفتگو میں بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ اس شائستگی میں لطیف مزاج کا عنصر بھی شامل ہوا کرتا تھا جس کے بہت سے قصّے خود میں نے سنے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کوئی گراں جثہ صاحب تانگے کی پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئے اور جب منزل مقصود پر پہنچ کر تانگے سے اتر کر آگے جانے لگے تو تانگے والے نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور گھوڑے کے سامنے سے نہ جائیں اس لیے کہ اگر گھوڑا یہ دیکھ لے گا کہ وہ اتنا وزن لاد کر لایا ہے تو اس کا دم نکل جائیگا۔ یہ اردو زبان کے عروج کا دور تھا۔ حتیٰ کہ سبزی فروش تک استعاراتی انداز میں آواز لگاتے تھے[1] اس سے قبل بھی شعری محفلیں

---

[1] لکھنؤ میں کبھی ککڑیاں اس انداز میں بیچی جاتی تھیں: لیلیٰ کی انگلیاں ہیں، مجنوں کی پسلیاں ہیں، کیا خوب ککڑیاں ہیں۔

منعقد ہوا کرتی تھیں لیکن اس عہد میں ادبی انجمنوں کا وجود ہوا اور ان کے تحت ادبی اجتماعات اور مشاعرے ہونے لگے۔ اس عہد کی سب سے اہم ادبی انجمن معین الادب تھی جس میں شہر کے تقریباً تمام اساتذہ شامل تھے۔ انجمن معین الادب کے خاتمے کے بعد معیار الادب، بہارالادب وغیرہ دوسری انجمنیں وجود میں آئیں، ان انجمنوں کے مشاعرے اتنے اہم ہوتے تھے کہ دوسرے مقامات کے شعراء ان میں شامل ہونا باعثِ فخر سمجھتے تھے چنانچہ ایسے مشاعرے بھی ہوئے جن میں اساتذۂ دہلی مثلاً بیخودؔ دہلوی، سائلؔ دہلوی وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ آج شاعری نے مجرے کی جگہ لے لی ہے۔ مشاعرے ادبی محافل کے بجائے ثقافتی ادارے بن گئے ہیں جن میں سامعین محض گلے بازی سے محظوظ ہونے کے لیے جاتے ہیں اور ان میں زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن کی اردو دانی محض برائے نام ہوتی ہے۔ ان مشاعرے باز شاعروں کی باقاعدہ فیس ہوا کرتی ہے۔ میرے عہدِ طفولیت تک یہ بات نہ تھی۔ مشاعرے محدود ادبی محفلیں ہوا کرتے تھے جن میں شرکت کرنے والے بیرونی شعراء کرایہ آمدورفت تک لینا معیوب سمجھتے تھے۔ ان شعری نشستوں کے لیے زمانہ گذشتہ کی طرح طرحیں دے دی جاتی تھیں جن پر طبع آزمائی کرنا ضروری ہوتا تھا اور بغیر طرحی شعر کہے ہوئے محفل میں شعرخوانی کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ اکثر اوقات کچھ خاص قوافی بھی مقرر کر دیئے جاتے تھے جن میں شعر کہنا ضروری ہوتا تھا۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی شعری محافل میں کچھ فرق بھی تھے۔ انیسویں صدی کی محافل میں شاعر خود اپنے مرتبے کے لحاظ سے بیٹھتے تھے اور شمع گردش میں آتی تھی۔ جس کے سامنے شمع آتی تھی وہ شعر پڑھتا تھا۔ اساتذہ کا نمبر سب کے بعد میں آتا تھا۔ بیسویں صدی کی شعری نشستوں میں تقدیم و تاخیر کی شرط تھی اور اسی لحاظ سے شعراء کی فہرست ترتیب دی جاتی تھی اور اس فہرست کے مطابق شعراء کو دعوتِ سخن دی جاتی۔ شمع کی گردش کا

رواج ختم ہو چکا تھا۔ میرے بچپن تک ان شعری نشستوں میں طرح ضروری تھی اور شعر خوانی صرف غزل تک محدود تھی۔ میرے عنفوانِ شباب تک محدود شعری محفلوں کے ساتھ ساتھ بڑے شاعرانہ اجتماع اور ادبی انجمنوں کی غیر طرحی نشستیں بھی ہونے لگی تھیں۔ بڑے شاعرانہ اجتماعوں میں تعلیمی اداروں کے مشاعرے بھی شامل تھے۔ چنانچہ میری طالبعلمی کے زمانے میں جوبلی کالج، شیعہ کالج، اسلامیہ کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں کافی معیاری مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں بیرونی شعراء بھی شرکت کرتے تھے۔ ایسے ہی مشاعروں میں مجھے جگر مراد آبادی، احسان دانش، حفیظ جالندھری، سیماب اکبر آبادی وغیرہ کو سننے کا موقع ملا۔ غالباً انھیں بیرونی شاعروں کا خیال کرتے ہوئے ان مشاعروں میں طرح دیئے جانے سے احتراز کیا جانے لگا۔ پھر بھی کالجوں کے مشاعروں میں اس وقت بھی اکثر طرحیں دی جاتی تھیں۔ ۱۹۴۱ء میں جوبلی کالج میں منعقد ہونے والے طرحی مشاعرے میں اپنے سینئر دوست محضر لکھنوی کا یہ مطلع مجھے آج تک یاد ہے۔

مئے زیست ساقی نے دی اور سوا دی مگر اِک ذرا تلخیٔ غم ملا دی

اور ۱۹۴۲ء میں اسی کالج کے ایک دوسرے طرحی مشاعرے میں محضر کی غزل کا یہ مطلع تھا:

تجھے ڈھونڈھا حرم میں، دیر کو تیرا مکاں سمجھے
دلوں میں رہنے والے تو کہاں تھا ہم کہاں سمجھے

اسی سال یعنی ۱۹۴۲ء میں شیعہ کالج کے طرحی مشاعرے میں بیخود موہانی مرحوم نے بستر مرگ سے جو طرحی غزل مشاعرے میں پڑھی جانے کے لیے بھیجی تھی اس کے تین شعر یہ تھے۔

ارم میں بھی مگر گل کی پریشانی نہیں جاتی
کہیں اہل جنوں کی چاک دامانی نہیں جاتی

بنا کر موج کو کشتی چڑھا جاتا ہوں ساحل پر
نہ جائے گر سمندر تیری طغیانی نہیں جاتی
یہ دوزخ ہے مجھے، مجھ کو نکل جانے دے جنت سے
خدا وندا گناہوں کی پشیمانی نہیں جاتی

جہاں تک ادبی انجمنوں کی محافلِ سخن کا تعلق ہے ان میں نغمگی سے زیادہ شعر کی معنوی اور زبان کی صفائی پر زور دیا جاتا تھا۔ انجمن کے عہدے داروں کا با قاعدہ انتخاب ہوتا اور ہر سکریٹری اور اس کا گروپ جو منتخب ہو کر آتا تھا مشاعرے میں کوئی جدّت پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

گزشتہ صدی چوتھی دہائی میں بہار ادب کا ایک نہایت کامیاب مشاعرہ آنند نرائن مُلّا صاحب کی سکریٹری شپ میں بارہ دری میں منعقد ہوا۔ آئندہ سال کے سکریٹری نے یہ جدّت پیش کی کہ مشاعرہ گومتی کی سطح پر منعقد کیا جائے۔ چنانچہ بڑی کشتیوں کا انتظام کیا گیا اور ان پر شاعروں کے لیے ڈائس اور سامعین کے لیے پلیٹ فارم بنایا گیا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ حسین آباد اسکول کے استاد بدؔر صاحب اہلِ مشاعرہ کی بالائی کی برف کے کوزوں سے ضیافت فرما رہے تھے۔ صفؔی صاحب کا مصرعہ ''دریا کی روانی ہے، بہتا ہوا پانی ہے'' بطور مصرعۂ طرح دیا گیا۔ ایک نئی اختراع یہ بھی تھی کہ ایسی نشستوں کی پسندیدہ غزلیں مشہور طوائفیں گایا کرتی تھیں۔ مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلیں گلدستوں کی شکل میں شائع بھی کی جاتی تھیں۔

۱۹۴۷ء سے لکھنؤ کی گرتی ہوئی تہذیب کا دوسرا تاریک ترین دور شروع ہوا۔ پنڈت گووند بلبھ پنت کی حکومت نے بیک نوک قلم پورے اتر پردیش میں اردو کو ختم کر دیا۔ جب سرکاری اسکولوں سے بھی اردو ختم ہوئی تو غیر سرکاری ادارے کیوں پیچھے رہ جاتے۔ بہت سے

اقلیتی اداروں تک سے اردو ختم کردی گئی۔ نئی اردوداں نسل پیدا ہونا بند ہوگئی لیکن کچھ عرصہ تک یہ کمی محسوس نہ ہوئی اس لیے کہ پچھلی نسل کے لوگ موجود تھے۔ اسی زمانے یعنی ۱۹۵۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے سفید بارہ دری، قیصر باغ میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوا جس میں جوشؔ کی ایک نظم کا ایک شعر یہ بھی تھا:

ٹھیکرے بیچنے والوں کے پرانے گاہک
بند کرتے ہیں جواہر کی دکاں اے ساقی

اسی مشاعرے میں اسرارالحق مجازؔ نے اپنی مشہور غزل جس کے ردیف وقوافی خم نہیں ہے، جم نہیں ہے، وغیرہ ہیں آخری مرتبہ سنائی اور اس کے بعد یہ کہتے ہوئے ''مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے'' لال باغ کے ایک میکدے میں جا کر ابدی نیند سو گئے۔

مذکورہ دور یعنی بیسویں صدی کا نصف اوّل لکھنؤ میں بیرونی اور لکھنوی شاعروں کی رقابت اور کشمکش کا دور تھا۔ لکھنؤ کے سینئر شعراء خصوصاً صفیؔ لکھنوی اور عزیزؔ لکھنوی کی نام نہاد عصبیت سے بیرون لکھنؤ سے آ کر یہاں آباد ہو جانے والے شاعر نالاں تھے جن میں یگانہؔ (یاسؔ عظیم آبادی) کا نام سرفہرست تھا۔ خالص لکھنوی شعراء میں صفیؔ لکھنوی، عزیزؔ لکھنوی، آشفتہؔ، اثرؔ، آرزوؔ، قدیرؔ، آل رضا، سراجؔ، شمسؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں اور بیرونی شعراء جن کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا وہ تھے عبدالباری آسیؔ الدنی، افقرؔ موہانی، یگانہؔ چنگیزی عظیم آبادی اور بیخودؔ موہانی۔ یہ حضرات اساتذۂ لکھنؤ کی برتری کے قائل نہ تھے۔ ان میں کئی ایسے تھے جن کے شاگرد آئندہ نسل کے اساتذہ میں شمار ہوئے۔ اس لکھنؤ میں بسنے والے لکھنؤ مخالف گروہ میں افقرؔ موہانی اور یگانہؔ چنگیزی پیش پیش تھے اور افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ان کی کچھ حرکتیں ایسی تھیں جن کی باوقار اساتذہ سے امید نہیں کی جاتی ہے۔ مثلاً افقرؔ موہانی اور سراجؔ لکھنوی کے

معاملات عدالت تک پہنچ گئے۔ ہوا یوں کہ اقتر موہانی نے سراج لکھنوی پر سرقے کا الزام لگایا اور یہ دعویٰ کیا کہ ان کی ایک غزل کسی قدیم شاعر سراج کی تھی۔ چنانچہ اس کو ثابت کرنے کے لیے ایک چھوٹا موٹا دیوان ترتیب دیا گیا، اسے کچھ عرصہ زمین میں دفن رکھا گیا تا کہ پرانا نظر آئے اور اس کے بعد اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ اسی طرح یگانہ کی حرکات کو بھی شائستہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ انھوں نے آیاتِ وجدانی میں اور اس کے علاوہ بھی صفی کو ہمیشہ حقی اور عزیز کو میاں ذلیل کے نام سے یاد کیا ہے۔ انہیں غیر شائستہ باتوں میں وہ سلوک بھی شامل تھا جو کچھ اہلِ لکھنؤ نے یگانہ سے روا رکھا۔ انھوں نے اپنی بحثوں میں یہ دلچسپ بات ضرور پیش کی کہ دبستانِ لکھنؤ کو وجود میں لانے والے انھیں کے ایسے باہر سے آنے والے شاعر تھے۔

۱۹۵۰ء کے بعد اردو پر زوال آیا لیکن ادبی انجمنوں کی تعداد پہلے سے زیادہ ہوگئی جن کا ذکر راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون ''لکھنؤ بعہد آنند نرائن ملاّ'' میں (جو ملاّ صاحب کو پیش کئے جانے والے غالب اکاڈمی کے کتابچے میں شامل ہے) اور مکرمی عرفان عباسی نے ''لکھنؤ کی ادبی انجمنوں'' کے عنوان سے نیا دور میں شائع ہونے والے اپنے مضامین میں کیا ہے۔ ان انجمنوں میں بزم شعراء جس سے راقم الحروف کا بھی گہرا تعلق رہا ہے، سب سے اہم تھی۔ اس انجمن کو سرکاری افسران اور اہلِ علم حضرات دونوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس کا نہ کانسٹی ٹیوشن تھا اور نہ اس میں عہدے دار ہوتے تھے۔ شہر کی اہم ترین شخصیتیں جن میں وزراء، آئی۔ اے۔ ایس۔ افسر اور ان کے ہم مرتبہ دوسرے افسران، ڈاکٹر، پروفیسر سبھی شامل تھے اور اس کی نشستیں اپنے مکانوں پر منعقد کرانے کے خواہاں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ اس کی نشستیں شری سمپورنانند وزیر اعلیٰ اتر پردیش، حافظ ابراہیم وزیر اتر پردیش، سید صدیق حسن صاحب آئی۔ سی۔ ایس اور دوسرے انھیں کے ہم مرتبہ افسروں کے یہاں منعقد ہوتی تھیں۔ اس بزم کی خصوصیت یہ تھی کہ

اس کی نشست دن کو ٹھیک دو بجے شروع ہوتی تھی اور دیر میں آنے والوں کو کلام سنانے سے محروم رہنا پڑتا تھا۔ نشستیں طرحی ہوا کرتی تھیں اور ہر شاعر کو دو طرحوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا اختیار ہوتا تھا۔ اس بزم کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس میں وہی شعراء مدعو کئے جاتے تھے جن کا مستند ہونا شک وشبہ سے بالاتر ہوتا تھا اور جو اس وقت کسی دوسرے شاعر کے شاگرد نہ ہوتے تھے۔ ایسی نشستوں میں شامل ہونے کا ہر شاعر متمنی رہتا تھا اور اس میں شرکت کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا تھا۔ عمر انصاری، سید نواب افسر، محمد حسین سالک، محضر لکھنوی، راقم الحروف، شارب لکھنوی، نہال رضوی، شفق شاہانی، ماہر لکھنوی، ساحر لکھنوی اور انور نواب کے ایسے تمام شہر کے اہم شعراء جو استادی کے مرتبہ پر فائز سمجھے جاتے تھے اس بزم کی نشستوں کے مستقل شرکاء تھے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر کیسری کشور نے بھی شاعری شروع کی تھی اور اچھے شعر کہنے لگے تھے۔ وہ بھی بزم شعراء کے فعال ممبر تھے۔ اس شاعرانہ ماحول نے کئی آئی۔ اے۔ ایس۔ افسروں کو بھی شعر گوئی کی طرف راغب کیا جن میں اطہر حسین صاحب مرحوم کا نام سرفہرست ہے۔ وہ مختصر شاعرانہ زندگی میں کئی مجموعوں کے مصنّف ہوئے۔ میری ایک زمانے کی شاگرد اور مشہور سماجی کارکن ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کو بھی شعر گوئی کا شوق ہوا تھا اور موصوفہ نے اپنے کچھ اشعار مجھے سنائے بھی تھے۔ پتا نہیں ان کا یہ شوق ہنوز برقرار ہے یا ختم ہو گیا۔ دو خواتین کے ذکر کے بغیر بزم شعراء کا ذکر نامکمل رہے گا۔ ان میں ایک میری اہلیہ مرحومہ کی ساتھی و ہمکار عزیز بانو داراب وفا تھیں جن کا چند ماہ قبل انتقال ہو گیا۔ شاعری انھیں اپنے پردادا اور غالب کے معاصر خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی سے ورثہ میں ملی تھی۔ وہ ہندوستان کی ان چند خواتین میں تھیں جو واقعی شعر کہتی ہیں۔ دوسری شاہجہاں بانو یاد ہیں جو کچھ سال قبل تک مشاعروں کی رونق سمجھی جاتی تھیں اور ایک مجموعۂ سخن ''یاد'' کی مصنّفہ ہیں۔ اس عہد کی ایک تیسری شاعرہ وصیہ

جائسی ہیں جو کسی زمانے میں میری مرحومہ اہلیہ کی شاگرد تھیں۔

لکھنؤ کی ادبی انجمنوں کا ذکر انجمن ترقی پسند مصنّفین کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ اس انجمن کا وجود ہی لکھنؤ میں ہوا تھا اور گزشتہ صدی کے پانچویں دہے میں وہ نوجوان ادیبوں کی توجہ کا مرکز رہی۔ اس کی باقاعدہ نشستیں پہلے پروفیسر آل احمد سرور اور اس کے بعد پروفیسر احتشام حسین صاحب کے دولت کدہ پر منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اس میں شعر خوانی سے زیادہ ادبی تحریکوں پر بحثیں ہوتی تھیں اور نثر پاروں پر بھی اظہار خیال کیا جاتا تھا۔

بزم شعراء اور انجمن ترقی مصنفین میں مستقل شرکت کرنے والوں کے علاوہ بھی لکھنؤ میں اچھے شاعر تھے۔ فضل نقوی شاعرِ اہلِ بیت تھے، محضر لکھنوی خوش فکر و خوش لحن غزل گو تھے، فیروز نظامی صرف رباعی کہتے تھے۔ ان سب کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اسلم لکھنوی، شمس لکھنوی کے جانشیں تھے۔ آسی الدنی صاحب کے صاحبزادے والی آسی اور فضل نقوی کے شاگرد کرشن بہاری نور عوامی مشاعروں کے کامیاب شاعر سمجھے جاتے تھے۔ انہی کی طرح تسنیم فاروقی، حیات وارثی، بشیر فاروقی بھی وہ شاعر تھے جن کی شرکت عوامی مشاعروں کی کامیابی کی ضامن ہوتی تھی افسوس ہے کہ ان ہر دل عزیز شعراء میں حیات وارثی، والی آسی اور کرشن بہاری نور اب دنیا میں نہیں ہیں۔ اس عہد میں عرفان صدیقی بدایونی، محسن رضا زیدی بہرائچی (جو میرے عزیز دوست کاظم رضا زیدی مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے) اور معراج فیض آبادی بھی مستقلاً اپنے وطن کو چھوڑ کر لکھنوی ہو گئے تھے۔ عرفان اور محسن دونوں میرے بہت عزیز کم عمر دوستوں میں تھے۔ افسوس ہے کہ دونوں کینسر کا شکار ہو گئے اور لکھنؤ دو انتہائی خوش گو شعراء سے محروم ہو گیا۔ معراج بھی میرے چھوٹوں میں ہیں۔ خوش گو ہونے کے علاوہ خوش لحن بھی ہیں اور عوامی مشاعروں کو لوٹنے کے ساتھ ساتھ مخصوص نشستوں میں بھی داد تحسین پاتے ہیں۔ مذکورہ بالا سخن سنجوں کے

علاوہ فلمی دنیا کے دو معروف ترین شعراء مجروحؔ سلطانپوری اور کیفیؔ اعظمی کا بھی لکھنؤ سے گہرا تعلق رہا تھا۔ کیفیؔ کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے سلطان المدارس میں ہوئی تھی اور مجروحؔ تکمیل الطب کالج کے طالبعلم رہ چکے تھے۔ دونوں کی شاعری لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول کی مرہون منت تھی جس کا مجروحؔ مرحوم نے جو میرے عزیز دوست تھے، خود مجھ سے اعتراف کیا۔

بزم شعراء کے علاوہ مغربی لکھنؤ کی ایک اہم ادبی انجمن ادارۂ شعر و ادب تھی۔ یہ بزم جعفر علی خاں صاحب اثرؔ کی یادگار تھی اور اس کے مشاعرے کشمیری محلے میں برابر ہوتے رہتے تھے۔ شاعروں کی تعداد گھٹنے سے بزم شعراء کی طرح اس ادارہ پر بھی زوال آ گیا پھر بھی میرے ایک سابق شاگرد ڈاکٹر مصطفیٰ فطرتؔ کسی نہ کسی طرح اس ادارے کو چلاتے رہے اور اس کی نشستیں اپنے مکان پر کرتے رہے۔ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں مَیں چار سال کے بعد لکھنؤ واپس آیا لیکن آج ۶؍ جولائی ۲۰۰۵ء تک اس ادارے یا مصطفیٰ فطرت کے متعلق کچھ بھی اطلاع نہ مل سکی۔

اس عہد یعنی بیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں لکھنؤ میں کچھ اچھے مزاح نگار بھی پیدا ہوئے۔ صفیؔ کے بھائی ظریفؔ لکھنوی کا عہد گزر چکا تھا۔ ان کے بعد والوں میں منور آغا، مجنوںؔ اور ماچسؔ لکھنوی شہر کے سب سے بہتر مزاح نگار تھے۔ مجنوںؔ فلموں میں کام کرنے کے سلسلے میں ممبئی چلے گئے تھے اور ماچسؔ پورے لکھنؤ پر چھائے رہے۔ انھوں نے بزم ظریف الادب قائم کی تھی جو زیادہ تر ان کے خوشہ چینوں پر مشتمل تھی۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعد یہ انجمن بھی ختم ہوگئی۔ ماچسؔ کے بھتیجے سگارؔ ان کی جانشینی کے فرائض انجام دے سکتے تھے لیکن وہ مستقلاً لکھنؤ سے باہر رہتے ہیں۔ ماچسؔ اور مجنوںؔ کے علاوہ ناظرؔ خیامی، آفتابؔ لکھنوی، ناوکؔ لکھنوی، مسٹرؔ لکھنوی وغیرہ دوسرے شہر کے مزاح نگار ہیں۔ ناظرؔ اور آفتابؔ عوامی مشاعروں کے کامیاب شاعر تھے۔ دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ ناظرؔ کے بھائی ساغرؔ خیامی ان کے انتقال کے

بعد مزاح نگار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

بزم شعرا ختم ہو گئی اور ادارۂ شعر و ادب غیر فعال ہو گیا۔ لیکن کچھ دوسری انجمنوں نے ان کی جگہ لے لی۔ بزم صفی کو راقم الحروف کے جوبلی کالج کے ساتھی عبدالستار بیدلؔ چلا رہے ہیں۔ اپنے کو مراد آبادی کہلواتے ہیں لیکن ہو گئے ہیں لکھنوی۔ ان کے یہاں ان کی صدارت میں ہر پندرہویں روز طرحی نشست ہوتی ہے جس میں مخصوص شعراء حصّہ لیتے ہیں۔ بزم شمس ایک پرانی انجمن ہے جسے شمسؔ لکھنوی کے شاگرد برسوں سے چلا رہے ہیں۔ پہلے اس کے سکریٹری ڈاکٹر کشفیؔ تھے اور اب ڈاکٹر معراج ساحلؔ اس کی روح رواں ہیں۔ سالانہ مشاعرے کے علاوہ اس کی ماہانہ نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ کرشن بہاری نورؔ کے انتقال کے بعد ان کے شاگردوں نے بزم نورؔ تشکیل دی۔ اس کے کرتا دھرتا بھارتی ہیں۔ میرے ایک قدیم شاگرد اخلاق حسین کیفؔ جواب لکھنؤ کے سینئر شاعروں میں شمار ہوتے ہیں، بزم کیف قائم کیے ہوئے ہیں۔ کیفؔ کی طرح ناصرؔ لکھنوی بھی میرے ایک سابق شاگرد ہیں۔ ان کا نام بھی ایک انجمن سے وابستہ ہے۔ انجمنوں سے ناوابستہ شاعروں میں جنھیں اب استادی کا مرتبہ حاصل ہے نسیم اختر صدیقی، سعید اختر نظامی اور تسنیمؔ فاروقی ہیں۔ پختہ مشق شاعروں کی کمی ہو جانے سے طرحی نشستوں میں کمی آ گئی ہے اور زیادہ شاعروں کی ہمّت افزائی کے لیے اب عموماً نشستیں غیر طرحی ہونے لگی ہیں۔

لکھنؤ کے نثری ادب کی تاریخ رجب علی بیگ سرورؔ کے فسانہ عجائب سے شروع ہوتی ہے جو نصیر الدین حیدر کے عہد کا کارنامہ ہے۔ یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ خود سرورؔ کی زندگی ہی میں ایک کائستھ عالم نے فسانہ عجائب کا فارسی میں ترجمہ بھی کر دیا تھا اور یہ ترجمہ راقم الحروف کے پاس موجود تھا لیکن دو ایرانی کتاب فروش جب دھوکے سے میرے سب خطّی نسخے

لے گئے تو یہ نادر نسخہ بھی چلا گیا۔ تقریباً تیس سال پہلے میں نے اس کا تعارف اپنے ایک مضمون میں کرایا تھا جو انجمن استادانِ فارسی کے رسالہ بیاض میں شایع ہوا تھا۔ سرورؔ کے بعد رتن ناتھ سرشارؔ، عبدالحلیم شررؔ اور برج نرائن چکبستؔ لکھنؤ کے مشہور نثر نگار گزرے ہیں۔ سرشار کا فسانۂ آزاد قسط وار اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا جس کے ایڈیٹر بھی سرشارؔ تھے۔ ان کی دوسری تصنیف سیر کوہسار ہے۔ یہ دونوں کتابی شکل میں نولکشور پریس سے شایع ہو چکی ہیں۔ شررؔ اپنے تاریخی ناولوں کے لیے مشہور ہیں لیکن ان کی تصنیف ''گذشتہ لکھنؤ'' لکھنؤ کی تاریخ اور ثقافت کی ایک اہم دستاویز ہے۔ چکبستؔ اپنی بلند پایہ شاعری کے علاوہ اپنے نثری مضامین کے لیے بھی مشہور ہیں، جو مضامینِ چکبستؔ کے عنوان سے شایع ہو چکے ہیں۔ ان تینوں مصنّفین کا تعلق انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں سے ہے۔ ان حضرات کے بعد بیسویں صدی کے سب سے اہم نثر نگار حیات اللہ انصاری صاحب تھے جن کا شاہکار ''لہو کے پھول'' اردو ناول نویسی میں اضافہ ہے۔ حیات اللہ صاحب نے طویل عمر پا کر ۱۸؍فروری ۱۹۹۹ء کو وفات پائی۔ ان کے معاصرین میں ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد مغربی پنجاب سے آنے والے اور لکھنؤ میں آباد ہونے والے رام لال اور ڈاکٹر بشیشر پردیپ برصغیر کے ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ رام لال فنافی الاردو تھے۔ جس زمانے میں اردو کو اسلام سے جوڑ کر مطعون کیا جا رہا تھا، انھوں نے غیر مسلم اردو ادیبوں کی شاندار کانفرنس کی اور دنیا کو دکھا دیا کہ اردو ہندوؤں کی بھی ویسی ہی زبان ہے جیسی مسلمانوں کی۔ ان کا پاکستان کا سفرنامہ بھی ان کے افسانوں کے مجموعوں کی طرح اہم اور دلچسپ ہے۔ افسوس ہے کہ رام لال جو راقم کے عزیز دوست تھے، عرصہ ہوا داغِ مفارقت دے گئے۔ ڈاکٹر بشیشر پردیپ بالکل میرے ہم عمر ہیں۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔ آئندہ نسل کے افسانہ نگاروں میں رتن سنگھ، عابد سہیل اور احمد جمال

پاشا اردو ادب میں اپنا مستقل مقام بنا چکے ہیں۔ رتن سنگھ اگرچہ لکھنؤ چھوڑ چکے ہیں لیکن لکھنویت ان میں باقی ہے۔ عابد سہیل کا وطن ضلع غازی پور تھا لیکن اب وہ لکھنوی بن چکے ہیں۔ احمد جمال پاشا مزاح نگار تھے اور اب دنیا میں نہیں ہیں۔ میری مرحومہ بیگم کی شاگرد اور عبدالباری آسی الدنی کی صاحبزادی عائشہ صدیقی خاتون افسانہ نگاروں میں اہم مقام کی حامل ہیں۔ لکھنوی زبان کی نثری تاریخ ہندی ادیب امرت لال ناگر کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ناگر صاحب لکھنوی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے اور ان کی ہندی میں لکھنؤ کی نزاکت اور شیرینی نمایاں تھی جو عموماً دوسرے مقامات کے ہندی ادیبوں میں مفقود ہوتی ہے۔ خالص ادب (Bell Letters) کے علاوہ گذشتہ صدی میں کچھ ٹھوس علمی کارنامے بھی انجام پائے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی جنھوں نے نیوتنی سے آ کر لکھنؤ کو اپنا وطن بنالیا تھا، لکھنؤ کے معتمد محقق تھے۔ ان کی پہلی ہی کتاب ''ہماری شاعری'' نے اہلِ علم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی۔ لیکن ان کے اصل کارنامے یونیورسٹی سے رٹائر ہونے کے بعد سامنے آئے۔ لکھنؤ کے شاہی اسٹیج اور لکھنؤ کے عوامی اسٹیج فن ڈرامہ نویسی سے متعلق ان کی اہم تصانیف ہیں۔ لیکن ان کا سب سے اہم کارنامہ انیسیات اور اردو مرثیہ پر تحقیق ہے۔ انھوں نے مرثیہ کی اہمیت کی طرف اہلِ علم کی توجہ مبذول کرائی اور آج ہندوستان اور پاکستان میں بہت کافی محققین مرثیہ نگاری پر تحقیقی مقالے لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی کا تعلق قصبہ سندیلہ سے تھا لیکن انھوں نے بھی لکھنؤ کو وطن بنالیا اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔ ان کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالے ''دہلی کا دبستانِ شاعری'' ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ ان کی علمی کاوشوں کا سلسلہ زندگی بھر چلتا رہا۔ کلیاتِ ولی اور کلیاتِ جعفر علی حسرت کی تدوین ان کے اہم کارنامے ہیں۔ نورالحسن ہاشمی شاعر بھی تھے اور ہاشمی تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ''اندرونم'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی بھی لکھنوی بن گئے

تھے اور آج بھی اسی شہر کی خاک میں آرام کر رہے ہیں۔ شیخ ناسخ پر ان کا تحقیقی مقالہ ایک اہم کتاب ہے۔ موصوف کی زیر نگرانی متعدد تحقیقی مقالے لکھے گئے، جس میں راقم الحروف کی اہلیہ مرحومہ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق کا ترتیب دادہ ''غزلیات سوداؔ'' شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ایک مستند محقق تھے۔ مولانا حالؔی پر ان کا تحقیقی مقالہ ایک اہم کتاب ہے۔ پروفیسر نیر مسعود تھے تو فارسی کے پروفیسر لیکن ان کا شمار اردو محققین میں ہوتا ہے۔ حال ہی میں میر انیؔس پر ان کی کتاب شائع ہو چکی ہے جو استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر سلیمان حسین نے بہت ہی محنت سے فسانۂ عجائب کو ایڈیٹ کیا۔ موجودہ صدر شعبۂ اردو، پروفیسر انیس اشفاق بھی صحیح علمی وادبی ذوق رکھتے ہیں اور امید ہے کہ آئندہ وہ وہی مقام حاصل کر لیں گے جو ان کے پیش رو حاصل کر چکے۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں کا شمار ملک کے اہم محققین میں ہوتا ہے اور ان کی متعدد تالیفات قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ مذکورہ اساتذہ نے علاوہ دوسری یونیورسٹی کے اہم اساتذہ کا بھی لکھنؤ سے تعلق رہا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ ہی میں حسین آباد انٹر کالج میں ہوئی۔ پروفیسر محمد حسن لکھنؤ یونیورسٹی میں میرے معاصر تھے اور اسی یونیورسٹی سے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند ملی اور پروفیسر اکبر حیدری نہ صرف لکھنؤ یونیورسٹی کے اسکالر رہ چکے ہیں بلکہ ایک معنی میں لکھنوی ہو بھی گئے ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی کی بھی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی اور وہ یہیں بس بھی گئے۔ فارسی کے دو معروف ترین اساتذہ پروفیسر نذیر احمد اور امیر حسن عابدی کی تعلیم بھی لکھنؤ میں ہوئی۔ اوّل الذکر لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ ہیں اور آخر الذکر کی ابتدائی تعلیم سلطان المدارس میں ہوئی۔

فن لغت نویسی کی طرف بھی لکھنؤ میں توجہ دی گئی تھی۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں ہفت قلزم کی تالیف ہوئی۔ موجودہ دور میں فرہنگ اثر اور مہذب اللغات اس فن کی اہم کتابیں ہیں۔

صحافت کے میدان میں بھی لکھنؤ کا ہمیشہ اہم حصّہ رہا۔ مولوی محمد یعقوب صاحب فرنگی محلی نے لکھنؤ سے پہلا اخبار ''کارنامہ'' نکالا۔ اس کے بعد نول کشور پریس سے اودھ اخبار نکلتا رہا جو ہندوستان کے آزاد ہونے سے پہلے ہی بند ہو گیا۔ اس کی ادارت ایک مدت تک رتن ناتھ سرشار کرتے رہے۔ اودھ اخبار کے معاصر اخباروں میں روزنامہ حقیقت اور روزنامہ حق قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر انیس احمد عبّاسی کا ذاتی اخبار تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھانجے توفیق علوی بھی اسے کچھ عرصے نکالتے رہے۔ حق اخبار کے مالک اور ایڈیٹر عبدالرؤف عباسی تھے۔ ہمدم اخبار کسمنڈی کے عبداللہ خان کا ذاتی اخبار تھا جسے ۱۹۴۶ء میں جمال میاں فرنگی محلی نے خرید لیا تھا لیکن فرنگی محل سے وہ زیادہ زمانے تک نہ نکل سکا۔ وہ زمانہ مسلم لیگ کی مسلمانوں میں مقبولیت کا دور تھا۔ مسلم لیگ کے لیڈر چودھری خلیق الزماں نے روزنامہ تنویر نکالا لیکن تقسیم ہند کے بعد ہی خلیق الزماں پاکستان چلے گئے اور تنویر بند ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں مسلمانوں میں کانگریس کو مقبول بنانے کے سلسلے میں قومی آواز نکالا گیا اور اس کی ادارت مشہور ادیب حیات اللہ انصاری کے سپرد کی گئی جو اس سے پہلے ہفتہ وار ہندوستان کی ادارت کر چکے تھے۔

حیات اللہ صاحب نے قومی آواز کے ذریعہ اردو صحافت کا ایک نیا بلند معیار قائم کیا جو دوسرے اخباروں کے لیے ایک نمونہ بن گیا۔ حیات اللہ صاحب (متوفی ۱۸ر فروری ۱۹۹۹ء) کے بعد عشرت علی صدیقی قومی آواز کو کامیابی کے ساتھ نکالتے رہے اور ان کے بعد عثمان غنی نے اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ افسوس ہے کہ آج ۲۶ر اگست ۲۰۰۶ء کو ان کا کینسر میں انتقال ہو گیا۔ انتظامی خرابی کی وجہ سے نیشنل ہیرالڈ اور نوجیون کے ساتھ قومی آواز بھی لکھنؤ سے نکلنا بند ہو گیا۔ یہ لکھنؤ کی صحافت کے لیے ایک سانحہ تھا۔ اسی زمانے میں جمیل مہدی مرحوم نے اپنا اخبار عزائم نکالا لیکن وہ ان کے انتقال کے بعد بند ہو گیا۔ ان اخباروں کے بند ہونے سے جو

خلا پیدا ہوا اسے پُر کرنے کے لیے بہت سے اخبار نکلے لیکن صرف تین ''اِن دنوں، صحافت، سہارا اور جدید عمل ہی جاری رہ سکے اور اب بھی نکل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ حال میں ہی ایک روزنامہ ''آگ'' کا اجرا ہوا ہے جس کے ایڈیٹر احمد ابراہیم علوی ہیں۔

روزناموں کے علاوہ کچھ بہت اہم رسائل بھی لکھنؤ سے جاری کیے گئے۔ ان میں منشی سجاد حسین کے اودھ پنچ کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں لکھنؤ کے تمام چوٹی کے ادیب مثلاً مچھو ستم ظریف، بشن نرائن در وغیرہ شامل تھے۔ اس کے مضامین اور کارٹونوں میں انگریزوں اور ان کی حکومت کا مذاق اڑایا جاتا تھا اور اس پر جم کر طنزیہ انداز میں تنقید کی جاتی تھی۔ بظاہر وہ ایک مزاحیہ جریدہ تھا لیکن حقیقتاً وہ وہی کام انجام دے رہا تھا جو اکبرالہ آبادی اپنی طنزیہ شاعری سے انجام دیتے تھے یعنی بدیسی راج کی مخالفت اور ہندوستانی قوم خصوصاً مسلمانوں کی بیداری۔ مجھے اس کا ایک کارٹون یاد آتا ہے جس میں لاڈ ریڈنگ کی شکل بنی تھی اور اس کے نیچے یہ شعر لکھا تھا۔

معشوق کی رفتار دکھاتے رہے ریڈنگ
ہر گام پہ اِک فتنہ اٹھاتے رہے ریڈنگ

منشی سجاد حسین کے بعد ممتاز حسین عثمانی نے منشی سجاد حسین ہی کی پالیسی کے تحت اودھ پنچ دوبارہ نکالنا شروع کیا اور اپنی وفات تک اسے کامیابی سے نکالتے رہے۔ پھر یہ رسالہ مستقلاً بند ہوگیا۔ بیسویں صدی کے غالباً چھٹے دہے میں احمد جمال پاشا نے اودھ پنچ کے نام سے ایک مزاحیہ رسالہ نکالا لیکن طنز نگاروں کی کمی کی وجہ سے وہ جلد ہی بند ہوگیا۔ اودھ پنچ کے بعد لکھنؤ سے نکلنے والا نیاز فتح پوری کا ''نگار'' اپنے عہد کا برصغیر ہندوستان کا سب سے بلند پایہ علمی اور ادبی جریدہ تھا اور مضامین کی اہمیت کے لحاظ سے وہ حیدرآباد کے سب رس اور اعظم گڑھ کے معارف سے کچھ بہتر ہی تھا۔ اپنے اس رسالے میں نیاؔز نے کچھ ایسے شاعروں اور ادیبوں کی طرف علما

کی توجہ مبذول کرائی جو گوشۂ گمنامی میں جا چکے تھے۔ انھیں میں عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی اور میر ممنونؔ دہلوی شامل تھے۔ اس زمانے میں عبدالماجد دریابادی ''صدق'' نکال رہے تھے جس میں خود نیاز پر زبردست تنقید ہوتی تھی۔ عبدالماجد صاحب کے بعد ان کے داماد حکیم عبدالقوی صاحب اسے لکھنؤ سے نکالتے رہے لیکن اس کا نام ''صدق'' سے ''صدق جدید'' اور ''سچ'' ہو گیا۔ لکھنؤ سے نکلنے والا ایک اور ماہنامہ ''کتاب'' تھا جس کی ادارت اس کے مالک عابد سہیل صاحب کرتے تھے۔ یہ ماہنامہ بھی زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ لیکن جب تک جاری رہا اس میں معیاری مضامین شائع ہوتے رہے۔ فی الحال لکھنؤ سے دو ماہنامے نکل رہے ہیں۔ ایک ہے ''لاریب'' جس کی ادارت رشید قریشی کر رہے ہیں اور دوسرا ''امکان'' ہے۔ جسے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نکالتے ہیں۔ اس کے شمارے کافی عرصے سے دیکھنے کو نہیں ملے۔

اس عہد کے لکھنؤ کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر ختم کرنے سے پہلے ان تحریکوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو یوپی میں اردو کو بچانے کے لیے شروع ہوئیں۔ پنڈت پنت کے یوپی میں اردو ختم کرنے کے بعد حیات اللہ صاحب نے دستخطی مہم شروع کی۔ پورے صوبے سے لاکھوں دستخط کروائے گئے اور ان کے ساتھ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے لیے صدر جمہوریہ ہند کو درخواست دی گئی لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ رام لعل نے اسی کے بعد غیر مسلم مصنّفین کی شاندار کانفرنس کی۔ حیات اللہ صاحب کی تحریک نے کم از کم اردو داں طبقے کو بیدار تو کیا اور ان کی احساس کمتری کو ختم کرنے میں مدد کی۔ رام لال کی کانفرنس نے ان لوگوں کے منہ بند کر دیے جو اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہہ کر مطعون کرتے تھے۔ ایسی تیسری تحریک رابطہ کمیٹی مقبول احمد لاری صاحب کی سرپرستی میں تشکیل پائی جس کے روح رواں ملک زادہ منظور احمد تھے اور میں۔ شجاعت علی سندیلوی اور محمد احمد ادیب کے ایسے دوسرے حضرات بھی ایسی تمام تحریکوں

میں شامل رہے۔

یہاں اردو پریس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس کی ابتدا عہد غازی الدین حیدر میں شاہی پریس سے ہوئی۔ اس کے بعد مولانا محمد یعقوب فرنگی محلی نے اپنے اخبار کارنامہ کے سلسلے میں پریس لگایا۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں لکھنؤ میں متعدد پریس کھلے جن میں مطبع مجتبائی، مطبع مصطفائی، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، لیکن سب سے اہم نولکشور پریس تھا جسے منشی نولکشور بھارگو نے ۱۸۵۸ء میں قائم کیا اور لاتعداد اردو، عربی اور فارسی کتابیں چھاپ کر انھیں ختم ہونے سے بچالیا اور خود راجہ کے مرتبہ کو پہنچ گئے۔ انھوں نے دوسرے لوگوں کو بھی پریس کھلوائے جوان کے زائد کام کو انجام دیتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد نولکشور پریس پر زوال آ گیا۔ راجہ رام کمار اور ان کے چھوٹے بھائی تیج کمار میں مقدمے بازی ہونے لگی۔ پریس بند ہو گیا اور سیکڑوں قیمتی مخطوطات الماریوں میں جن پر دونوں بھائیوں کے قفل لگے تھے، پڑے پڑے ختم ہو گئے۔ ان میں زیادہ تعداد ان کی تھی جو چھپ بھی نہ سکے تھے۔ تیج کمار صاحب نے کچھ عرصہ اپنا پریس چلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ موجودہ زمانے میں بہت سے اردو پریس موجود ہیں لیکن ان میں خاص تنویر پریس، کاکوری پریس، نامی پریس اور نظامی پریس ہیں۔ آثار ایسے ہیں کہ نامی پریس بھی زیادہ عرصہ نہ چل سکے گا۔

اردو ادب کے علاوہ فنون لطیفہ بھی لکھنوی تہذیب کے اہم عناصر تھے۔ ان میں رقص، موسیقی، مصوری، بت سازی وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ بیسویں صدی میں بھی ان کا دور دورہ رہا۔ رقص کے میدان میں بندا دین کے اخلاف برجو مہاراج، لچھو مہاراج وغیرہ پورے ہندوستان پر چھائے رہے۔ موسیقی کی ترقی کے لیے بھات کھنڈے میوزک کالج کھولا گیا جس نے اب یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرلیا ہے اور ہندوستانی موسیقی سیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ

آتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی ایک ازبک لڑکی اس کی طالبہ ہے۔ مشہور میوزک ڈائرکٹر نوشاد بھی لکھنؤ کے باشندے تھے۔ دیگر فنون لطیفہ مثلاً مصوری، مجسمہ سازی وغیرہ کی ترقی کے لیے لکھنؤ آرٹ اسکول کھلا جواب لکھنؤ یونیورسٹی کی Faculty of Fine Arts بن چکا ہے۔ فائن آرٹس کے علاوہ کامرشیل آرٹس کی بھی اس میں تعلیم دی جاتی ہے۔ مجسمہ سازی کے سلسلے میں اس ادارے کے استاد حنیف خان نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔

لکھنؤ میں مذہبی رسوم وتقریبات نے بھی ثقافتی اہمیت حاصل کر لی تھی اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ یہ ثقافتی انداز ماہ محرّم میں ایاّم عزا میں دیکھنے کو ملتا ہے اور اس کی تصویر کشی رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں بہت خوبصورت انداز میں کی ہے۔ ایام عزا غم کے دن ہیں لیکن ان کا انداز ثقافتی ہے۔ میرے ایک دوست ڈاکٹر کیسری کشور نے ایک واقعہ بیان کیا تھا کہ وہ کسی شیعہ دوست کے یہاں گئے۔ ان کی بیگم نسیم کی کوئی دیرینہ خواہش پوری ہوئی تھی۔ انھوں نے کیسری کشور سے کہا کہ اب کی ہم محرّم بہت دھوم سے منائیں گے۔ کیسری نے ان سے پوچھا کہ کیا محرّم دھوم دھام سے منانے کا تہوار ہے؟ اس پر وہ خاموش ہو گئیں۔ ماہ محرّم شروع ہونے سے پہلے ہی اس کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ نئے سیاہ ماتمی لباس تیار ہوتے ہیں، شاعر نئے نوحے اور مرثیے تصنیف کرنے لگتے ہیں اور ماتمی انجمنیں انھیں خوبصورت انداز میں پڑھنے کی پریکٹس شروع کر دیتی ہیں۔ پہلی محرم کو شاہی زری سے محرم کی تقریبات کا آغاز ہوتا ہے۔ نویں محرم تک شہر بھر میں مجالس عزا منعقد ہوتی ہیں اور ہر طرف مردوں کے علاوہ سیاہ پوش خواتین نظر آتی ہیں اور ایسی ہی کسی سیاہ پوش خاتون کو دیکھ کر ہی شاید بیخو دموہانی نے یہ مطلع کہا تھا:

امنگ کا یہ رنگ ہے ہجوم رنج و یاس میں
کہ جس طرح کوئی حسیں ہو ماتمی لباس میں

آٹھویں اور نویں محرم کو حسین آباد، امامباڑہ آصفی اور شاہ نجف میں چراغاں ہوتا ہے۔ مختلف مجالس میں شعرا اپنے نوتصنیف نوحے اور مرثیے پڑھتے ہیں اور سوز خواں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ذاکری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور مجلس بین و بکا پر ختم ہوتی ہے۔ دسویں محرم کو یوم عاشورہ منایا جاتا ہے۔ شہر میں مسلکی کشیدگی سے پہلے اس روز صبح کو شاہی زری کا جلوس چوک سے گزرتا تھا اس کے بعد دوپہر تک شیعوں کے ماتمی جلوس نکلتے تھے اور دوپہر کے بعد سنیوں کے تعزیے نکلتے تھے۔ یہ تعزیے دستکاری کے بہترین نمونے ہوتے تھے۔ چنانچہ کالے اور لال تعزیوں کے ساتھ ساتھ جَو کا تعزیہ خصوصیت کا حامل ہوتا تھا۔ تعزیوں کے ساتھ پٹا بانا اور بانس کی لمبی چھڑیں اٹھانے کا بھی مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ شیعہ حضرات کے جلوسوں میں پڑھے جانے والے نوحوں کے مقابلے سنیوں کے تعزیوں میں پڑھے جانے والے نوحے محض تماشا ہوتے تھے۔ روز عاشورہ گزرنے کے بعد شام کو امام باڑہ غفران مآب میں مجلسِ شامِ غریباں منعقد ہوتی تھی جس میں نہ فرش وغیرہ کا انتظام ہوتا تھا اور نہ روشنی کا۔ یہ مجلس آج بھی اسی انداز میں ہوتی ہے اور ٹیلی ویژن پر ہندوستان بھر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یومِ عاشورہ کے چالیس روز کے بعد چہلم منایا جاتا تھا اور اس روز بھی ایسے جلوس اٹھتے تھے جیسے عشرے کے روز۔ ابتدا میں محرم محض دس روز منایا جاتا تھا لیکن وقتاً فوقتاً دنوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ مجلس شامِ غریباں بھی بعد کا اضافہ ہے۔ بعد کو چہلم کے روز یوم عزا کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ۸ ربیع الاول تک یہ سلسلہ بڑھ گیا۔ ۸ ربیع الاول وہ تاریخ تھی جب حضرت علی زین العابدین قافلہ حسین کو لے کر مدینہ واپس ہوئے تھے۔ اس روز عزاداری ختم ہوتی ہے اور وہ تاریخ خوشیاں منانے کا روز ہوتا ہے۔ ایام عزا میں عام طور سے مسلمانوں میں اور خصوصاً شیعہ حضرات میں شادیوں اور خوشی کی تقریبات نہیں منعقد کی جاتیں۔ سنی حضرات کے یہاں بھی محرم کی دسویں

تاریخ تک شہادت نامے کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور یوم عاشورہ کو عموماً روزہ رکھا جاتا تھا۔ شاہی زمانے میں ذکرِ اصحاب رسول پر پابندی لگ گئی تھی جس کے خلاف میرے بچپن میں سنی حضرات نے احتجاج شروع کیا جس کے نتیجہ میں شہر میں شیعہ سنی تناؤ پیدا ہو گیا اور اکثر خونریز فسادات بھی ہوئے جس کے نتیجہ میں حکومت کی طرف سے عزاداری کے جلوسوں پر پابندی لگ گئی اور محرم کی ثقافتی حیثیت ختم ہو گئی۔ بہر حال حال ہی میں یہ تنازعہ ختم ہو گیا ہے اور امید ہے کہ اگر بعض عناصر کی وجہ سے منافرت کی فضا نہ پیدا کی گئی تو محرم کی رونق واپس آ جائے گی۔ اس عرصے میں ایک تبدیلی یہ ہوئی کہ عشرے اور چہلم کو چوک سے سنیوں کے تعزیے نکلنا تقریباً بند ہو گئے۔ پہلے علم کے جلوسوں میں نوحہ خوانی سننے کو ملتی تھی لیکن اب نوحوں کے کیسٹ ہر جگہ ملتے ہیں جن میں نوحہ خوانی کا انداز بھی پہلے سے بدلا ہوا ہے۔

جیسا عرض کیا جا چکا ہے لکھنؤ کا محرم ایک غمگین تقریب کے بجائے ایک ثقافتی تقریب بن گیا اور عوام الناس نے اس کو وہ شکل دے دی کہ جو سنجیدہ شیعہ حضرات کے لیے بھی باعثِ تکلیف ہو گئی، چنانچہ ظریفؔ لکھنوی اپنی ایک نظم میں جس کی ابتدا ''السلام اے حامیانِ ہیّو ہیّو دوے دوے'' سے ہوتی ہے۔ اس روش کے خلاف سخت احتجاج کیا۔

شہر میں محرم ہی طرح ماہ ربیع الاوّل بھی شان وشوکت کے اظہار کا مہینہ ہے۔ سنی حضرات ۱۲؍ربیع الاوّل کو اور شیعہ حضرات ۱۷؍ربیع الاوّل کو یوم پیدائش رسولؐ کے طور پر مناتے ہیں۔ اس پورے مہینہ محافل میلادِ رسول منعقد ہوتی تھیں۔ ایسی محفلیں گھروں کے علاوہ پبلک مقامات پر بھی انعقاد پاتی تھیں۔ جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے لکھنؤ میں محافل میلاد کے انعقاد کا سلسلہ مولانا عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی نے شروع کیا۔ ایسی محفلوں کی ابتدا عموماً نعت سے ہوتی ہے اور اس کے بعد کردارِ رسول اکرمؐ پر روشنی ڈالی جانے کے بعد ذکرِ ولادت ہوتا ہے۔

میرے بچپن میں پہلے پہل ذکرِ پیدائشِ رسول کے بعد ایک نعت پڑھ دی جاتی تھی اور اس رواج کے سب سے معروف شاعر حمیدؔ صدیقی تھے۔ عوامی محافل میلاد کے سلسلے کے بعد اس نعت خوانی نے نعتیہ مشاعروں کی شکل اختیار کرلی اور پیشہ ور نعت گو شاعروں کا ایک طبقہ وجود میں آ گیا۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف کا تلخ مشاہدہ رہا ہے کہ محفلِ ذکرِ رسولؐ منعقد ہوتی رہی اور ان پیشہ ور شاعروں کے گروہ کے حضرات نے اس میں شرکت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ جب ذکرِ رسولؐ کی تقریریں ختم ہو جاتیں تب اس گروہ کے لوگ اسٹیج پر تشریف لاتے۔ ان میں وہ حضرات بھی شامل نظر آتے تھے جو اس نعت خوانی کے وقت عالمِ سرمستی میں ہوتے۔ اس کا مشاہدہ مجھے کلکتہ کے گرینڈ ہوٹل کے ہال میں منعقد ہونے والے ایک نعتیہ مشاعرہ میں ہوا جب دو ہم نام شاعر جن میں ایک کا تعلق لکھنؤ سے اور دوسرے کا اندور سے تھا، اسٹیج سے بلائے گئے اور جب واپس آئے تو دوسروں کا ان کے قریب بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ بہر حال لکھنؤ کی کسی محفل میں مجھے اس گستاخی اور بدتمیزی کا تجربہ نہیں ہوا۔ ان عوامی محافلِ میلاد میں سب سے شاندار محفلِ میلاد انجمن فردوس ادب کی جانب سے امین آباد پارک میں منعقد ہوتی تھی۔ ۱۱؍ربیع الاوّل کا دن گزرنے کے بعد رات کو پورا شہر بقعہ نور بن جاتا تھا۔ شہر کی اہم سڑکوں پر خوبصورت پھاٹک لگائے جاتے تھے۔ دس بجے رات سے حیات وتعلیمات رسولؐ پر تقریروں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا اور ان کے اختتام پر نعتیہ مشاعرہ ہوتا تھا جس میں سنی شاعروں کے ساتھ بعض شیعہ شاعر بھی شرکت کرتے تھے۔ فجر کے قریب، جو پیدائشِ رسول کا وقت بتایا جاتا ہے، ذکرِ ولادت اور سلام و درود کے بعد میلاد ختم ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس تقریب نے وہ اہمیت حاصل کرلی تھی کہ لکھنؤ کے محرم کی طرح لکھنؤ کے میلادوں کا بھی ذکر دور دور ہوا کرتا تھا۔ ۱۱؍اور ۱۲؍ربیع الاوّل کی درمیانی شب میں امین آباد کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی محافل میلاد منعقد ہوتی تھیں جن میں چوک میں ہرن والے

پارک اور جھوائی ٹولے کے میلاد کافی مشہور تھے۔ بارہ ربیع الاوّل کے بعد بھی عوامی میلاد کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں جماعت راعین کا منڈی کا میلاد بہت اہم تھا۔ شہر میں شیعہ سنی تنازعہ کے بعد جب شارع عام پر مذہبی جلسہ جلوسوں پر پابندی لگ گئی تو امین آباد کے شاندار میلاد کی جگہ اسلامیہ کالج کے میلاد نے لے لی۔ شیعہ حضرات بھی یومِ پیدائشِ رسولؐ مناتے ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ تاریخ ۱۷ ربیع الاوّل ہے۔ ان کی محافل عموماً چند بڑی مسجدوں تک محدود رہتی تھیں۔

ایک تیسری مذہبی تقریب جس نے ثقافتی اہمیت حاصل کر لی تھی، شب براُت تھی۔ اس روز سنی حضرات کے یہاں بزرگوں کی فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ دن کو یہ فاتحہ خوانی حلوہ اور روٹی پر گھروں میں ہوتی ہے اور رات کو قبرستان میں جا کر لوگ بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ شیعہ حضرات شب براُت کو دوسری طرح مناتے ہیں۔ اس روز کو امام مہدی آخرالزماں سے منسوب کیا جاتا ہے اور خوشی میں آتش بازی کی جاتی ہے اور رات کو گومتی کی سطح پر بجرا آراستہ کیا جاتا ہے جس پر امام غائب کی مدح میں شعر خوانی ہوتی ہے اور ان کی باز آمد کی استدعا کے عریضہ دریا میں ڈالے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ پوری رات جاری رہتا ہے۔

مسلمانوں کے مذکورہ تہواروں کے علاوہ اہلِ ہنود کے تہوار بھی لکھنؤ میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ ہولی میں وہ ناشائستہ حرکتیں جن کی وجہ سے اکثر مقامات پر فرقہ وارانہ فساد ہو جاتے ہیں، یہاں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ دیوالی اور دسہرے کے تہوار بھی اس شہر میں شائستگی کے ساتھ منائے جاتے ہیں۔ دیوالی کے بعد جمگھٹ کے روز پتنگ بازی کا زور ہوتا ہے۔ بلاتفریق مذہب و ملّت اس روز ہر شخص پتنگ بازی میں مصروف ہوتا ہے اور پتنگوں کی کثرت سے آسمان ڈھکا معلوم ہوتا ہے۔ بسنت ایک قومی تہوار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ہر طرف بسنتی رنگ کی بہار

نظر آتی ہے۔ پتنگ بازی کے شوقین اس روز بسنتی رنگ کے کنکوے اڑاتے ہیں۔ مسلمان بھی اس موسمی تہوار میں برابر کا حصّہ لیتے ہیں۔ اچھے خاندانوں سے متعلق میراثی انھیں آم کے بور پیش کر کے بسنت کی مبارکباد دیتے ہیں اور انعام پاتے ہیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں بھی کچھ تہواروں کے موقعوں پر پرانے قسم کے میلے لگتے ہیں جن میں مٹی کے برتنوں سے لے کر ریڈیو ٹرانسسٹر تک ہر قسم کی نئی پرانی چیزیں ملتی ہیں۔ گنگا اشنان کے موقع پر منعقد ہونے والا میلہ ایسا ہی ہے اور کئی دن تک ان کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ لکھنؤ کے میلوں کے سلسلے میں بھی رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں ذکر کیا ہے۔

لکھنوی تہذیب کے تحت خواتین میں سخت پردے کا رواج تھا اور اس میں ہندو مسلمانوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ مسلم خواتین بغیر پردے کے انتظام کے گھر کے باہر قدم نہیں رکھتی تھیں۔ کم سے کم فاصلے کے لیے بھی فنسون، چوپہلون اور ڈولیوں کا استعمال کیا جاتا۔ خواتین کے علاوہ یہ فینسیں اور چوپہلے طبقۂ علما کی سواری کا بھی کام دیتے تھے۔ برقعوں کا بھی رواج تھا جس میں سر سے لے کر پیر تک جسم ڈھکا رہتا تھا اور اسے عموماً وہ خواتین استعمال کرتی تھیں جو ڈولی، چوپہلے وغیرہ کے خرچ کی متحمل نہ ہو سکتی تھیں۔ عورتوں کی زیبائش کے لیے جو زیورات استعمال ہوتے تھے وہ بھی تقریباً یکساں تھے۔ ہندو عورتوں میں سیندور سے مانگ بھرنا سہاگ کی علامت تھی اور پیشانی پر بندی آرائش کے لیے لگائی جاتی تھی۔ مسلمان عورتوں میں افشاں سے مانگ بھری جاتی تھی۔ پیشواز کا رواج ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ بڑے پیچوں کے پائجاموں اور غراروں نے لے لی تھی۔ ہندو خواتین کا عام لباس ساری تھی۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد حالات بدلے۔ پنجاب اور سندھ سے آنے والے ایک نئی تہذیب اپنے ساتھ لائے۔ ان کے یہاں بے پردگی معیوب نہ تھی۔ اس کا اثر لکھنؤ کی خواتین پر پڑا اور اکادکا مقامی خواتین بھی بے

پردہ نظر آنے لگیں اور آج تو پردہ بالکل ہی ختم ہو چکا ہے۔نو واردوں کا اثر یہاں کے لباس پر بھی پڑا اور ساری اور پائجاموں یا غراروں کی جگہ شلوار جمپر نے لے لی۔ مردوں کے لباس بھی تبدیل ہو گئے۔شیروانی جو شریفانہ لباس سمجھی جاتی تھی اب بالکل متروک ہو چکی ہے حتیٰ کہ اس کے سینے والے بھی اب لکھنؤ میں انگشت شمار ہیں۔ عام لباس کرتا پیجامہ یا کرتا دھوتی رہ گیا ہے لیکن وہ بھی گھروں تک محدود ہے۔ باہر ہندوستان بھر کا عام لباس یعنی قمیص پتلون یا سوٹ اب اہلِ لکھنؤ کا بھی عام لباس ہے۔ غذاؤں میں بھی تبدیلی آئی اور گوشت خوری کا رواج بڑھ گیا۔ کچھ پنجابی غذائیں بھی عام ہو گئیں اور چھولے بٹورے اب ایک عام غذا ہے۔ پنجابی مہاجرین اپنے ساتھ اپنے ناچ گانے بھی لائے اور اب شادیوں کے موقع پر برسرِ عام بھنگڑا ناچ ہونے لگا جو لکھنوی تہذیب کے لحاظ سے سخت معیوب تھا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ دور اردو زبان کے خاتمے کے آغاز کا دور تھا۔ ہندی قومی زبان بن کر اردو کی جگہ لے چکی ہے اور آج اردو زبان کے عاشقوں کے گھروں سے بھی اردو ختم ہو چکی ہے۔اور اردو کا خاتمہ لکھنوی تہذیب کا خاتمہ ہے۔

پانچواں باب

میرے عہد کے غیر سنجیدہ اور تفریحی مشاغل

دماغ و دل کی کسرت ہو وہ، یا ہو جسم کی ورزش
ضروری ہے بشر کے واسطے ہر قسم کی ورزش

بیسویں صدی میں لکھنؤ میں قدیم غیر سنجیدہ مشاغل میں بھی کمی آ گئی اور ان کی جگہ نئے نئے تفریحی مشاغل نے لے لی پھر بھی پرانے مشاغل پورے طور سے ختم نہیں ہوئے۔ کنکوے بازی عوام اور خواص دونوں کا دلچسپ تفریحی مشغلہ رہا۔ لوگ گھروں سے بھی پتنگیں اڑاتے تھے اور شہر کے کھلے میدانوں سے بھی۔ کنکوے بازی کے باقاعدہ میچ ہوتے تھے جس میں شہر کی دو بلند عمارتوں سے دو گروہ جنھیں چھوٹے موٹے کلب کہا جا سکتا ہے کنکوے اڑاتے تھے۔ کافی لمبے پینچ لڑائے جاتے ہیں۔ اہم میچوں کے لیے گومتی کے کنارے کا وہ وسیع میدان جواب بدھا پارک بن چکا ہے استعمال ہوتا تھا۔ ایک گروہ کا مستقر سڑک کے کنارے بنی جنوں کی مسجد کا پہلو ہوتا تھا اور دوسری پارٹی کا گومتی کے کنارے شکلا گھاٹ کا پہلو۔ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پینچ لڑانے کے لیے پارٹی کے کئی ممبر بیک وقت کئی کنکوے اڑاتے تھے۔ ایک پینچ کے ختم ہوتے ہی کٹنے والے کنکوے کی جگہ دوسرا کنکوا بڑھ کر پینچ کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ شام تک جو پارٹی زیادہ

پینچ کاتی تھی وہ فتح مند ہوتی تھی۔ کنکوے کے میچ صرف لکھنؤ کے کلبوں کے درمیان نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کے ٹورنامنٹوں میں حصّہ لینے کے لیے دہلی اور دوسرے مقامات سے بھی ٹیمیں آیا کرتی تھیں۔ آج کرکٹ میں سنچری بنانا ایک اعزاز ہے۔ میرے شباب تک اگر کسی میچ میں کوئی کنکوا سات پینچ کاٹ دیتا تھا تو اس کے لڑانے والے کی وہی حیثیت ہوتی تھی جو آج سنچری بنانے والے پلیر کی ہوتی ہے۔ پینچ لڑانے کے دو طریقے ہوتے تھے۔ ڈھیل دے کر اور گھسیٹ کر۔ اور میرے عنوان شباب تک ان دونوں کے استاد موجود تھے۔ ڈھیل دے کر پینچ لڑانے والوں میں لالہ رام داس اور نواب سلطان صاحب استادانہ حیثیت رکھتے تھے۔ سلطان صاحب ہمیشہ بیٹھ کر پینچ لڑاتے تھے۔ کنکوے ایک دوسرے کے قریب جب پہنچ جاتے تھے اس وقت سے پینترے بازی شروع ہو جاتی تھی۔ بعض کنکوے باز اپنی پتنگ کو اوپر رکھ کر پینچ لڑانے کی مہارت رکھتے تھے اور بعض نیچے رکھ کر۔ ڈھیل دے کر لڑانے والے کی کلمے کی انگلی کا سارا کرشمہ ہوتا ہے۔ سنبھل سنبھل کر ایک ایک انچ ڈور اس پر سے نکلتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ سلطان صاحب کی یہ انگلی اتنی حسّاس ہوگئی تھی کہ پینچ پڑنے کے بعد وہ یہ تک بتا دیتے تھے کہ ریل کے کتنے تار کٹ گئے۔ (ریل وہ ڈور ہوتی تھی جو کنکوے کے اگلے حصے میں باندھی جاتی تھی اور شیشہ کا سفوف اور مصالحہ لگا کر اسے اتنا تیز کر دیا جاتا تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی سے وہ ہاتھ کو لہولہان کر دیتی تھی۔ باقی ڈور سادی کہلاتی ہے)۔ دلچسپ میچ وہ ہوتا تھا جس میں ایک فریق ڈھیل دے کر لڑانے والا ہوتا تھا اور دوسرا کھینچ کر لڑانے والا۔ کھینچ کر لڑانے والے عموماً اپنی پتنگ کو نیچے رکھتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اپنی پتنگ کو زیادہ سے زیادہ قریب لا کر فریق مخالف کی پتنگ کو کاٹ دیں اور فریق ثانی ڈھیل دے کر لڑانے والا کوشش کرتا تھا کہ اوپر سے اپنے کنکوے کا دباؤ اس طرح قائم رکھے کہ کھینچ کر لڑانے والے کو کھینچ کر قریب آنے کا موقع نہ ملے۔ ڈھیل دے کر

لڑائے جانے والے پیچ کبھی اتنے زیادہ بڑھ جاتے تھے کہ کنکوے نظر آنا مشکل ہوجاتا تھا۔ ایسے حالات میں پیچ چھڑا کر کنکوؤں کو قریب لاکر پھر سے پیچ شروع ہوتا تھا۔ سلطان صاحب کے معاصرین میں کھینچ کر لڑانے والوں میں ذکی سب سے زیادہ مشہور تھے۔ ان کے بعد کی نسل میں شہر کے مشہور معالج ڈاکٹر ٹی بہادر (Dr. T. Bahadur) کے بیٹے پریم بہادر (جو لکھنوی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے) اور میرے دو ہم درس مہدی علی خاں عرف منے نواب اور آغا ریاست قاسم عرف بکھن صاحب کھینچ کر کنکوا لڑانے والوں میں سب سے بہتر تھے۔ ان سب حضرات میں سے کوئی بھی اب دنیا میں نہیں ہے۔ قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے کنکوے بازی ایک مہنگا تفریحی مشغلہ ہوگیا ہے اور اس کے میچوں کا سلسلہ مدّت سے ختم ہوچکا ہے۔ اب صرف گھروں سے معمولی چھوٹے سائز کی پتنگیں اڑتی نظر آتی ہیں۔ دریا کنارے کا میدان بدھا پارک میں تبدیل ہوچکا ہے۔ کنکوے بازی کچھ لوگوں کے پیٹ پالنے کا بھی وسیلہ تھا۔ ریل اور ڈور بنانے والوں کا ذکر ہوچکا ہے۔ کنکوے بنانا خود ایک فن ہوگیا تھا۔ اکثر کنکوے بنا کر کچھ عرصے رکھے جاتے تھے اور ''رس'' جانے کے بعد وہ لڑانے کے لائق ہوتے تھے۔ میچوں میں کٹنے والوں کنکوؤں کو چمٹانا اور ان کی ڈور کو لوٹنا بھی پیشہ تھا اور گومتی کے کنارے کے میدان کا ٹھیکہ ہوا کرتا تھا۔ کٹے ہوئے کنکوؤں کو چمٹانے کے لیے ڈور کے آگے لوہے کے مہین تار کے ٹکڑوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طرح چمٹائی ہوئی پتنگیں اور لوٹی ہوئی ڈور بازار میں بیچ دی جاتی تھی۔ میچوں میں باقاعدہ جوا بھی ہوتا تھا اور کون کاٹے گا اس پر بازی لگائی جاتی تھی۔

کنکوے بازی کی طرح کبوتر بازی کا مشغلہ بھی میرے شباب تک شباب پر تھا۔ ذکر کیا جاچکا ہے کہ کبوتر دو قسم کے ہوتے تھے۔ گولہ اور گرا باز۔ میرے عنفوان شباب میں گولہ کبوتروں کو اڑانے اور ان کی ٹکڑیوں کو لڑانے والے سب سے بڑے استاد لڈّن صاحب تھے۔

ان کے دونوں بیٹے کجن صاحب اور جمشید مرزا بھی اپنے عہد کے مشہور کبوتر باز تھے۔ کبوتر بازی ان کا شوق ہی نہیں پیشہ بھی تھا۔ کبوتروں کی ٹکڑیاں اڑائی جاتی تھیں اور کبوتر باز اشاروں سے اپنے کبوتروں کے گروہ (جنھیں اصطلاحاً ٹکڑی کہتے تھے) کو دوسری ''ٹکڑیوں'' سے مل جانے کو کہتے تھے جسے کبوتر بازی کی اصطلاح میں ''لڑانا'' کہتے ہیں۔ ان مختلف ٹکڑیوں کے آپس میں ملنے کے بعد کچھ کبوتر ادھر سے ادھر چلے آتے تھے اور انھیں پکڑ لیا جاتا تھا۔ عموماً ایسے کبوتروں کے اصل مالک انھیں پکڑنے والے کو قیمت ادا کر کے خرید لیتے تھے ورنہ پکڑنے والا انھیں نخاس کے کبوتر کے بازار میں فروخت کر دیتا تھا۔ کبوتروں کی نگہداشت اور ان کی غذا اور دوا علاج پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ کبوتروں کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے انھیں اکثر بھیگا اور ابلا ہوا باجرا جس میں کچھ دوائیں بھی ملا دی جاتی تھیں دیا جاتا تھا۔ یہ شوق اب تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی آسمان پر دو ایک ٹکڑیاں اب بھی نظر آ جاتی ہیں۔ کنکوے بازی کی طرح کبوتر بازی بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ شوق تھا۔ کبوتروں کی دوسری قسم گرہ باز تھے۔ ان کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے۔ مرے ایام شباب میں اس کے استاد جوہری محلے کے منے صاحب تھے جو مدت ہوئی شدید مفلسی کے عالم میں انتقال کر گئے۔ میرے یونیورسٹی کے استاد یوسف حسین موسوی صاحب بھی گرہ باز کبوتروں کے بیحد شوقین تھے۔ مرغ بازی اور بٹیر بازی سے موجودہ نسل واقف ہی نہ ہوگی۔ اپنی جوانی میں مجھے کٹرہ ابوتراب خاں میں ایک بٹیر کی پالی دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ لڑائے جانے والے اصیل مرغ کی تو نسل ہی شاید ختم ہو چکی ہے۔ یہی حال کچھ بٹیروں کا بھی ہے۔

جدید کھیلوں میں میرے عنفوان شباب میں ہاکی کا دور دورہ تھا۔ شہر میں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی کے علاوہ چار مشہور ہاکی کلب تھے۔ روورس (Rovers) جس کے کرتا

دھرتا اور کوچ بڑے چھن صاحب تھے، لکھنؤ ینگ مینس ایسوسیشن (Lucknow Young men's Association) (جو عرف عام میں ایل۔وائی۔اے کہلاتا تھا) ۱۹۴۷ء سے پہلے اس کلب کی روح رواں اور کوچ خلیق الزماں صاحب کے بھائی مشفق الزماں صاحب تھے، تیسرا کلب بنگالی ینگ منس ایسوسی ایشن (بی۔وائی۔اے) تھا۔اس کے روح رواں ہابل مکرجی تھے اور اس کے اصل کوچ ترن ڈے اور خاص سرپرست ڈاکٹر اے۔سی۔چٹرجی تھے۔چوتھا کلب میٹروپولیٹن ینگ منس اسوسی ایشن تھا جو عرف عام میں ایم۔وائی۔اے کہلاتا تھا۔ایم۔وائی۔اے میں سب سے زیادہ دلچسپی رکھنے والے پروفیسر مسعود صاحب کے بھائی آفاق صاحب اور شیعہ کالج کے لائبریرین رضی صاحب تھے اور اس کے صدور جسٹس غلام حسین صاحب، جسٹس مبشر حسین قدوائی اور سب سے آخر میں جسٹس آنند نرائن ملا تھے۔میرا تعلق بھی اسی کلب سے تھا۔یہ چاروں کلب آزادی ہند کے پہلے وجود میں آئے تھے لیکن آزادیٔ ہند کے بعد جب ہاکی کی ہردلعزیزی کی جگہ کرکٹ نے لے لی تو ان کلبوں پر بھی زوال آیا۔سب سے پہلے رووَرس کلب ختم ہوا اور اس کے زیادہ تر پلیر ایم۔وائی۔اے میں آگئے۔اس کے بعد ایل۔وائی۔اے غیر فعال ہوا۔اس کے بعد ایم۔وائی۔اے بھی ختم ہوگیا۔سب کے آخر میں بی۔وائی۔اے کا ہاکی سکشن ختم ہوا۔ان کلبوں کے کارکن، جیسا اوپر ذکر ہوا ہے، پیشہ ور نہ تھے بلکہ ان میں سے زیادہ تر اپنے وقت کے خود اچھے کھلاڑی تھے جو واقعی اس کھیل کو ترقی دینے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ہابل مکرجی اور عیوض علی اپنے وقت کے ہندوستان کے بہترین کھلاڑیوں میں تھے اور ڈاکٹر اے۔سی۔چٹرجی مدتوں یوپی ہاکی فیڈریشن کے صدر رہے۔یہ تمام حضرات جہاں کہیں بھی کسی ایسے نوجوان کو دیکھتے تھے جس میں انھیں اہلیت (Talent) نظر آتی اسے اپنے کلب میں کھینچ لے جاتے تھے۔یہ نوجوان اکثر اسکولوں اور کالجوں کے طلبا ہوتے تھے اور

وہیں کی ٹیموں سے نکل کر کلبوں میں آتے تھے۔ اودھ کے ایک تعلق دار خاندان کے چار نونہال راجا، موہن، کے ڈی سنگھ بابو اور سریش کا نکبج کالج کی ٹیموں میں وقتاً فوقتاً کھیلتے تھے۔ وہاں سے وہ ایل۔ وائی۔ اے میں پہنچے اور تیسرے بھائی بابو بین الاقوامی شہرت کے کھلاڑی ہو گئے۔ ان کی ترقی میں جوبلی کالج کے ارشاد حسین کا بڑا ہاتھ تھا۔ ارشاد رائٹ آؤٹ اور بابو رائٹ ان کھیلتے تھے اور دونوں کا **Combination** مشہور تھا۔ بعد کو بابو کو ہابل مکرجی اور ڈاکٹر اے۔ سی۔ چٹرجی کی بھی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ یہ تمام بھائی میرے معاصر تھے۔ راجا اور موہن مجھ سے سینئر، بابو مجھ سے ایک سال جونیر اور سریش ان کے بھی بعد کے تھے۔ اس زمانے کے بی۔ وائی۔ اے کے کھلاڑیوں میں بمبل چکرورتی میرے خاص دوستوں میں تھے۔ ایم۔ وائی۔ اے کے اس دور کے کھلاڑیوں میں دوست عزیز مرحوم عابد علی رضوی بھی ایک مرتبہ ہندوستان کی ٹیم میں شامل ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اس کلب کے کھلاڑیوں میں بی۔ کے۔ مصرا (جو بعد کو آئی۔ اے۔ ایس۔ ہو گئے تھے)، مظفر حسین، ان کے بڑے بھائی طٰہٰ اور چھوٹے بھائی یحییٰ تھے۔ مظفر پاکستان جانے کے بعد ایڈ مایرل اور طٰہٰ انکم ٹیکس کمشنر ہوئے۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۹۴۲ء میں آفاق صاحب نے، جو باڈی بلڈر تھے اور خود ایک جمنیزیم چلاتے تھے، مجھے لوڈ دوِک پورٹر گراونڈ پر **Parallel Bars** پر ورزش کرتے ہوئے دیکھا اور جب انھیں معلوم ہوا کہ جوبلی کالج میں ہاکی کھیلتا ہوں تو مجھے اپنے کلب ایم۔ وائی۔ اے میں گھسیٹ لے گئے۔ رضی صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد روورس کلب سے آنے والے حلیم الدین ایڈوکیٹ اس کلب کے سکریٹری ہو گئے اور ان کی غیر فعالیت نے رفتہ رفتہ کلب کو ختم کر دیا۔ ان تمام کلبوں میں کھیل کے میدان میں زبردست رقابت تھی لیکن ذاتی طور سے اس کے سرپرستوں اور کھلاڑیوں میں بہت ہی دوستانہ تعلقات تھے چنانچہ عرض کیا جا چکا ہے کہ کے۔ ڈی۔ سنگھ بابو، ایل۔ وائی۔ اے

کے کھلاڑی تھے لیکن ان کی ترقی میں ۔بی۔وائی۔اے کے ہابل مکرجی اور ایس۔سی چٹرجی کا بڑا حصّہ تھا۔اسی طرح ایم۔وائی۔اے کے عابد علی کو رائٹ اِن کی پوزیشن سے رائٹ بیک کی پوزیشن پر جہاں وہ بین الاقوامی پلیر بنے، لے جانے والے ایل۔وائی۔اے کے مشفق الزماں صاحب تھے۔لکھنؤ میں ہاکی کا درخشاں دوران کلبوں کے ساتھ ختم ہوگیا۔سی۔بی۔گپتا صاحب کی وزارت کے دور میں یوپی اسپورٹس کونسل بنی جس کے صدر لکھنؤ کے کمشنر صدیق حسن آئی۔اے۔ایس تھے اور اس کے جوائنٹ سکریٹریوں میں ایک راقم الحروف بھی تھا۔لکھنؤ اسپورٹس اسٹیڈیم بنا اور مختلف کھیلوں کی ترقی کے لیے کوچ مقرر ہوئے لیکن ان پیشہ ور کوچوں میں وہ للک اور جذبہ کہاں تھا جو مذکورہ کلبوں کے غیر پیشہ ور کوچوں میں تھا جو ڈھونڈ ڈھونڈ کر صاحبِ استعداد بچوں کو سامنے لاتے تھے۔اس آفیشل کوچنگ کے زمانے میں بھی کچھ پلیر نکلے ضرور نکلے لیکن بحیثیت مجموعی ہاکی نہ صرف لکھنؤ بلکہ پورے اتر پردیش میں ختم ہوگئی۔اسکول کالج جہاں یہ بچے ملتے تھے وہ بھی صرف ہاکی کیا تمام کھیلوں سے بے تعلق ہو چکے ہیں۔

میرے عہد کا ہاکی کے علاوہ فٹ بال دوسرا پسندیدہ کھیل تھا جس میں سب سے کم خرچ ہوتا تھا۔لکھنؤ کے ہر اسکول اور کالج میں وہ مقبول تھا اور میڈیکل کالج کی طرف سے سالانہ لیکھ راج کپ ہوا کرتا تھا جس میں یونیورسٹی اور تمام کالج حصّہ لیا کرتے تھے۔میرے جوبلی کالج کی طالب علمی کے زمانے میں اس کالج نے مسلسل چھ سال یہ ٹورنامنٹ جیتا تھا۔اسکول کالجوں کے علاوہ شہر میں ایک مشہور فٹ بال کلب سٹی کلب تھا۔اس کے کھلاڑی طالب علموں سے زیادہ دوسرے پیشوں میں مشغول نوجوان تھے۔آزادی ہند کے بعد فٹ بال پر بھی زوال آگیا۔

ہاکی اور فٹ بال کی جگہ ۱۹۵۰ء کے بعد کرکٹ نے لے لی۔میرے کلاس فیلو اور دوست عسکری حسن نے شیش محل کلب کی بنیاد ڈالی جس کے مدت تک میجر جنرل حبیب اللہ

صدر رہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کلب نے ترقی کی اور اس کے تحت گرمیوں میں ایک آل انڈیا شیش محل کرکٹ ٹورنامنٹ بھی ہونے لگا جس میں ہندوستان کی اہم کرکٹ ٹیمیں حصّہ لیتی رہیں۔ شیش محل کلب کے علاوہ لکھنؤ یونیورسٹی میں بھی کرکٹ کی پریکٹس ہوتی رہی لیکن لکھنؤ کوئی قابلِ ذکر کرکٹ کھلاڑی پیدا نہ کرسکا۔ شیش محل کلب اب بھی فعال ہے لیکن عسکری کی اکلوتی بیٹی کی وفات اور خود ان کی صحت کی خرابی کی وجہ سے کلب پر بھی زوال آچکا ہے۔

ٹینس رئیسوں کا کھیل رہا ہے۔ ایک زمانے میں رفاہ عام کلب لانس ہندوستان بھر میں مشہور تھے اور ان لانس پر کھیل کر غوث محمد خاں نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی تھی۔ رفاہ عام کلب کی شاندار خستہ حال عمارت کے سامنے جہاں کبھی یہ لانس ہوا کرتے تھے اب چٹیل میدان ہے۔ مذکورہ کلب کے بعد لکھنؤ جمخانہ کلب کے لانس ٹینس کے کھلاڑیوں کی توجہ کا مرکز بنے لیکن یہاں سے کوئی قابلِ ذکر کھلاڑی سامنے نہیں آیا۔ فی زمانہ ٹینس کی کوچنگ کا انتظام اسپورٹس اسٹیڈیم میں ہے۔

کشتی اہلِ لکھنؤ کا ایک پسندیدہ مشغلہ تھا۔ میرے عنفوان شباب میں اس کا رواج تھا۔ شہر کے مختلف مقامات پر اکھاڑے قائم تھے جن میں تین قابلِ ذکر تھے۔ حسین گنج میں جمّا خان کا اکھاڑہ تھا، بلوچ پورہ میں چھدن پہلوان کا اکھاڑہ تھا اور چوک کے مغرب کی گلیوں میں صادق پہلوان کا اکھاڑہ تھا۔ میرے عنفوان شباب ہی میں دونوں اوّل الذکر اکھاڑے تقریباً ختم ہو چکے۔ صادق پہلوان کا اکھاڑہ البتہ قائم تھا اور وہاں اچھے اچھے پہلوان پیدا ہوئے۔ ان کے ابتدائی دور کے شاگردوں میں زوّار پہلوان اور آغا پہلوان کافی مشہور ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں جب لکھنؤ میں ایک مشہور نمائش ہوئی تھی تو اس میں دنیا کے کچھ مشہور پہلوان بھی آئے تھے جن میں کریمر اور آرنالڈ کاسس بھی شامل تھے۔ آرنالڈ کاسس سے آغا پہلوان کا مقابلہ ہوا تھا

جس میں آخرالذکر کو شکست ہوئی تھی۔ کریمر نے ہندوستان میں بہت سی کشتیاں لڑی تھیں لیکن آخر میں جہاں تک یادداشت کام کرتی ہے وہ امام بخش یا گاما پہلون سے ہارا تھا۔ صادق پہلوان کے بعد کے شاگردوں میں سنارا پہلوان، للّے پہلوان اور پیر غلام اچھے کشتی لڑنے والے تھے۔ سنارا پہلوان میں بڑے پہلوان بننے کے آثار تھے لیکن استاد کے منع کرنے کے باوجود قبل از وقت ہی وہ کانپور کے بابو پہلوان سے مقابلہ کر بیٹھا اور ہار گیا۔ اس کے بعد سنارا کا زوال ہو گیا۔ صادق پہلوان کے انتقال کے بعد سنارا پہلوان ہی ان کے جانشین ہوئے۔ میرے دوست علی مہدی بلرامپوری اور ان کے ساتھی کار کی اپنی کرسچین کالج کی تعلیم کے زمانے میں صادق پہلوان ہی کے اکھاڑے میں زور کرنے جایا کرتے تھے۔ مجھے بھی اکثر اس اکھاڑے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ صادق پہلوان میں ایک بڑے پہلوان کی تمام خوبیاں تھیں۔ زبردست طاقت کا مالک ہونے کے باوجود انھوں نے طاقت کا غلط استعمال کبھی نہیں کیا۔ انتہائی بردبار اور حلیم الطبع انسان تھے۔ پہلوانوں کی سرپرستی آسان کام نہیں ہوتا۔ لیکن لکھنؤ میں ایسے سرپرست موجود تھے۔ میری جوانی کے زمانے میں بابا ہزارہ کے جانشین ست گر ایک ایسے ہی سرپرست تھے (بابا ہزارہ کوئی سادھو تھے جن کے لیے آصف الدولہ نے بہت بڑی جائیداد وقف کر دی تھی۔ ان کی جانشینی کے لیے ابتداً تجرد شرط تھی۔ لکھنؤ میں بابا ہزارہ کا باغ ان کے جانشینوں کا مرکز تھا) میری جوانی کے زمانے میں لکھنؤ میں کانپور کے بابو پہلوان اور اسی شہر کے ادھا پہلوان کے درمیان آخری بڑی کشتی لڑی گئی جس میں عمر میں بڑے اور تن و توش میں کم اڈھا پہلوان کامیاب رہے۔ اڈھا پہلوان زور کرنے کے لیے گاما پہلوان کے اکھاڑہ پٹیالہ چلے گئے تھے اور بابو پہلوان کے زور کرانے کے لیے ست گر نے ہندوستان کے کچھ بزرگ ترین پہلوانوں کو لکھنؤ بلایا تھا جس میں غوثا پہلوان بھی تھے جو گاما پہلوان سے مقابلہ کرنے کے خواہشمند تھے۔ اس

زمانے میں مجھے غوثا کے علاوہ کچھ اور دوسرے بڑے پہلوانوں سے ملنے کے مواقع ملے۔

لکھنؤ میں اکھاڑے ختم ہو گئے لیکن ان کی جگہ Body building clubs نے لے لی۔ ورزش اور جسم سازی کا شوق اہلِ لکھنؤ کا پرانا شوق ہے۔ میری نسل سے پہلے ترقی فیض آبادی کے اخلاف میں سے آغا ابو صاحب جو اپنے عہد کے شہر کے مشہور رئیس تھے اور جن کا کتاب خانہ آج تک سلطان المدارس میں محفوظ ہے، کے چھوٹے صاحبزادے چھوٹے آغا صاحب اپنے زمانے کے لکھنؤ کے طاقتور ترین اشخاص میں شمار ہوتے تھے۔ موصوف کے تمام صاحبزادے راقم الحروف کے ساتھی تھے اور ان کے توسط سے مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ ان کے مگدر جو میں نے دیکھے، ان کا ہلانا بڑے بڑوں کے بس کی بات نہ تھی۔ مگدر کے علاوہ ڈرہ اور بیٹھکین جسم سازی کے دوسرے ذرائع تھے۔ جدید زورخانوں (Gymnasiums) میں ورزش کے جدید طریقوں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد مجھے جسم سازی کا شوق ہوا تو میں نے ماڈل ہاؤس کے قریب مسلم کلب جوائن کر لیا جسے میرے ہم نام وؔلی صاحب چلاتے تھے۔ موصوف خود ایک بہترین جسم کے مالک تھے اور وہ پہلے شخص تھے جن سے مجھے اس شوق میں استنشاق (Inspiration) ملا۔ وہ مکان جس میں مسلم کلب تھا اب میرے ایک سابق شاگرد اطہر نبی صاحب، جو اردو دنیا میں کافی شہرت یافتہ ہیں، کا مسکن ہے۔ اطہر نبی صاحب غالباً وؔلی صاحب کے بھتیجے ہیں لیکن ان کے برعکس منحنی اور ضعیف الجثہ ہیں۔ آفاق صاحب کے جمنیزیم کا ذکر کر چکا ہوں۔ میرے عزیز دوست صادق حسین زیدی جن کا ایسا خوبصورت جسم کم ہی دیکھنے میں ملتا ہے اسی زورخانے سے ابھرے۔ میری طالب علمی کے زمانے کے مجھ سے جونیر ایک صاحبزادے جو عمر میں مجھ سے بڑے تھے اور جن کا نام ظہیر تھا وہ بھی اسی جمنیزیم میں ریاض کرتے تھے لیکن بعد کو ان کی بے راہ روی آفاق صاحب کی سخت

تکلیف کا باعث ہوئی اور انھوں نے اپنا جمنیزیم بند کر دیا۔ میرے بچپن کے ایک کلاس فیلو امیکا پرساد مصرا کے بھتیجے گار کی مصرا ایک اچھے جسم ساز تھے اور اپنا جمنیزیم کھولے ہوئے تھے۔ ایسے ہی بہت سے پرائیوٹ جمنیزیم شہر میں موجود تھے جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر لکھنؤ یونیورسٹی کا سر مہاراج سنگھ جمنیزیم ہے۔

فن شناوری ایک پرانا فن ہے اور اہلِ لکھنؤ کو اس کا ہمیشہ شوق رہا۔ میرے زمانے میں اس کے کئی استاد تھے۔ شاہی زمانے کے ایک شکستہ راج گھاٹ پر استاد اکبر حسین صاحب پیراکی کے استاد تھے لیکن وہ میرے ہوش سنبھالنے کے پہلے کی بات ہے۔ میرے عنفوان شباب میں ان کے جانشین شیعہ کالج کے استاد اکبر علی صاحب اور ان کے ساتھی ماسٹر سجاد صاحب اس گھاٹ کو چلاتے تھے۔ اس گھاٹ پر تمامتر شرفاء کے بچے آتے تھے۔ راج گھاٹ کے قریب ہی دریا کے بہاؤ کی طرف لوہے والے پل کی بغل میں گھاٹ پر چندی استاد پیراکی سکھاتے تھے جن کے شاگردوں میں میرے دوست اور پیراکی کے حریف رام کشن اوستھی تھے۔ راج گھاٹ کے چڑھاؤ کی جانب شکلا گھاٹ کے متصل خود راقم الحروف کے استاد سید کاظم حسین صاحب جو عرف عام میں ''سید صاحب'' کہلاتے تھے پیراکی سکھاتے تھے۔ یہاں اپنے استاد کی تعریف مقصود نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ میں نے مہین پیراکیوں میں ان سے بہتر پیراک نہیں دیکھا۔ پٹ (پانی پر اوندھے منہ لیٹنا) پیراکی میں ان کا جسم اتنا زیادہ پانی پر ابھرآتا کہ ان کی آنکھیں پانی کے باہر آجاتی تھیں۔ یہ بات میں نے کسی دوسرے پیراک میں نہیں دیکھی۔ وہ بے انتہا دبلے پتلے تھے اور گھاٹ پر آکر پانی سے ملحق دیوار پر بیٹھ جاتے تھے اور پانی کے اندر ہر شاگرد پر نظر رکھتے تھے۔ اگر کسی کو گھبرایا ہوا دیکھتے تھے تو بیٹھے ہی بیٹھے پانی میں چھلانگ لگا کر ایک غوطہ ہی میں بیچ دریا میں اس کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ سیدھے سادھے انسان تھے۔ تعلّی

سے نفرت تھی۔ جل بانگ انھیں نہیں آتی تھی۔ اس کا دعویٰ انھوں نے کبھی نہیں کیا۔ میں نے جب اسے سیکھنے کی خواہش کی تو مجھے اسے سیکھنے کے لیے اپنے ایک پیر بھائی کے حوالہ کر دیا۔ گومتی کے چڑھاؤ کے اوراوپر کلیا گھاٹ (جواب خوبصورت تفریح گاہ بن گیا ہے) نہانے اور پیرنے والوں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اسی کے مغرب میں ایک نوجوان سید حسین صاحب پیراکی سکھاتے تھے۔ یہ شوق انھیں اپنے نانا سے ورثہ میں ملا تھا، جو اپنے عہد کے بہت مشہور پیراک تھے۔ میرے استاد نے اپنی زندگی ہی میں گھاٹ میرے سپرد کر دیا تھا، لیکن اپنی تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے استادی کے اہم فریضہ کو جس میں کچھ بھی حالات ہوں گھاٹ پر پہنچنا لازمی ہوتا ہے، میں انجام نہ دے سکا اور گھاٹ پر حاضری کا اہم فریضہ میں نے اپنے استاد کے ایک جونیر شاگرد کے حوالے کر دیا۔ میرے بیٹے سلیم انوارالحق کے جب پیراکی سیکھنے کی عمر ہوئی تو اپنے پاس وقت نہ ہونے کی وجہ سے میں نے انھیں کلیا گھاٹ کے انھیں نوجوان انسٹرکٹر سید حسین صاحب کے حوالے کر دیا۔ بعد کو وہی میرے تمام بھتیجوں کے بھی استاد بنے۔ میرے استاد کا مدتوں پہلے انتقال ہو گیا لیکن میرے بیٹے کے استاد خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں اور اب بھی گئو گھاٹ کے قریب پیراکی سکھاتے ہیں۔ اسپورٹس اسٹیڈیم بننے کے بعد اس میں معیاری سائز کا سوئمنگ پول بھی بن گیا اور وہاں میرے ایک شناسا حیدر صاحب بطور انسٹرکٹر کام کرتے ہیں۔ گومتی کے علاوہ ٹکیت رائے کے تالاب میں بھی ایک صاحب پیراکی سکھاتے تھے لیکن اب تالاب کے خشک ہو جانے کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ حسین آباد کے تالاب میں ایک سالانہ جلسہ ہوا کرتا ہے جس میں پیراک مہیں پیرائیوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ (مہین پیرائیوں سے تیرنے (Floating) کے مختلف انداز مثلاً چت، پٹ، کروٹ، گٹھری، ڈیوٹ، سادھو آسن وغیرہ مراد ہوتے ہیں جن میں محض سانس کے کنٹرول سے بے جان چیز کی طرح پانی پر اسی طرح لیٹا جاتا

ہے جیسے خشکی پر)

جدید پیراکی کے مقابلے میں لکھنؤ آج بھی بہت پیچھے ہے۔ آج Competitive Swimming کے خاص Items جدید ملاحی (Breast Stroke)، چت (Back Stroke) اور Free Style ہیں اس کے برخلاف ہندوستانی مقابلوں میں کھڑی اور مہین پیرائیوں میں مقابلہ ہوتا تھا۔ جدید پیرائیوں میں Breast Stroke ملاحی ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ موجودہ Back Stroke البتہ ہندوستانی چت پیراکی سے اس معنی میں مختلف ہے کہ اس میں Crawl کے انداز میں پیر چلائے جاتے ہیں جبکہ ہندوستانی چت پیراکی میں چت رہ کر ملاحی کی طرح Frog Kick سے کام لیا جاتا ہے۔ Free Style میں پیراک کوئی بھی پیراکی اختیار کر سکتا ہے لیکن کیونکہ Crawl سب سے تیز انداز ہوتا ہے اس لیے اسی کو اختیار کیا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں ۱۹۴۳ء تک ان جدید پیرائیوں سے کوئی واقف ہی نہ تھا۔ ۱۹۴۳ء میں جب لکھنؤ یونیورسٹی کی پیراکی کی ٹیم جس میں راقم الحروف، کرناشنکر پانڈے اور رام کشن اوستھی شامل تھے۔ Inter 'Versity Swimming میں حصہ لینے کے لیے ممبئی بھیجی گئی تب ہمیں پتا چلا کہ ایسے مقابلوں کے لیے ہمارے دیسی پیرائیاں بیکار ہیں اور American Crawl سیکھے بغیر ایسے مقابلوں میں حصہ لینا ہی بیکار ہے۔ چنانچہ لکھنؤ آنے کے بعد ہم نے یہاں American Crawl کو رائج کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی سکھانے والا ہی نہ تھا۔ مجبوراً کتابوں کی مدد لینا پڑی۔ جانی ویسمولر کی American Crawl اس وقت بازار میں تازہ تازہ آئی تھی۔ کروناشنکر پانڈے تو لکھنؤ چھوڑ چکے تھے۔ میں نے اور رام کشن اوستھی نے کرال (Crawl) سیکھنا شروع کیا اور کچھ عرصہ کے بعد جب ہم دونوں نے Lucknow Aquatic Association بنائی تو پیراکی کے اس جدید American Crawl کو رائج کیا جس میں

Frog Kick کے بجائے Flutter Kick کو استعمال کیا جاتا ہے۔

پنجہ کشی ، بانک (چھری کی لڑائی)، بنوٹ (خالی ہاتھ دشمن کا مقابلہ کرنا) اور لکڑی دوسرے فنون سپہ گری تھے جن کا بیسویں صدی کی ابتدا تک وجود باقی تھا۔ میرے زمانہ میں کالے خاں اور نوابو صاحب پنجہ کشی کے استاد تھے۔ آخرالذکر سے میں نے بھی اکتسابِ فن کیا۔ لکڑی کے استادوں میں نواب ابوّ صاحب بھی تھے بیچارے مفلوک الحال تھے شاگرد بنانا محض اپنی اقتصادی حالت کو درست کرنے کے لیے تھا۔ میں نے بھی ان سے کچھ سیکھنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ بانک بنوٹ کے استاد مبارک حسین صاحب میرے اچھے شناسا تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے وہ خوش نویس تھے اور میری ان کی ملاقات شہر کے مشہور خطّاط اور نظامی پریس کے مالک مرزا محمد جواد صاحب کے یہاں ہوئی تھی۔ باوجود اچھے تعلقات کے میں ان سے ان کے فن کے بارے میں کچھ نہ سیکھ سکا۔ لکڑی چلانا میں نے جتنا بھی سیکھا وہ شیعہ کالج کے ڈرل ماسٹر صاحب سے سیکھا جن کا نام ذہن میں نہیں ہے۔

چھٹا باب

میرے عہد کے اہم فلاحی اور تعلیمی ادارے

تعلیم کا رواج ولی عام کیجئے
جس سے جلا ہو ذہن کی وہ کام کیجئے

لکھنؤ کے فلاحی اور تعلیمی اداروں کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی تعداد موجودہ لکھنؤ میں بھی بہت کافی ہے اور خوشی کی بات ہے کہ مختلف فرقہ پرست جماعتوں کی کوشش کے باوجود ان کے برادران وطن کے ساتھ ہمیشہ اچھے تعلقات رہے حتی کہ تقسیم ہند کے بعد جب پورے شمالی ہندوستان میں نفرت کی فضا پیدا ہو چکی تھی اور ہر طرف فرقہ وارانہ فسادوں کی آگ لگی ہوئی تھی، یہ شہر اس لعنت سے پاک رہا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں بدستور خوشگوار تعلقات بنے رہے۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ پاکستان سے برباد شدہ جو لوگ اس شہر میں آئے وہ بھی اس بھائی چارے کی فضا کے عادی ہو گئے۔ ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت کے وقت کچھ تناؤ ضرور پیدا ہوا لیکن وہ صرف نعرہ بازی تک محدود رہا اور ہم اہلِ لکھنؤ فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پوری تاریخ میں اس شہر میں آج تک کبھی کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ذکر فلاحی اور تعلیمی اداروں کا تھا اور بیان ہونے لگا ہندو مسلم تعلقات کا۔ مسلم

فلاحی اداروں میں سب اہم انجمن اصلاح المسلمین ہے جس کی بنیاد چند ہمدردان ملّت حضرات نے آج سے سو سال پہلے ۱۹۰۸ء میں ڈالی اور اس کے تحت ۲۵/نومبر ۱۹۱۱ء میں قائم ہونے والا پہلا ادارہ مسلم یتیم خانہ تھا۔ ابتدا میں یتیم بچوں ہی کے لیے یتیم خانے کے ساتھ ایک اسکول بھی کھول دیا گیا۔ بعد میں جولائی ۱۹۴۹ء میں وہ ہائی اسکول ہو گیا اور باہر کے طلباء کے لیے بھی اس کے دروازے کھل گئے۔ میں اسے ۱۹۷۰ء میں اسے انٹرمیڈیٹ کا مرتبہ ملا اور ۱۴/اگست ۱۹۷۴ء کو وہ ڈگری کالج بن گیا اور ستمبر ۲۰۰۳ء میں آرٹس اور سائنس کے مضامین کے ساتھ اسے پوسٹ گریجویٹ کالج بنا دیا گیا۔ ۱۹۹۹ء میں یتیم بچیوں کے لیے ایک بیت نسواں بھی کھل چکا ہے جس میں یتیم بچیوں کے رہنے کے علاوہ ان کی شادیوں کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ میں انجمن سے استعفیٰ دینے کے وقت یہ تجویز بھی رکھ دی تھی کہ بے سہارا بوڑھوں کے لیے بھی انجمن کی طرف سے قیام کا انتظام کر دیا جائے، لیکن کچھ اسباب کی بنا پر اس پر اب تک عمل درآمد نہ ہو سکا۔ یتیم خانے اور تعلیمی اداروں کے علاوہ یہ انجمن شہر کے مختلف قبرستانوں اور بعض مسجدوں کی دیکھ بھال کی بھی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہے۔ میں اس میں یتیم بچیوں کی رہائش اور دیکھ بھال کا بھی انتظام ہو گیا اور اب تک اس بچیوں کے یتیم خانے کی کئی لڑکیوں کی شادی بھی انجمن کی طرف سے ہو چکی ہے۔ ڈگری کالج جو ممتاز پوسٹ گریجویٹ کالج کے نام سے موسوم ہے، کی نئی شاندار عمارت بن چکی ہے اور انجمن نے بڑھتے ہوئے اخراجات کے پیشِ نظر اس کی آمدنی بڑھانے کے لیے شہر کے سب سے بڑے تجارتی مرکز امین آباد میں ایک بڑے بازار کی تعمیر ہو چکی ہے۔ راقم الحروف کا انجمن اصلاح المسلمین اور اس کے تحتی اداروں سے گہرا تعلق رہا ہے اور مدّت تک اس کا صدر رہنے کے بعد ۲۰۰۱ء میں جب میں نے اپنے خیال میں ہمیشہ کے لیے لکھنؤ چھوڑ دیا تھا تو اس ادارے کی صدارت سے بھی استعفیٰ دے دیا تھا اور اس کے بعد اس کی

صدارت کی ذمہ داری میرے ہی ایک سابق شاگرد خواجہ محمد رائق ایڈوکیٹ نے سنبھال لی ہے اور ایک دوسرے شاگرد عزیز ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ میری صدارت کے زمانے سے ہی انجمن کے جنرل سکریٹری ہیں۔ لکھنؤ واپس آنے کے بعد مجھے مجلس انتظامیہ کا اعزازی رکن بنا دیا گیا اور اس طرح اس انجمن سے میرا تعلق اب بھی برقرار ہے۔ اس شہر میں شیعہ حضرات کے سب سے بڑے ثقافتی، فلاحی اور سیاسی ادارے شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کی بنیاد پڑی تھی۔ اس ادارے کے تحت سرفراز اخبار نکالا گیا اور اس کا پریس قائم ہوا۔ شیعہ یتیم خانہ بھی قائم ہوا جس میں کافی یتیم بچوں کی پرورش ہوتی ہے۔ شیعہ بچوں کی خصوصی تعلیم کے لیے شیعہ کالج قائم ہوا جس میں سائنس، آرٹس اور کامرس کے ڈگری کلاسز بھی بعد میں کھل گئے اور چند سال پہلے اس میں پوسٹ گریجویٹ درجات بھی کھل چکے ہیں۔ کالج کی اپنی دو عمارتیں ہیں ایک سیتاپور روڈ پر اور دوسری تلسی داس مارگ پر۔ اصلاح المسلمین اور شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے علاوہ اور بہت سی انجمنیں بھی فلاحی کاموں میں مشغول ہیں ۔ میرے دوست مرحوم سید اطہر حسین آئی ۔اے۔ ایس اور کچھ دوسرے دردمند حضرات کی کوششوں سے چارباغ اسٹیشن کے قریب ایک مسلم مسافر خانہ کھل چکا ہے۔ ایک دوسرا مسافر خانہ شہر کے ایک رئیس نے امین آباد میں بھی کھول دیا ہے۔ مسافروں کے قیام کے لیے شہر میں بہت سے دھرم شالے بھی موجود ہیں۔ رؤسا نے شہر میں خواہ وہ مسلمان ہوں یا اہل ہنود، بیسویں صدی میں بہت سے تعلیمی ادارے کھولے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں قائم ہونے والا اسلامیہ مدرسہ مہاراجہ محمود آباد کی کوششوں سے امیر الدولہ اسکول کی شکل اختیار کر گیا اور ۱۸۹۴ء میں اسے اسلامیہ اسکول بنا دیا گیا۔ بعد میں ۱۹۱۶ء میں ہائی اور ۱۹۴۲ء میں وہ انٹر میڈیٹ کالج بن گیا۔ ۱۹۹۱ء میں اس کالج کو ڈگری کالج کا مرتبہ مل گیا، جس میں بی کام کی پڑھائی ہونے لگی اور ۱۹۹۴ء میں اس میں بی ایس سی کے کلاسز بھی کھل گئے ۔

گردھاری سنگھ ہائی اسکول جواب انٹر کالج ہے، ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے۔کالی چرن اسکول بھی ایک بہت قدیم تعلیمی ادارہ ہے جواب ڈگری کالج ہے۔شہر کے ایک رئیس کھن کھن جی تھے۔ان کے اخلاف نے ان کے نام پر نسواں کھن کھن جی ڈگری کالج کھولا ہے۔ حسین آباد ٹرسٹ کی جانب سے تعمیر کردہ عمارت میں حسین آباد گورنمنٹ اسکول قائم ہوا تھا جواب انٹر کالج ہے۔ دوسرا سرکاری تعلیمی ادارہ گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج ہے جس سے منشی نول کشور کا گہرا تعلق تھا اور تیسرا ایسا ہی ادارہ نارمل گرلس اسکول ہے۔لکھنؤ کرسچین کالج بھی ایک پرانا نیک نام کالج ہے جس کی ایک شاخ ایک دوسرا ادارہ سینٹینل اسکول ہے۔ ودیانت ڈگری کالج سناتن دھرم کے ماننے والوں کا اور ڈی۔ اے۔ وی ڈگری کالج آریہ سماجی حضرات کا تعلیمی ادارہ ہے۔ کانکج ڈگری کالج اور کانکج ووکیشنل ڈگری کالج برہمن حضرات کے ادارے ہیں ۔کرمی پاٹ شالہ کرمیوں کا قائم کردہ ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔انگلش میڈیم اداروں میں لامانٹینیر کالج سب سے قدیم ہے اس کے بعد سینٹ فرانسس کالج ہے۔ دونوں ادارے لڑکوں کے لیے بہترین ادارے سمجھے جاتے ہیں۔لڑکیوں کے لیے سینٹ ایگنس اسکول اور لاریٹو کانونٹ اور لامانٹینیر گرلس اسکول سب سے بہترین انگلش میڈیم ادارے ہیں۔ دوسرے کرشچین تعلیمی اداروں میں آئی ٹی کالج اور لال باغ گرلس کالج بھی نیک نام ادارے ہیں۔ شکلا اسکول اور کشمیری محلّہ گرلس اسکول بھی شہر کے قدیم تعلیمی ادارے ہیں اور یہی حال امین آباد اسکول کا ہے۔لکھنؤ یونیورسٹی شہر کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے جس کی ابتدائی شکل کینگ کالج تھی۔لکھنؤ یونیورسٹی میں اب آرٹس اسکول بھی ضم ہوکر ایک فیکلٹی بن گیا ہے۔یونیورسٹی کے تحت کچھ عرصہ پہلے تک کنگ جارج میڈیکل کالج بھی تھا۔لیکن اب یہ کالج ایک الگ میڈیکل یونیورسٹی کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اس کا ایک ذیلی شعبہ بھی ایک ڈنٹل یونیورسٹی بن گیا ہے۔اعلیٰ تعلیم کا ایک اور

ادارہ بھات کھنڈے میوزک یونیورسٹی ہے جس میں فن موسیقی کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔ مذکورہ تمام ادارے آزادی ہند سے پہلے وجود میں آچکے تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد آبادی میں اضافے کے ساتھ اداروں کی تعداد بے پناہ بڑھی ہے اور ان کے قائم کرنے والوں کا مقصد تعلیم کی خدمت سے زیادہ پیسہ کمانا ہے۔ تعلیم اب ایک تجارت بن چکی ہے۔ نام نہاد انگلش میڈیم اسکولوں کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ پھر بھی اس عہد میں کچھ اچھے ادارے قائم ہوئے۔ انھیں میں مہانگر بوائز اسکول ایک نیک نام ادارہ ہے۔ میرے یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران کے ایک طالب علم جگدیش اگروال (جو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اپنی وضع قطع کی وجہ سے جگدیش گاندھی مشہور ہو گئے تھے) نے سٹی مانٹیسری اسکولوں کا ایک جال شہر بھر میں بچھا دیا ہے جس میں ایک ڈگری کالج بھی شامل ہے۔ اس طرح خود میرے ایک شاگرد خواجہ یونس نے بھی، ارم اسکولوں کا جال شہر بھر میں بچھا دیا ہے جس میں ارم ڈگری کالج بھی ہے جس کی دو شاخیں ہیں، ایک مہانگر میں اور دوسری جھوائی ٹولے میں۔ ان اداروں کے علاوہ کچھ ٹیکنیکل ادارے بھی کھلے ہیں۔ ایک پرائیوٹ ڈنٹل کالج بھی کام کر رہا ہے۔ ارا نام کا ایک پرائیوٹ میڈیکل کالج بھی کھل چکا ہے۔ ایک ٹیکنیکل کالج بھی کھلا ہے جس کے علاوہ ہیوٹ انجینئرنگ کالج ایک پرانا ادارہ ہے۔ دہلی پبلک اسکول کی بھی تین شاخیں کھلی ہوئی ہیں۔ پرائیوٹ کوچنگ اسکول کھول کر بھی تعلیم کا بیوپار ہو رہا ہے۔

متذکرہ بالا جدید تعلیم کے مراکز کے علاوہ کچھ بہت ہی مشہور دینی ادارے بھی شہر کی زینت ہیں۔ فرنگی محل کا ۱۹۰۵ء میں قائم شدہ مدرسۂ نظامیہ ختم ہو گیا لیکن اس کی جگہ ایک نیا مدرسۂ نظامیہ تشکیل پا چکا ہے۔ فرنگی محل کی اہمیت اب ندوۃ العلماء نے لے لی اور مولانا علی میاں مرحوم کی کوششوں اور اثرات کے تحت وہ ایک عالمگیر شہرت کا ادارہ بن چکا ہے جس میں بیرون ہند مثلاً

انڈونیشیا، ملیشیا وغیرہ کے بھی بہت سے طالب علم تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مدرسہ فرقانیہ جسے مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کے شاگرد رشید مولانا عین القضات صاحب نے قائم کیا تھا علوم قرآنی اور قرأت کا ایک اہم مدرسہ ہے جسے مولانا کے بعد کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر چلاتے رہے۔ وہ کارخانہ ختم ہو چکا لیکن کچھ اساتذہ انتہائی کم تنخواہ پر اس ادارہ کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ علم تجوید ہی کی تعلیم کے لیے ایک جدید مدرسہ مدرسہ عرفانیہ بھی قائم ہے جسے پرتاپ گڑھ کی بزرگ ہستی مولانا محمد احمد کے صاحبزادے قاری مشتاق احمد چلا رہے ہیں۔ چند سال قبل بریلوی مسلک کے لوگوں نے ایک بڑا دینی مدرسہ شہر کی ایک جدید کالونی گومتی نگر میں قائم کیا ہے۔ مذکورہ مدارس کے علاوہ مدرسہ ناظمیہ اور سلطان المدارس فقۂ جعفری کے مدارس ہیں اور ان میں ہنوز منقولات کے ساتھ معقولات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اہلِ ہنود کے دینی پاٹ شالے بھی شہر میں موجود ہیں۔

لکھنؤ کا ذکر نامکمل رہے گا اگر یہاں کی کچھ عمارتوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ ان میں سب سے اہم آصف الدولہ کا امام باڑہ اور اس کا رومی دروازہ ہیں۔ قدیم طرز کی یہ عمارت اپنی وسیع ڈاٹ کی چھت کی وجہ سے جس میں لوہے کا قطعاً استعمال نہیں ہوا ہے دنیا بھر میں مشہور ہے اور بیرونی سیاح صرف اس عمارت کو دیکھنے کے لیے لکھنؤ آتے ہیں۔ اس بڑی چھت کو سنبھالنے کے لیے دوہری دیواریں بنائی گئی تھیں جن کے بیچ میں راستے بن گئے تھے وہ عمارت کی بنیادوں سے لے کر چھت تک ہیں۔ یہی پیچیدہ راستے شہرہ آفاق بھول بھلیاں کہلاتے ہیں۔ ان میں اگر کوئی شخص زمین کے نیچے کے حصّہ میں چلا جاتا تھا تو اس کا نکلنا تقریباً ناممکن تھا۔ عہد شاہی کی دوسری عمارتوں میں حسین آباد کا امام باڑہ، شاہ نجف، قیصر باغ کی بچی کھچی عمارتیں، چھتر منزل، سعادت علی خان کا مقبرہ اور لا مارٹینیر کالج کی عمارت ہے۔ فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے سوائے چھتر منزل کے کوئی اہم نہیں ہے۔ چھتر منزل میں اب سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔

انگریزی عہد کی عمارتوں میں سول سکریٹریٹ اور چار باغ اسٹیشن کی عمارتیں قابلِ دید ہیں۔

۱۹۴۶ء میں لکھنؤ کی آبادی ڈھائی لاکھ تھی اور اب پینتیس لاکھ کے قریب ہے لیکن شہر کے اہم بازار اب بھی چوک، امین آباد اور حضرت گنج ہیں۔ چوک پہلے سونے چاندی کے زیورات کا مرکز تھا لیکن مرار جی دیسائی کی وزارت کے بعد سے صرافوں نے اپنا پیشہ بدل دیا ہے اور اب یہ بازار چکن کا سب سے بڑا بازار بن گیا ہے۔

ساتواں باب

لکھنؤ اور سیاستِ ہند

ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

بیسویں صدی کا نصف اوّل لکھنؤ میں سیاسی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ کانگریس کی تحریک کے اثرات لکھنؤ میں بھی نمایاں تھے۔ ادیبوں میں چکبست، بشن نرائن در وغیرہ ہوم رول کے گیت گا رہے تھے اور اودھ پنچ کے طنز نگار اپنے انداز میں دل کھول کر برٹش سرکار پر نکتہ چینی کر رہے تھے۔ انھیں حالات میں ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ میں لکھنؤ پیکٹ ہوا جس نے ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد کو مستحکم کر دیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر جب خلافت تحریک لکھنؤ میں شروع ہوئی اور گاندھی جی نے اس میں عملی حصّہ لیا تو اس اتحاد کی بنیاد اور مضبوط ہوگئی جو انگریز حکومت کے لیے ایک خطرے کی علامت تھی۔ بیرونی حکومت سے نجات پانے کے لیے لکھنؤ کے عوام بھی متحد ہو گئے اور کیونکہ خلافت تحریک لکھنؤ سے شروع ہوئی تھی اس لیے اس مشترکہ جدو جہد کا سہرا بھی لکھنؤ کے سر بندھتا ہے۔ سینٹرل اسمبلی اور ڈومنین طرز پر عوامی حکومت بنانے کے مطالبے پر غور کرنے لیے ۱۹۲۸ء کے موسم خزاں میں سائمن کمیشن کا ہندوستان میں ورود ہوا اور

اس کی پہلی میٹنگ پونے میں ہوئی۔ لیکن اندازہ ہوا کہ ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے یہ کوئی سنجیدہ قدم نہ تھا۔ سائمن کمیشن کے رویہ کے خلاف ملک بھر میں احتجاج ہوئے۔ چنانچہ لکھنؤ میں بھی پتنگوں کو "Simon go back" لکھ کر اڑایا جاتا تھا۔ سائمن کمیشن کی ناکامی پر ۱۹۳۰ء میں تحریک ترک موالات (Non-Cooperation Movement) کا آغاز ہوا۔ اس تحریک میں بھی اہلِ لکھنؤ نے دل کھول کر حصّہ لیا۔ میرا مکان جس گلی میں تھا اس کے باہر ہی بزازہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کانگریسی والنٹیر کانگریس کا جھنڈا لیے ہوئے سڑک پر جو اس زمانے میں وکٹوریہ اسٹریٹ کہلاتی تھی اور اب تلسی داس مارگ ہے، گشت کیا کرتے تھے۔ اس اپیل کے ساتھ: ''ولایتی کپڑا بیچنا کرپا کر کے بند کرو''۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ولایتی چیزوں کا نہ صرف بائیکاٹ ہو رہا تھا بلکہ ان سے نفرت کے اظہار کے طور پر انھیں جلایا بھی جا رہا تھا۔ اسی زمانے کی بات ہے کہ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والے کوئی صاحب سگار پی رہے تھے، جب اس پر اعتراض کیا گیا تو انھوں نے نہایت معصومیت کے ساتھ برجستہ جواب دیا کہ ''میں اسے جلا رہا ہوں''۔

تحریک ترک موالات کو چورا چوری کے المناک واقعہ کے بعد گاندھی جی نے واپس لے لیا۔ ۵؍ مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی۔ اِرون معاہدہ ہوا۔ اور آخر کار برٹش پارلیمنٹ سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پاس ہوا جس کی رو سے سنٹرل اسمبلی کی تشکیل نو کے ساتھ مختلف صوبوں میں عوامی حکومتوں کو بھی وجود میں آنا تھا۔ یہ وہ عہد تھا جب مسلم لیگ ایک بے جان رئیسوں کی جماعت سے زیادہ نہ تھی۔ کانگریس، برٹش حکومت اور مسلمانوں سے ناراض ہو کر جناح صاحب مستقل طور سے انگلینڈ چلے گئے تھے۔ ۱۹۳۵ء کے آئین کے مطابق الکشن کی مہم کی سربراہی کے لیے لیاقت علی خان نے جناح صاحب کو انگلینڈ سے واپس آنے کے لیے

راضی کرلیا۔ ۱۹۳۷ء میں الکشن کے سلسلے میں لیگ اور کانگریس میں مفاہمت کی گفتگو ہوئی اور
یوپی میں پنڈت پنت نے خلیق الزماں کو دو وزارتوں کی پیش کش کی لیکن نتیجہ میں انھیں پنڈت
نہرو کی ناراضگی برداشت کرنا پڑی۔ اور یہی حال کچھ خلیق الزماں کا بھی ہوا۔ وہ بھی جناح
صاحب کے عتاب کا شکار ہوئے۔ جب لیگ اور کانگریس میں مسلمانوں کی اسمبلیوں میں
نمائندگی کے سلسلے میں گفتگو کامیاب نہ ہوئی تو پنڈت نہرو نے مسلم ماس کنٹیکٹ (Muslim
Mass Contact) شروع کیا لیکن اس میں انھیں ناکامی ہوئی اور اس کا نتیجہ صرف لیگ سے
مخالفت کی شکل میں ظاہر ہوا اور اکتوبر ۱۹۳۷ء میں جناح صاحب کا خطبۂ صدارت ایک لحاظ سے
کانگریس کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ ۱۹۳۷ء کے الکشن میں علاحدہ نمائندگی کے تحت یوپی اسمبلی
میں مسلمانوں کی بہت کافی سیٹیں مسلم لیگ کے قبضہ میں آ گئیں۔ لیگ سے مفاہمت نہ ہونے کی
شکل میں رفیع احمد قدوائی اور حافظ ابراہیم وزارت میں بحیثیت مسلمانوں کے نمائندے کے
شریک ہوئے۔ حافظ ابراہیم کی نمائندگی پر مسلم لیگ نے احتجاج کیا جس پر انھوں نے استعفیٰ
دے کر دوبارہ کانگریس کے ٹکٹ پر الکشن لڑا اور جیت کر منسٹری میں شامل ہوئے۔ کانگریس سے
مفاہمت نہ ہونے کی صورت میں مسلم لیگ نے کانگریس اور کانگریس حکومت کی مخالفت ہی کو اپنا
شعار بنالیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں کانگریس کے صدر سبھاش چندر بوس مقرر ہوئے لیکن گاندھی جی ان
کے خلاف تھے جس کی وجہ سے کانگریس اندرونی اختلاف کا شکار تھی۔ (اسی سال بوس بابو نے
لکھنؤ کا بھی دورہ کیا تھا۔ چوک سے ان کا جلوس نکل رہا تھا اور راقم الحروف کو پہلی اور آخری بار
ان کے دیدار کا موقع ملا تھا۔) اس کے برخلاف اسی سال لکھنؤ کے لیگ کے سشن کے موقع پر
سکندر حیات خاں نے مسلم لیگ میں شمولیت کرلی جس سے لیگ کو مزید تقویت حاصل ہوگئی۔
اسی عہد میں کچھ اور واقعات بھی ہوئے جن کی بنا پر لیگ کو کانگریس حکومتوں پر نکتہ چینی کا موقع

ملا۔ انھیں حالات میں یو پی میں قانون خاتمۂ زمینداری (Tenancy Act) پاس ہوا جس کا سیدھا اثر مسلمان زمینداروں پر پڑا لیکن بنگال میں جہاں زمینداریاں ہندوؤں کے پاس تھیں اور کسان مسلمان تھے، کانگریس نے اسی قسم کے قانون کی مخالفت کی۔ ان حالات میں لیگ کی طرف سے کانگریس حکومتوں کی کارکردگی پر غور کرنے کے لیے پیرپور کمیٹی تشکیل کی گئی جس کا تعلق بھی لکھنؤ سے تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی واردھا ودیا مندر اسکیم، گاؤ کشی، اردو ہندی کا مسئلہ، وندے ماترم کا گایا جانا، مسجدوں کے سامنے سنکھ کا پھوکا جانا، ان تمام شکایتوں کا احاطہ اس کمیٹی کی رپورٹ میں کیا گیا تھا۔

۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء میں وائسرائے نے ہندوستان کی دوسری جنگِ عظیم میں شرکت کا اعلان کیا لیکن کانگریس نے اسے منظور نہیں کیا اور ۱۴ر ستمبر کے رزولیوشن میں کانگریسی ورکنگ کمیٹی نے اعلان کیا کہ جنگ میں مدد دینے کا حق صرف ہندوستانیوں کو ہے۔ ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا کہ جنگ کے مقاصد بیان کیے جائیں۔ اس کے برخلاف مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے انگریزوں کی جنگی کوششوں میں مدد کرنے کا اعلان کیا۔ مناسب جواب نہ ملنے پر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۹ء کو کانگریس حکومتوں کو مستعفی ہو جانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ پٹنہ کی میٹنگ میں سول نافرمانی کے متعلق بھی غور کیا گیا۔ جناح صاحب نے کانگریس مخالفت کی پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے ۲۲ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو یوم نجات (Day of delivering Thanks Giving) منانے کا اعلان کیا۔ جہاں تک یو پی خصوصاً لکھنؤ کا تعلق تھا، کانگریس اور مسلم لیگ کی اس ہندوستان گیر کشمکش کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیکن ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ میں لیگ کے لاہور سیشن میں پاکستان رزولیوشن کے پاس ہونے کے بعد یو پی کی سیاسی فضا میں بھی ارتعاش پیدا ہوا۔ اس رزولیوشن کے مطابق شمال مشرقی اور شمالی مغربی ہندوستان میں جن علاقوں میں مسلم اکثریت تھی

انھیں گروپ کی شکل دی جانا تھی اوران میں شامل صوبوں کو اندرونی خودمختاری ملنا تھی اوران گروپوں کو ایک آزاد ریاست کی شکل اختیار کرنا تھی۔ ۶ر دسمبر ۱۹۴۱ء میں پرل ہاربر پر جاپان کے حملے نے اوراس کے بعد ۲۱ رفروری ۴۲ء پر رنگون پر اور ۸ر مارچ ۱۹۴۲ پر سنگاپور پر جاپانی قبضہ اور خود کلکتہ پر جاپانی بمباری نے انگریزوں کو ہندوستان کے دفاع کی طرف سنجیدگی سے متوجہ کیا اور یہاں کی سیاسی جماعتوں کو **Defence of India council** میں شامل کرنا چاہا جسے کانگریس اور لیگ دونوں نے نامنظور کردیا۔ ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو طے کرنے کے لیے ۱۹۴۲ء میں سرکرپس ہندوستان آئے اور اپنے ساتھ جو تجاویز لائے تھے ان میں دومینین اسٹیٹس جس میں برٹش کامن ولتھ میں شامل رہنے یا الگ ہونے کی آزادی کے ساتھ ساتھ جنگ کے خاتمے کے بعد صوبائی لیجس لیچر کے الکشن اور لوور ہاؤس کی منتخبہ مجلسِ دستور ساز کا وجود میں آنا شامل تھا۔ ساتھ ہی ساتھ صوبوں کو مرکز سے علاحدہ ہونے کی بھی گنجائش رکھی گئی تھی جو آگے چل کر پاکستان کی بنیاد بن گئی۔ کانگریس دو بازوؤں میں تقسیم ہوگئی۔ گاندھی جی تحریک ترکِ موالات **(Non-Cooperation Movement)** شروع کرنا چاہتے تھے لیکن راج گوپال آچاریہ اوران کے ساتھی اس قسم کے پاکستان کو قبول کر کے حکومت میں شامل ہونے کے حق میں تھے۔ بہرحال حکومت کی تجاویز کانگریس اور لیگ دونوں نے نامنظور کردیں اور ۱۳ر جولائی ۱۹۴۲ء کو کانگریس کمیٹی نے بھی **Quit India** رزولیوشن پاس کردیا جسے آل انڈیا کانگریس کمیٹی ورکنگ کمیٹی نے بھی ۸ر اگست ۱۹۴۲ء کو اپنی منظوری دے دی اور دوسرے ہی روز تمام کانگریسی لیڈر گرفتار کر لیے گئے لیکن لیڈروں کی موجودگی کے بغیر ہی پورے ملک میں بغاوت کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ یوپی بھی اس سے محفوظ نہ رہا لیکن خود لکھنؤ کی فضا ناسازگار نہ ہوئی۔ راجہ جی اور بھولا بھائی ڈیسائی کی کوششوں سے شملہ میں گاندھی، جناح ملاقات ہوئی اور

کانگریس اور لیگ کے لیڈروں میں بات چیت ہوتی رہی جس کے نتیجہ میں بھولا بھائی ڈیسائی اور لیاقت علی خاں معاہدہ ہوا لیکن بعد کو تمام گفتگو ناکام ثابت ہوئی۔

برٹش مفادات کو محفوظ رکھنے کے لیے ہندوستانی سیاسی پارٹیوں سے مفاہمت ضروری تھی چنانچہ اس مقصد سے ۱۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو **Cabinet Mission** ہندوستان آیا جس کا مقصد ہر حال میں ہندوستان کی گتھی کو اس طرح سلجھانا تھا کہ برٹش مفادات پر آنچ نہ آئے۔ ۱۹۴۶ء کی نیوی اور ایرفورس کی بغاوتوں نے انگریزوں پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ آئندہ بغاوت کی صورت میں فوج پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ **Cabinet Mission** کی تجاویز میں شمال و مغرب اور شمال و مشرق میں گروپوں کا بننا بھی شامل تھا اور مجلسِ آئین ساز کے وجود میں آنے کے پہلے عبوری حکومت **Interim Govt.** کا بننا بھی۔ لیکن ان تجاویز پر لیگ اور کانگریس میں کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکا۔ اور **Interim Govt.** کے بننے کے سلسلے میں جناح صاحب نے راست اقدام **(Direct Action)** کی دھمکی دے ڈالی جس پر بنگال میں عمل بھی ہوا اور کلکتہ میں ہزاروں لوگ مار ڈالے گئے۔ بہر حال **Quit India Movement** کی طرح اس تحریک کا بھی لکھنؤ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

اس نفرت انگیز فضا میں ۱۹۴۶ء کا الکشن لڑا گیا۔ لکھنؤ میں بھی ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' کے نعرے گونج رہے تھے۔ میل میل بھر لمبے مسلم لیگ کے جلوس نکل رہے تھے۔ سو سو فٹ اونچے لیگی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ جلسوں میں اشتعال انگیز تقریریں ہو رہی تھیں اور جلوسوں میں ''لٹیا راج نہیں ہوگا، دھتیا راج نہیں ہوگا۔ پھر کیا ہوگا؟ پاکستان'' کے ایسے دل آزار نعرے لگ رہے تھے۔ یہ نعرے لگانے والے بہادر تقسیم ہند کے بعد نو دو گیارہ ہو گئے یا راتی راتا چولا بدل کر کانگریسی ہو گئے۔ ایسے ہی میرے ایک کرم فرما جو مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے پر جوش لیڈر تھے

پکے کانگریسی بن کر چرن سنگھ وزارت میں شامل ہوئے۔ یہ کوئی تنہا واقعہ نہ تھا۔

۱۹۴۶ء کے الکشن نے ہی ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اس الکشن کے دوران مسلمانوں کے دوراندیش لیڈروں کو بری طرح ذلیل کیا گیا۔ جناح صاحب کی پیروی میں ہر مسلم لیگی کی زبان پر مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کے لیے **Quizling** کا لفظ تھا خواہ وہ اس کے معنی جانتے ہوں یا نہیں۔ الکشن کے ایک روز پہلے امرت بازار پتریکا میں مسلمانوں کو دو بڑے منافقوں (یعنی مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی) کو ووٹ دینے کی اپیل نظر آئی۔

Maulana Azad and Maulana Madani the two great Munafiqs

بے چارے امرت بازار پتریکا والے کیا جانیں کہ **"Munafiqs"** کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ تمام مسلم لیگی لیڈر بشمول خلیق الزماں، راجہ محمود آباد، جمال میاں فرنگی محلی، مسلمانوں کو بے سہارا چھوڑ کر چلتے بنے۔ پاکستان بننا مسلمانوں کے حق میں تھا یا نقصان دہ، یہ بحث کبھی نہ ختم ہوگی۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی ۱/۴ آبادی کے لیے ۱/۶ سے بھی کم علاقہ ملنا کوئی نفع کا سودا نہ تھا۔ اس وقت کی ہندوستان کی چالیس کروڑ آبادی میں دس کروڑ مسلمان تھے جن میں چار کروڑ جناح صاحب اور مسلم لیگ کی سیاست کا نتیجہ بھگتنے کے لیے ہندوستان میں رہ گئے۔ آج ان کی تعداد تقریباً سولہ کرور ہے لیکن محض ایک مجبور اقلیت، ان کی حیثیت ہے۔ میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ آج ہندوستان برصغیر میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً بیالیس کرور ہے۔ آج اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو کیا اتنی بڑی تعداد کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ تقسیم سے پہلے بنگال کی بڑھتی ہوئی آبادی آسام کے غیر آباد خطوں میں منتقل ہو رہی تھی اور اسی سبب آسام میں ان کی اتنی بڑی تعداد ہوگئی تھی کہ وہ وہاں حکومت بنا سکتے تھے۔ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو یہ سلسلہ جاری

رہتا اور آج نہ صرف موجودہ آسام بلکہ پورا نارتھ ایسٹ ایک مسلم اکثریت کا علاقہ ہوتا۔ آج تقسیم کے بعد جب آسام کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور پاکستان کی بھی تقسیم کے بعد مغربی پاکستان میں بھی بنگالیوں کا داخلہ بند ہو چکا ہے، تو میں یہ سوچتا ہوں کہ چھوٹے سے بنگلہ دیش کے رہنے والے تقریباً چودہ کرور کی تعداد جب مزید بڑھے گی تو وہ کہاں جائیں گے۔ کیا مالتھس (Malthus) کی تھوری آف پاپولیشن کے تحت Positive Checks کا شکار ہو کر ان کی قسمت میں مکمل تباہی ہے اور کیا بارہ کرور بنگالی مسلمانوں کی تباہی دنیائے اسلام کے لیے ایک سانحہ نہ ہوگا۔ کاش مسلم لیگی لیڈروں نے اور ان کے بعد مجیب الرحمٰن نے تصویر کا یہ رخ بھی دیکھا ہوتا۔

مذہب دنیا میں امن وسکون کے لیے ہوتا ہے لیکن عملی حیثیت سے انسانیت کا جتنا خون مذہب کے نام پر ہوا اتنا اور کسی نام پر نہیں ہوا۔ یورپ میں لاتعداد لوگ (خصوصاً دانشور) مذہب کے نام پر زندہ جلائے گئے۔ عہد صفوی میں ایران میں لاتعداد لوگوں کو مذہب کے نام پر ایذا رسانی اور موت کا شکار ہونا پڑا اور مذہب ہی کے نام پر اسماعیل صفوی نے ازبکستان میں انسانی کھوپڑیوں سے کلہ مینار تعمیر کرائے۔ مذہب ہی کے نام پر محمود غزنوی اور اسی قبیل کے دوسرے حکمرانوں نے دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو لوٹنے اور برباد کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ شنکر آچاریہ کی تحریک کے تحت بدھ مذہب کے ماننے والوں کا استحصال مذہب ہی کے نام پر کیا گیا جس کی ایک نشانی نالندہ کی عظیم درس گاہ کے کھنڈر ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ پر غور کرتے وقت ایک عجیب خیال میرے دماغ میں آتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ مسلمان دوسرے ملکوں میں دو طریقوں سے گئے۔ ایک عوامی ذرائع اور دوسرے حکمراں۔ جہاں اسلام حکمرانوں کے ذریعہ پہنچا وہاں مسلمانوں کی حکومتیں ختم ہونے بعد اسلام بھی ختم ہو گیا اس لیے کہ ان

حکمرانوں نے مذہب کے استحصال کے علاوہ اسلام کے لیے اور کچھ نہ کیا۔ اسپین اور یوروپ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اسپین میں آٹھ سو سال مسلمانوں نے حکومت کی لیکن آج وہاں کتنے مسلمان ہیں؟ یورپ میں خلافت کے عنوان سے سیکڑوں سال ترکوں نے حکومت کی لیکن خلافت کے کیا فرائض انجام دیے؟ اور آج یورپ میں کتنے مسلمان ہیں؟ خلافت کے پاک نام کا استحصال صرف ترکوں نے ہی نہیں کیا۔ اموی، عباسی، فاطمی، حکمرانوں نے اپنے کو خلیفہ، یعنی جانشین رسول کہلوایا اور بے شک ان کے ادوار میں علمی، تہذیبی، ثقافتی ترقی ہوئی لیکن انھوں نے اسلام کے لیے کیا کیا؟ اس سلسلے میں دہلی یونیورسٹی کے عربی کے استاد پروفیسر شارق نے اپنی تاریخ میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جو میں نہیں جانتا کس حد تک درست ہے۔ ان کے قول کے مطابق ولید بن عبدالملک اموی کے عہد میں ترکستان فتح ہوا تو جزیہ کی کثیر رقم آئی۔ چند سال گزرنے کے بعد اس رقم میں کمی ہوگئی۔ چنانچہ گورنر سے جواب طلبی ہوئی۔ اس نے لکھا کہ کیونکہ یہاں کے لوگ مسلمان ہورہے ہیں اس لیے جزیہ دینے والوں کی تعداد کم ہورہی ہے۔ جواب گیا کہ اسلام لانے کے رجحان کو کم کرو۔ بیت المال جو عام مسلمانوں کے لیے ہوتا تھا وہ ان نام نہاد خلفاء کا شاہی خزانہ بن گیا تھا۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کا واقعہ ذہنوں میں ہوگا۔ انھوں نے بیت المال سے کچھ قرض لیا تھا۔ انتقال کے وقت بیٹے کو وصیت کی تھی کہ ان کا اثاثہ بیچ کر بیت المال کا قرض ادا کر دیا جائے، کیا یہی روش عمر بن عبدالعزیز کے ایسے چند حضرات کو چھوڑ کر دوسرے خلفاء کی بھی رہی؟ حکمرانوں کے علاوہ اسلام کو دوسرے ملکوں میں روشناس کرانے کا دوسرا ذریعہ عوام تھے۔ ان میں صوفی بزرگ بھی تھے اور تاجر بھی۔ ان حضرات کے ذریعہ اسلام جہاں پہنچا وہاں آج بھی پھل پھول رہا ہے۔ ملیشیا اور انڈونیشیا کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ وہاں کبھی کوئی مسلمان حملہ آور نہیں گیا اور صرف تاجروں اور مسلمانوں کے گروہوں کے ذریعہ

اسلام سے وہاں لوگ متعارف ہوئے۔ محمد بن قاسم ہندوستان پر پہلا مسلمان حکمراں تھا لیکن اس نے اسلام کے نام کا استحصال نہیں کیا۔ اس کے بعد سے ہندوستان سے عربوں کی تجارت کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسلمان تاجروں کی ہندو درباروں میں پذیرائی اور احترام ہوتا تھا۔ چنانچہ سلیمان تاجر کے بیان کے مطابق قنوج کے راجہ کے دربار میں راجہ کے داہنی طرف ایک مسلمان کو جگہ ملی ہوئی تھی اور مسلمان رعایا کے مقدموں کے لیے مسلمان قاضی مقرر تھے۔ یہ ترکوں کے حملوں سے پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں ایک طرف تو افغانستان کی طرف سے حکمرانوں کے حملے شروع ہوئے اور دوسری طرف سے ایران کی طرف سے صوفیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ حکمرانوں کا رویہ تھا کہ بقول ڈاکٹر یٰسین صدیقی اگر ایک حملے کے بعد ایک خاص قبیلے کے کچھ لوگ ہندوستان میں آباد ہو جاتے تھے تو دوسرے حملے میں اسی قبیلے کے نو وارد یہاں آباد ہو جانے والے اپنے ہم قبیلہ لوگوں کو بھی ذلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب یہ عالم تھا تو غیر مذہب اصل ہندوستانیوں کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ پرتھوی راج راسو وغیرہ کتابوں میں مسلمانوں کو ملکش کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ دوسرے گروہ یعنی حضرات صوفیہ کی پالیسی اس سے بالکل مختلف تھی۔ وہ محبت، پیار اور انسانیت کا درس دیتے اور انھیں کے طفیل ۱۹۴۷ء تک ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کی ۱/۴ تھی۔ اگر صرف ایک ہی گروہ آتا تو شکل دوسری ہوتی۔ یعنی اگر صرف مسلمان حکمراں آتے تو اسپین اور یورپ مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد اسلام بھی ختم ہو جاتا اور اگر صرف صوفی بزرگ اور عام تاجر آتے تو آج اس برصغیر میں بھی انڈونیشیا اور ملیشیا کی طرح اسّی نوّے فیصد مسلمان ہوتے۔ دونوں گروہوں یعنی حکمرانوں اور صوفیوں اور تاجروں کی بیک وقت موجودگی نے اس تعداد کو محض پچیس تیس فیصد تک محدود رکھا۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ذکر کر رہا تھا اپنے دور کی ہندوستانی سیاست کا اور گفتگو
کرنے لگا مذاہب اور ان کے تحت حکومتوں کی۔ انگریزی حکومت کے ابتدائی قیام کے ساتھ
پلاسی اور بکسر کی جنگوں کے بعد بنگال اور موجودہ بہار سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی تھی۔
۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد دکن سے بھی مسلمانوں کا دور حکومت ختم ہوگیا۔ لارڈ
ولزلی کے **Subsidiary Alliance** کے تحت نظام کی آزادی ختم ہوچکی تھی۔ ۱۷۷۶ء میں
شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیلوں کی طاقت ختم کردی تھی اور خود نوابین اودھ کی کوئی
حیثیت ہی نہ تھی۔ اس طوائف الملوکی کے دور میں مرہٹوں کی شکل میں ہندو حکومتوں کا عہد
شروع ہوا۔ لیکن اس تمام عہد میں فرقہ وارانہ منافرت کا نام نہ تھا اور دہلی کا تخت ہندوستانی
حکومت کا سمبل تھا جس پر صرف مغل خاندان کا حق سمجھا جاتا تھا۔ شیوا جی کے پوتے سمبھا جی کی
پرورش مغل دربار میں ایک شاہزادے کی طرح ہوئی تھی جو اپنے مذہب پر برقرار تھا اور خود اورنگ
زیب نے اسے مرہٹوں کا راجہ تسلیم کرکے ستارہ بھیج دیا تھا۔ اس کے دل میں مغل سلطنت کا اتنا
احترام تھا کہ پیشوا کو ہدایت تھی کہ مغل سرحدوں پر حملے نہ کیے جائیں۔ تاریخ میں حقائق کو مصالح
کے تحت بدل دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب اور شیوا جی کو انگریزی دور میں اس شکل میں پیش
کیا گیا جو ان کی نہ تھی۔ جنگ بکسر کے بعد شہنشاہ دہلی کی حیثیت محض پنشنر کی تھی اور دہلی کے تخت
پر کسی وقت بھی کوئی مرہٹہ، پٹھان یا جاٹ بیٹھ سکتا تھا لیکن ایسا کبھی نہ ہوا۔ وہ شہنشاہ کو قتل کر سکتے
تھے لیکن خود تخت پر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی فوجوں میں مذہب کی تفریق نہ تھی۔ اودھ کے
حکمرانوں کے سب سے معتمد ہندو تھے اور مرہٹوں کے سب سے بڑے جان نثار پٹھان سپاہی
تھے جن کے سپرد سب سے اہم ذمہ داری یعنی قلعہ کے پھاٹک کی حفاظت تھی۔ گوالیار قلعہ کے پھاٹک
پر بنی مسجدیں اس بات کی گواہ ہیں۔ یہ مذہبی رواداری کا جذبہ، انگریزی دور میں میرے ہوش

سنبھالنے تک ختم ہو چکا تھا۔ شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں نے بے اعتمادی کو جنم دیا۔ سیاسی جماعتیں مذہب کے نام پر بنیں اور جو غیر سیاسی تھیں ان میں بھی فرقہ پرستوں کا زور ہو جایا کرتا تھا۔ ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ انھیں حالات کی پیداوار تھیں۔ کانگریس میں بھی فرقہ پرستوں کی کمی نہ تھی۔ انھیں تنگ نظروں نے ہزاروں بے گناہوں کا خون کرایا اور آخر کار ملک کو تقسیم کروا دیا۔ تقسیم سے پہلے ہی خوفناک فسادوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کلکتہ میں **Direct Action Day** کو ہونے والے زبردست فساد میں تقریباً دس ہزار جانیں گئیں جن میں مسلمانوں کی تعداد غالباً زیادہ تھی۔ اس کے بعد ہی مشرقی بنگال میں نوا کھالی اور تپرا کے خونریز فساد ہوئے جن میں ہزاروں بے گناہوں کی جانیں گئیں۔ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو پٹنہ میں نوا کھالی ڈے منایا گیا اور اس کے بعد سے پورے بہار میں وہ قتل عام شروع ہوا جس کی مثال چنگیزی حملوں ہی سے دی جا سکتی ہے۔ نوا کھالی کے فساد اگر سہروردی کی مسلم لیگی دور حکومت میں ہوئے تو بہار کے فساد کانگریسی حکومت کے عہد کا کارنامہ ہے پنجاب میں **Pre- partition Roits** کا سلسلہ بھی اکتوبر ۱۹۴۶ء ہی سے شروع ہوا اور ان کی ابتدا اس روز ہوئی جب راقم الحروف اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ **Inter 'Varsity Swimming Competition** میں حصہ لینے کے لیے لاہور میں موجود تھا۔ ہم لوگوں نے لاہور سے کشمیر جانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن اسی روز جالندھر سے فساد کی خبر آئی۔ ہمارے ساتھیوں میں سیگل اور زاہد بٹ پنجابی تھے۔ چنانچہ وہ لاہور ہی میں اپنے عزیزوں کے یہاں ٹھہر گئے اور راقم الحروف اور اس کے دوست رگھوبیر سنگھ سیٹھ فوراً لکھنؤ واپس ہو گئے۔ تصور بھی نہ تھا کہ یہ فسادات کتنی خوفناک شکل اختیار کر لیں گے۔

تقسیم کے بعد بنگال اور اس سے زیادہ پنجاب کا کیا حشر ہوا، سب جانتے ہیں اور بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ البتہ بعد کو آزاد ہندوستان کے سیاست دانوں نے یہ ضرور

سمجھ لیا کہ طاقت میں آنے اور حکومت حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ فرقہ وارانہ منافرت اور مذہب خطرے میں ہے کہ نعرہ دینا ہے۔ تقسیم سے پہلے مسلم لیگ نے یہی نعرہ لگایا اور اس کے قطعی اسلام ناشناس لیڈروں نے پاکستان کی حکومت حاصل کرلی۔ اسی نسخے کو بعد میں ہندو مہا سبھا کی بیٹی جن سنگھ اور اس کی اولاد بی جے پی نے ہندوستان میں آزمایا اور رام جنم بھومی کے نام پر اڈوانی نے نفرت پھیلا کر دہلی کی حکومت حاصل کرلی۔ ان کو اس سے کیا مطلب تھا کہ ان کی گندی سیاست نے انسانیت کا کتنا خون کیا۔ اڈوانی کی رتھ یاتراؤں اور جھوٹے پروپیگنڈوں نے تمام ہندوستان، خصوصاً بمبئی میں ہزاروں بے گناہوں کو قتل کرایا اور اسی کا نتیجہ آئندہ گجرات کے فسادات ہیں جنھوں نے پوری دنیا کے سامنے ہندوستان کا سر نیچا کردیا۔

گجرات کے فسادات کا ایک عبرت انگیز پہلو یہ بھی ہے کہ فسادات کے بعد کے الکشن میں کانگریس نے بھی نرم ہندوت کا نعرہ دیا۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے۔ سوسیالوجی میں میں نے پڑھا تھا کہ لیڈرشپ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو عوام کو اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلائے اور دوسری وہ جو عوام کی حرکتوں کے سہارے وجود میں آئے۔ اس عہد میں کانگریس کی پہلی قسم کی لیڈرشپ ختم ہو چکی تھی اور پارٹی کی باگ ڈور دوسرے قسم کے لیڈروں کے ہاتھ میں تھی جب گجرات میں کانگریس کے سب سے بڑے لیڈر وہ صاحب بنائے گئے تھے جو چند ماہ پہلے تک بی جے پی کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ لکھنؤ بہر حال ہمیشہ اس گندی سیاست کا شکار بننے سے محفوظ رہا۔ ۱۹۴۲ء کے Quit India Movement کے تحت اور ۱۹۴۶ء کے Direct Action کے نعرے کے تحت بد امنی اور فسادات سے محفوظ رہنے کی طرح ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد کے فسادوں سے بھی یہ شہر محفوظ رہا اور گجرات کے ننگ انسانیت فسادوں کے زمانے میں بھی اس شہر میں امن پسندی اور بھائی چارہ برقرار رہا۔

اقتصادیات اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اپنے وطن کی اقتصادی حالت پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد کا عہد عوامی زبان میں سستی کا اور اصطلاحی زبان میں کساد بازاری (Trade Depression) کا دور تھا۔ دنیا بھر میں چیزوں کی قیمتیں انتہائی کم تھیں جس کے نتیجہ میں پیداوار کرنے والوں کی حالت سقیم تھی لیکن تنخواہ پانے والوں کے لیے نہایت موافق زمانہ تھا اور کم سے کم تنخواہ پانے والا بھی اطمینان کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس وقت کی کرنسی آج سے مختلف تھی۔ ایک روپیہ میں سولہ آنے یا چونسٹھ پیسے ہوا کرتے تھے۔ ایک پیسے کی بھی کافی قیمت تھی اور اس سے پاؤ بھر دودھ خریدا جاسکتا تھا۔ میرے عہد طفولیت سے پہلے سنا ہے کہ پیسے سے بھی کم کرنسی تھی۔ غالباً سب سے کم کوڑی تھی۔ پھر چھدام، پھر دمڑی اور اس کے بعد اڈھا یا دھیلا، یعنی آدھا پیسہ۔ میری یادداشت کے عہد تک دھیلے کی چیزیں خریدی جاتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۳۳-۱۹۳۲ء تک روپیہ کا سولہ سیر گیہوں ملتا تھا جو ہم اہلِ شہر کے لیے تو نعمت تھا لیکن گیہوں پیدا کرنے والوں کو دو وقت سوکھی روتی اور جسم پر دو کپڑے مل جاتے تو غنیمت تھا۔ گاوں کے لوگ شہر میں کام کرنے آتے تھے اور اگر چند آنے روز کی مزدوری بھی مل جاتی تھی تو بہت تھا۔ دیہاتوں میں بےگار عام تھا اور دن بھر زمیندار کے کھیت میں کام کرنے کے دو مٹھی ''چبینا'' دے دیا جاتا تھا۔ شہروں میں انتہائی کم تنخواہوں پر دیہات سے آکر کام کرنے والے مل جاتے تھے۔ خود میرے خاندان کی آمدنی بہت کم تھی لیکن گھر میں دو نوکرانیاں موجود تھیں، ایک کا کام باہر سے سودا اور گھر کو صاف رکھنا تھا اور دوسری کا کھانا پکانا۔ پہلی کی تنخواہ تین روپیہ ماہوار اور کھانا کپڑا تھی اور دوسری کی چار روپیہ ماہوار اور کھانا کپڑا۔ آج شاید کوئی یقین نہ کرے کہ نخاس سے امین آباد تک کا کرایہ تین پیسے فی سواری تھا۔ صبح کے ناشتے کے لیے عموماً بازار سے بالائی منگوالی

جاتی تھی جس کی قیمت ۳ پیسے فی چھٹانک تھی۔ یہ کساد بازاری کا دور جنگ عظیم کی ابتدا یعنی ۱۹۳۹ء تک رہا۔ ۱۹۳۸ء میں میرے چچا علیل ہوئے۔ ان کے واسطے بہترین بے دانہ انار ۱۲/ آنے سیر آیا کرتا تھا۔ ایلو پیتھک دوا مکسچر کی شکل میں ملا کرتی تھی اور اس کا نرخ دو آنے فی خوراک تھا یعنی دو دن کی دوا کی قیمت کل بارہ آنہ ہوتی تھی۔ ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد بھی جب مجھے جسم سازی اور مردانہ کھیلوں کا شوق ہوا تو ورزش کے بعد کی غذا دو پیسے کا دیسی مرغی کا انڈا، تین پیسے کا پاؤ بھر دودھ اور بارہ آنے فی سیر خرید۔ے ہوئے کاغذی بادام پر مشتمل ہوتی تھی۔ بناسپتی تیل اس وقت ایجاد نہ ہوئے تھے۔ خالص گھی ایک روپیہ کا سولہ چھٹانک یعنی ایک سیر ملا کرتا تھا۔ کھانا لکڑی جلا کر پکایا جاتا تھا جس کے لیے پورے ٹھیلے خرید لیے جاتے تھے جس کی قیمت غالباً دو تین روپیہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ گوشت کی قیمت یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ بقرعید کے موقع پر بھیڑا تین روپیہ میں اور بکرا چار روپیہ میں ملا کرتا تھا۔ ترکاریوں کی قیمت آنوں میں نہیں بلکہ پیسوں اور دھیلوں میں ادا کی جاتی تھی۔ کپڑوں کی قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پائجامہ کے لیے جاپانی بہترین ڈی ون (D-I) چھالٹین تین آنے فی گز ملا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ غالباً ۱۹۳۷ء میں ہمارے گھر میں گرم کپڑوں میں دیمک لگ گئی تھی جس کے بعد میرے لیے دو گرم شیروانیاں بنوائی گئی تھیں۔ ایک کی سرج کی قیمت تین روپیہ فی گز تھی اور دوسری کی چھ روپیہ فی گز۔ اس فضول خرچی کے لیے میرے والد نے میرے چچا کو سخت تنبیہ کی تھی۔

تعلیم پر اخراجات کا بھی یہی حال تھا۔ آج کے برخلاف جب بچوں کی تعلیم کا سلسلہ تین سال کی عمر سے اسکولوں سے شروع ہو جاتا ہے جن میں داخلے کے لیے بیس بیس ہزار روپیہ کا عطیہ اور ایک ہزار روپیہ کے لگ بھگ ماہانہ فیس دی جاتی ہے، تعلیم تیسرے درجہ سے شروع ہوتی اور صرف گورنمنٹ اداروں میں ہی نہیں بلکہ پرائیوٹ ایڈڈ اسکولوں اور کالجوں میں بھی فیس

بہت معمولی تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۳۳ء میں میرا جوبلی کالج میں چوتھے درجہ میں داخلہ ہوا اس وقت تین روپیہ ماہانہ فیس تھی جو انٹرمیڈیٹ تک برقرار تھی۔ ۱۹۴۳ء میں جب یونیورسٹی میں بی اے میں میرا داخلہ ہوا تو تین تین مہینے کے سشن ہوتے تھے اور ہر سشن کی فیس چھتیس روپیہ ہوتی تھی۔ غالباً اس وقت کی حکومت کو احساس تھا کہ تعلیم اور صحت حکومت کے فرائض ہیں نہ کہ آمدنی کے ذرائع۔ آج تعلیم صرف عوامی بزنس ہی نہیں ہے بلکہ حکومت کی طرف سے بھی اس بزنس کی ہمت افزائی کی جاتی ہے جس کی مثال Self-Financing Scheme ہے جس کے تحت ادارے نئے نئے کورس کھول سکتے ہیں اور ان کے خرچ کے لیے روپیہ فیس کی شکل میں جمع کیا جاتا ہے۔ عام ٹیوشن کا رواج نہ تھا اور آج کل کی طرح پرائیوٹ ٹیوشن کے ادارے قائم نہ تھے۔ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے آزادی کے ساتھ تعلیم میں اضافہ تو ہوا لیکن حکومت کی جانب سے اسے حکومت کا فرض سمجھا جانا ختم ہو گیا۔ یہی حال صحت کا ہے۔ میری جوانی تک میڈیکل کالج میں داخلے کے بعد نہ صرف مریضوں کا مفت علاج ہوتا تھا بلکہ مفت غذا بھی فراہم کی جاتی تھی اور آؤٹ ڈور مریضوں کے لیے ڈسپنسری موجود تھی جس میں مفت دوا ملتی تھی۔ آج اس میڈیکل کالج (جو ماشاء اللہ یونیورسٹی بن چکا ہے) کے اسپتال کا یہ عالم ہے کہ پلنگ خالی پڑے رہتے ہیں اس لیے کہ آج کا میڈیکل کالج کا ڈاکٹر اسپتال میں علاج کرنے کے لیے نہیں جاتا بلکہ مریضوں کو اپنے پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں لے جانے کے لیے جاتا ہے۔ اسکولوں کے اساتذہ کا بھی یہی حال ہے۔ وہ اسکولوں میں اس لیے نہیں پڑھاتے تاکہ ان کو ٹیوشن ملتے رہیں۔ عہد غلامی میں کم از کم تعلیم اور حفظان صحت کو حکومت کی ذمہ داری سمجھا جاتا تھا اور آج کی سی کیفیت نہ تھی۔

جنگ عظیم چھڑتے ہی قیمتوں میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ گیہوں کی مہنگائی کا یہ عالم تھا کہ ایک روپیہ میں صرف چھ سیر ملنے لگا۔ ہر طرف کہرام مچ گیا اور لوگوں نے زیورات اور اثاثہ

بیچ بیچ کر گیہوں اسٹاک کرنا شروع کیا۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ مہنگائی صرف چندروزہ ہے۔ آئندہ بڑھنے والی مہنگائی کا لوگوں کو تصوّر بھی نہ تھا۔ ہندوستان میں ہر چیز کی قلت تھی اور غذائی مسئلہ پر قابو پانے کے لیے راشننگ کی گئی اور فوجوں کی سپلائی کے سلسلے میں قیمتوں کو کنٹرول کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس راشننگ کے زمانے میں اکثر گیہوں کی کمی کی وجہ سے عراق سے منگوائی گئی کھجوریں تقسیم کی جاتی تھیں لیکن غالباً یہ اس وقت کی بات ہے جب ہندوستان آزاد ہو چکا تھا اور کے ایم منشی سنٹرل حکومت میں وزیر غذا تھے جن کو بلٹز اخبار میں اس کے ایڈیٹر کرنجیا صاحب فوڈ منسٹر کے بجائے فیمین منسٹر لکھا کرتے تھے۔

جنگ عظیم میں قیمتیں بڑھنے کا اثر عوام الناس پر خواہ کچھ بھی ہوا ہو لیکن حکومت ہند کے کھاتے میں اسٹرلنگ بیلنس (Sterling balance) کی شکل میں برابر اضافہ ہوتا گیا اور خسارے میں چلنے والی حکومت ہند جنگ کے خاتمے کے بعد اسی Sterling balance کی وجہ سے انتہائی مستحکم مالی حیثیت کی مالک تھی۔ لیکن غذائی نازک کیفیت نے باہر سے غلہ منگوانے پر حکومت ہند کو مجبور کر دیا اور یہ Sterling balance رفتہ رفتہ غذائی ضرورت پر خرچ ہونے کی وجہ سے ختم ہو گیا۔

آزادی ہند کے بعد ترقی کی اسکیموں پر خرچ کرنے کے سلسلے میں حکومت ہند کو پیسے کی ضرورت ہوئی۔ حکومتوں کے سامنے پیسہ اکٹھا کرنے کے تین ذرائع ہوتے ہیں۔ ٹیکس لگانا، قرض لینا اور فالتو نوٹ چھاپنا جسے اصطلاحی زبان میں Inflation کہتے ہیں۔ یہ تینوں ذرائع استعمال کیے گئے لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا اور فلاحی اسکیموں کے نتیجہ میں اسے وہ آمدنی نہ ہوئی جس کے ہونے کی امید تھی۔ اس کا سبب کچھ تو بد انتظامی تھا لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ ان پر جتنا روپیہ لگنا تھا وہ ان پر نہ لگ کر انجینئروں، افسروں اور سیاسی نیتاؤں کی جیب میں چلا گیا جو

سیاست میں داخل ہی اس وجہ سے ہوئے تھے کہ اپنی جیبیں بھریں۔ ان اسکیموں سے اتنی بھی آمدنی نہ ہوئی کہ بین الاقوامی ایجنسیوں سے جو رقم قرض لی گئی اس کی ادائیگی تو درکنار، اس کا سود بھی ادا کیا جا سکے اور اس سود کو ادا کرنے کے لیے مزید قرض لینے کی ضرورت پیش آئی۔ ٹیکس اور قرض جب انتہا کو پہنچ چکے تو آمدنی بڑھانے کا تنہا ذریعہ **Inflation** رہ گیا جس سے حکومت کے خرچ تو چلتے رہے لیکن قیمتوں میں بے حد اضافہ نے عوام کی کمر توڑ دی۔ آج ہم صرف لکھنؤ میں نہیں پورے ملک میں اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔ آج ہمارے بچے ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ کما رہے ہیں لیکن اخراجات ان کے قابو سے باہر ہیں۔ میرا پروفیسر شپ کا اسکیل صرف پندرہ سو سے پچیس سو تھا اور ریٹائر ہونے کے وقت مہنگائی الاؤنس کو ملا کر مجھے چار ہزار روپیہ ماہانہ ملتا تھا اور آج پروفیسر چالیس ہزار ماہانہ پاتا ہے لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اس سے زیادہ مطمئن رہتا تھا۔ قرض اور **Inflation** سے حاصل کی ہوئی رقم بھی ہمارے لیڈروں کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ روزانہ کسی نہ کسی **Scam** کی خبر اخبار میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ انکوائری ہوتی ہے، مقدمے چلتے ہیں لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ ان حالات سے ہر شخص واقف ہے اس لیے اس سلسلے میں مزید قلم فرسائی کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

''خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے''۔

آٹھواں باب

میں اور میرا خاندان

ہر چند بی بضاعتم و قطرۂ حقیر

از ابر خانوادۂ عرفان چکیدہ ام

میرے والد مولانا وجیہ الحق صاحب اورنگ زیب کے معاصر مشہور عالم دین ملاّ قطب الدین سہالوی کی آٹھویں پشت میں اور مشہور صوفی بزرگ مولانا انوار الحق فرنگی محلی کی پانچویں پشت میں تھے۔ ان کا شجرۂ نسب یہ ہے۔ مولانا وجیہ الحق ابن مولانا فضل حق ابن مولانا امان الحق ابن مولانا برہان الحق ابن مولانا نور الحق ابن مولانا انوار الحق ابن مولانا عبد الحق ابن ملا محمد سعید ابن ملا قطب الدین شہید سہالوی۔ ملا قطب الدین کے اجداد کا شجرہ خود میری کتاب Farangi Mahal·- Past & Present کے علاوہ مطبوعہ تحفۃ الاحباب اور اعضان الاربعہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری، ہروی سے ہوتا ہوا میزبان رسولؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ تک پہنچتا ہے۔ وجیہ الحق صاحب نے مذہبی تعلیم کی تکمیل مدرسۂ نظامیہ سے کی جو ۱۹۰۵ میں وجود میں آیا تھا۔ اس کے بعد عصری انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی اور ابھی چرچ مشن اسکول انٹرنس امتحان پاس ہی کیا تھا کہ ان کے والد مولانا فضل حق صاحب کا

حیدر آباد میں انتقال ہوگیا اور بڑے بھائی ذکا الحق صاحب کے لا پتا ہونے کے بعد گھر کی ذمہ داری اور چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کا بوجھ ان پر پڑ گیا اور وہ مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ مذہبی تعلیم کو ذریعہ معاش بنانا انھوں نے پسند نہ کیا اور انگریزی سرکار کی ملازمت کرلی اور قانون گو کا امتحان اس امید پر پاس کیا کہ اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک ترقی کرنا آسان ہوتا تھا۔ لیکن شاید وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ اس کے لیے افسران بالا کو خوش رکھنا ضروری تھا جس کا واحد ذریعہ رشوت تھی۔ وجیہ الحق صاحب کٹر مذہبی انسان تھے اور رشوت لینا اور دینا دونوں کو مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ نائب تحصلیدار کی پوسٹ سے آگے نہ بڑھ سکے اور وہ بھی بالکل آخر میں۔ ان کی زندگی تمام تر پریشانیوں میں گزری۔ وہ خود کچھ نہ کر سکے لیکن چاہتے تھے کہ چھوٹے بھائی ہی کچھ کر کے خاندان کا نام روشن کریں لیکن ان سے چھوٹے بھائی وحید الحق صاحب نے مذہبی تعلیم کے بعد تحریک ترک موالات اور خلافت کے تحت بی۔ اے پاس کیے بغیر ہی تعلیم چھوڑ دی اور علی گڑھ سے واپس چلے آئے۔ میرے والد کے لیے یہ ایک سانحہ تھا ان کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ان حالات میں وحید الحق صاحب کے لیے انگریزی ملازمت ملنا ناممکن تھا۔ مجبوراً انھیں حیدر آباد جانا پڑا اور وہاں ہیڈ ماسٹر کی پوسٹ پر کام کر رہے تھے جب ۱۹۵۱ء میں انتقال ہوگیا۔ ان کے وہ ساتھی عزیز جنھوں نے تعلیم نہ چھوڑ کر بی اے کرلیا تھا اسسٹنٹ انکم ٹیکس کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ میرے والد کے دوسرے بھائیوں نے بھی ان کی مرضی کے مطابق عمل نہ کیا۔ منظور چچا کے کچھ ایسے دوست ہوگئے جن کا کام خاندانوں میں جھگڑا کرانا تھا اور ان ہی حضرات کی معیت میں وہ فرنگی محل کی ناپسندیدہ اشخاص میں شمار ہونے لگے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی تنقیدیں کس حد تک درست ہوتی تھیں اور کس حد تک غلط۔ ظہور چچا کی طرف سے بھی انھیں ناامیدی ہوئی اور ان کی ناکام زندگی والد کے لیے

مستقل سوہان روح بنی رہی۔ بہنوں کی طرف سے بھی انھیں سکون نہ ملا۔ میری بڑی پھوپھی عین جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں اور دوسری پھوپھی کے سلسلے میں بھی حالات ایسے تھے کہ انھیں مستقل بھائیوں کے ساتھ رہنا پڑا۔ ان تمام باتوں نے ان کے مزاج میں محرومیت **(Frustration)** پیدا کردی تھی۔ ان کے دل میں سب کے لیے درد تھا لیکن مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ان کے لیے کسی کے دل میں درد نہ تھا۔ جن کے لیے انھوں نے زندگی قربان کردی ان میں سے ایک کا تبصرہ صرف یہ تھا کہ وہ غصّہ بہت کرتے تھے۔

وجیہ الحق صاحب نے گھریلو ذمہ داریوں کے تحت دیر میں شادی کی۔ میں ان کی پہلی اولاد تھا اور ابھی ڈھائی سال کا تھا کہ والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے پھر شادی نہ کی اور کنبہ پروری میں تمام عمر کاٹ دی۔ درد گردہ میں مبتلا تھے لیکن حالات ایسے نہ تھے کہ مستقل علاج کر سکتے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں سخت تکلیف کے عالم میں لکھنؤ آئے اور میڈیکل کالج میں داخل ہوگئے۔ سرجن نگم نے فوری آپریشن تجویز کیا لیکن اس کے پہلے ہی درد کا ایک شدید حملہ ہوا جسے وہ برداشت نہ کر سکے اور ختم ہوگئے۔ وجیہ الحق صاحب پڑھنے کے بہت شوقین تھے۔ اپنی محدود تنخواہ کا زیادہ حصہ انھیں لکھنؤ بھیجنا پڑتا تھا۔ خود بہت سختی سے زندگی بسر کرتے تھے لیکن جو تھوڑی سی رقم وہ اپنے پاس اپنے خرچ کے رکھتے تھے اس کا خاصا حصّہ کتابوں پر خرچ ہوتا تھا۔ انگریزی ان کی بہت اچھی تھی اور اس زبان کی کتابیں اور رسائل پڑھنا ان کی خاص دلچسپی تھی۔ اس زمانے میں ایک بڑی ڈکشنری قسطوں میں نکل رہی تھی۔ وہ اسے منگا رہے تھے۔ اس طرح جنرل سائنس کی ایک بہت ضخیم کتاب قسطوں میں ان کے پاس آتی تھی۔ ڈٹکٹیو ویکلی ان کے پاس مستقل آتا تھا۔ ان کی آخری پوسٹنگ ضلع باندہ کی ایک تحصیل میں تھی۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد وہ علاقہ فساد زدہ تھا۔ اترّا نامی قصبے میں تمام مسلمان ہندو بنا لیے گئے تھے۔

انھیں حالات میں آخری بیماری میں وہ لکھنؤ آئے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد جب میں چچا منظور الحق صاحب کے ساتھ اپنے باندہ کے ایک عزیز خان بہادر شیخ مسعود الزماں صاحب کے ملازم کے ساتھ ان کا سامان لینے گیا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صرف انکی سائیکل جو ایک دوسرے شخص کے یہاں رکھی تھی مل سکی۔ مجھے سب سے زیادہ ان کی کتابوں کے ضائع ہونے کا افسوس ہوا۔ وہ لکھنؤ میں اس بڈھے کتاب فروش کے جس کی نخاس میں پرانی کتابوں کی دوکان تھی اور جس کا ذکر کر چکا ہوں، مستقل گاہک تھے۔ جب کبھی بھی لکھنؤ آتے تھے اس کے یہاں سے کوئی نہ کوئی کتاب ضرور خریدتے تھے۔ چنانچہ فسانۂ آزاد، سیر کوہسار، کلیات ظفر، گلزار نسیم، شرر کی مختلف ناولیں وغیرہ سب انھوں نے خرید کر لکھنؤ میں میرے لیے رکھ دیں تھیں۔ قصۂ حاتم طائی، باغ و بہار اور دوسری قصہ کہانیوں کی انھیں کی میرے لیے خریدی ہوئی کتابوں سے میری اردو میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی اور آٹھویں درجے تک میں نے یہ سب کتابیں پڑھ لی تھیں اور نویں جماعت میں جب میں تھا تو اس وقت کے اپنے معیار کے مطابق میں نے کلیات میرؔ کا انتخاب کیا تھا۔ افسوس ہے کہ میں ان کتابوں کی قدر نہ کر سکا اور ان کی اہمیت نہ سمجھتے ہوئے خود پڑھنے کے بعد دوسروں کو پڑھانے کے سلسلے میں مَیں نے انھیں ضائع کر دیا۔ مثلاً فسانۂ آزاد کی چاروں جلدیں میں دوستوں کو پڑھوانے کے لیے دوا خانہ، معدن الادویہ جہاں اپنے دوست سعید عابدی کے ساتھ پڑھتا تھا، لے گیا تھا۔ وہاں سے وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئیں پتا نہیں۔ یہی حال دوسری کتابوں کا بھی ہوا۔ جب انکی اہمیت سمجھنے کا وقت آیا تو وہ میرے پاس نہ رہ گئیں۔

میری والدہ کا شجرۂ نسب حضرت محمد بن ابوبکر صدیقؓ سے ملتا تھا۔ میرے نانا رزاق بخش صاحب کے اجداد گھسکر ضلع بارہ بنکی سے ہجرت کر کے قصبۂ سرسنڈا ضلع بارہ بنکی میں آئے جہاں ان کا ننہال تھا اور وہیں آباد ہو گئے تھے۔ میرے نانا کے بیٹوں کا ابتدا ہی میں

انتقال ہو گیا تھا صرف تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی کی شادی قصبہ جگور میں قدوائی خاندان میں ہوئی تھی لیکن وہ اور ان کے شوہر رضی الدین نامی ایک بچہ کو چھوڑ کر وفات پا گئے۔ رضی الدین صاحب کی پرورش ان کے چچا نے کی اور ان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ وہ انھیں کے ساتھ پاکستان چلے گئے اور وہاں ہی طویل عمر پا کر ان کا انتقال ہوا۔ ان کے دو بیٹیاں اور ایک بیٹے فرید الدین تھے لیکن اب مجھے ان کے متعلق کچھ بھی علم نہیں۔ میری دوسری بڑی خالہ میرے سنجھلے دادا منہاج الحق صاحب سے منسوب تھیں، ان کے دو بیٹیاں اور ایک بیٹے مصباح الحق تھے۔ بیٹیوں کا عالم طفلی میں انتقال ہو گیا، اس کے بعد مصباح الحق صاحب کو چند سال کا بچہ چھوڑ کر ان دونوں کا بھی انتقال ہو گیا۔ مصباح الحق صاحب کی پرورش میرے منجھلے دادا ضیا الحق صاحب نے کی لیکن تعلیم کی طرف توجہ نہ دی اور وہ مدرسۂ نظامیہ میں متوسطات کے آگے نہ پڑھ سکے۔ ان کی عمر بھی پریشانیوں میں گزری اور جب ذرا سکون کے آثار پیدا ہوئے تو ۱۹۵۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میرے نانا کے انتقال کے وقت ان کی سب سے چھوٹی بیٹی میری والدہ حیات تھیں اور انھیں کے توسط سے میں اپنے نانا کی چھوٹی سی زمینداری کا وارث ہوا لیکن یہ وراثت صرف نام کو تھی۔ بالکل ہی بچپن میں وہاں والد کے ساتھ چند مرتبہ گیا اور اتنا یاد ہے کہ بہت سے کاشتکار جمع ہو جاتے تھے۔ والد صاحب نے اس زمین کے متعلق مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اتنا جانتا ہوں کہ والد کی زندگی میں میرے نانا کے ایک پڑوسی لالہ رام جیاون شاہ اس کا انتظام کیا کرتے تھے۔ زمین داری ختم ہوئی اور مجھے کچھ بانڈ ملے۔ اس کے علاوہ زمین کا کیا حشر ہوا مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میرے نانا کا مکان ملبہ کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ وہاں عقیدہ ہے کہ وارث کے علاوہ جو بھی اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا برباد ہو جائے گا۔ سنا جاتا ہے کہ ایک سنار نے اس پر اپنا مکان بنانے کی کوشش کی اور تباہ ہو کر چلا۔ مکان کے ملبہ کے برابر ہی میرے نانا اور ان کے

بزرگوں کی قبریں ہیں جس کی دیکھ بھال بنکر برادری کے کچھ افراد کرتے رہتے ہیں۔ دو چار سال میں مَیں اگر کبھی پہنچ جاتا ہوں تو بے چارے بہت خاطر مدارات کرتے ہیں۔ پندرہ بیس سال قبل جب میں اپنی بیوی کے ساتھ گیا تھا تو انھیں میں کی ایک بوڑھا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں ان کے بھائی کو لکھنؤ میں جانتا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ شاعر ہیں اور عمر انصاری نام ہے۔ اب سرسنڈے میں میرے خاندان کی یادگار صرف ایک مسجد ہے، جسے میرے نانا کے والد یا دادا نے بنوایا تھا۔ سنا ہے کہ گڑھی بھلول، ضلع بارہ بنکی کے بڑے زمیندار اسماعیل صاحب (جو تقسیم ہند کے پہلے ریلوے کے ایک بڑے افسر تھے) اور ان کے بھائی عشرت علی صاحب اور اسحاق صاحب ننھیالی رشتے سے میرے عزیز قریب تھے اور ان کا ننھیال بھی وہی خاندان تھا جو میرا ننھیال تھا۔ عشرت صاحب کے بیٹے ڈاکٹر ثروت علی دہلی میں ملازم تھے اور اب ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ عشرت صاحب اور اسحاق صاحب سے ۱۹۴۵ء میں جب میں نے تعطیلات گرما میں Grain Procurement Scheme میں تین مہینے کے لیے ملازمت کر لی تھی اور حیدر گڑھ میں بحیثیت Procurement Inspector پوسٹنگ تھی چند ملاقاتیں ہوئی لیکن اس میں عزیز داری کا کبھی ذکر نہ آیا۔ وہ غلہ خریداری کے ایجنٹ تھے اور میں سرکاری خرید کا انسپکٹر۔ یہی ہم دونوں کا رشتہ تھا۔ اس لحاظ سے اب میرے ننھیال میں کوئی بھی فرد نہیں ہے۔ اس محرومی نے میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

میرے پردادا کا گھر وہی تھا جس میں میں اب قیام پذیر ہوں یعنی پولیس چوکی پاٹا نالہ کی پشت پر ۲۷۔ فرنگی محل۔ اس کی تعمیر نو کرا کے میں نے پردادا کی ملکیت ہونے کے سبب سے ''دارالامان'' نام رکھ دیا ہے۔ میرے پردادا مولانا امان الحق صاحب کے انتقال کے بعد غالباً جگہ کی کمی کے باعث میرے دادا مولانا فضل حق صاحب اس مکان کو اپنے تینوں چھوٹے

بھائیوں یعنی مولانا ضیا الحق صاحب، مولانا منہاج الحق صاحب اور حکیم ممتاز الحق صاحب کے لیے چھوڑ کر میری دادی کے مکان (یعنی ۲۲۔ دلالی محلّہ) میں چلے آئے جو میرے جد مولانا نورالحق صاحب کے چچا زاد بھائی مولانا ظہور الحق صاحب کی تنہا وارث تھیں۔ میرے دادا حیدر آباد میں ملازمت کرتے تھے اور دادی اپنی اولادوں کے ساتھ اپنے اس شکستہ گھر میں رہا کرتی تھیں۔ میری پیدائش اسی گھر میں ہوئی۔ میری دادی کا اور میرا ساتھ صرف ڈھائی سال رہا اور میری والدہ کے انتقال کے ساتھ ہی صرف چند روز کے فاصلہ سے ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

ہائی اسکول سرٹیفکٹ کے حساب سے میری تاریخ پیدائش ۱۴رمئی ۱۹۲۷ء ہے لیکن بچپن میں سنا کرتا تھا کہ میری پیدائش جاڑے میں ہوئی۔ ۱۹۳۳ء میں جب میرا داخلہ جوبلی کالج میں چوتھی جماعت میں ہوا تو بتایا جاتا تھا کہ میری عمر نو سال تھی۔ اس لحاظ سے میرا سنِ پیدائش ۱۹۲۴ء میں جاڑے کا کوئی مہینہ ہونا چاہیے تھا۔ اپنی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں رضا بھائی (مفتی رضا انصاری صاحب) سے ایک مرتبہ گفتگو ہو رہی تھی۔ (وہ مجھ سے آٹھ سال بڑے تھے۔ لیکن ان کے والد میرے والد کے ہم عمر تھے)۔ انھوں نے اپنے والد کے چچا مولوی سلامت اللہ صاحب (جن کی اہلیہ میری دادی کی چھوٹی چچا زاد بہن تھیں) کی ڈائری نکالی جس میں سب بچوں کی پیدائش کی تاریخیں بھی لکھی تھیں۔ اس ڈائری سے پتا چلا کہ میری اصل تاریخ پیدائش ۱۱ دسمبر ۱۹۲۴ء ہے۔ اسی ڈائری سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے عزیز قریب عصمت اللہ مرحوم جو مجھ سے چار سال جونیر تھے مجھ سے اتنے چھوٹے نہ تھے جتنا میں سمجھتا تھا۔ ان کی پیدائش فروری ۱۹۲۶ء میں ہوئی تھی۔ یعنی وہ مجھ سے صرف ایک سال تین ماہ چھوٹے تھے۔ (عصمت اللہ مرحوم کا انتقال ۳رمئی ۲۰۰۲ء کو بمرض کینسر ہو چکا ہے) جیسا عرض کیا جا چکا ہے، میری عمر صرف ڈھائی سال کی تھی جب میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے انتقال کے کچھ مہینہ کے بعد میرے

چھوٹے بھائی کا جو والدہ کے انتقال کے وقت چھ ماہ کا تھا، اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ میرے والد ملازمت کے سلسلے میں باہر رہا کرتے تھے اس لیے میری پرورش کی ذمہ داری میری چھوٹی پھوپھی کے سپرد ہوئی جن کی اس وقت تک شادی نہ ہوئی تھی۔

میری سب سے پہلی یاد وہ دلہن ہے جو ہمارے شکستہ گھر کے ایک حصّے کے چھوٹے صحن میں اتاری گئی تھی۔ میرے چچا منظور الحق صاحب کی شادی گرمیوں کے مہینہ میں ۱۹۲۷ء میں ہوئی تھی۔ اس لیے یہ یاد اس وقت کی ہے جب میں ڈھائی سال کی عمر کے قریب تھا۔ اسی عمر میں میری والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ اب یہ بتانے والا کوئی نہیں کہ میری چچی کے ہمارے یہاں آنے کے وقت میری والدہ حیات تھیں یا نہیں۔ میرے دوسری یاد کسی کی وفات ہے۔ اتنا یاد ہے کہ ہمارے گھر کے سامنے ایک صاحب منے آغا کا مکان تھا (جسے بعد میں قدرت اللہ صاحب نے خرید لیا تھا جن کی بہو آج بھی اس گھر میں مقیم ہیں)۔ اس وفات کے سلسلے میں لوگ اس گھر کے باہری کمرے میں بیٹھے تھے۔ میری دادی کے انتقال میں اور میری والدہ کے انتقال میں بہت ہی کم وقت کا فرق تھا۔ ممکن کہ اس یاد کا تعلق ان دونوں میں سے کسی کی وفات سے ہو یا وہ میرے چھوٹے بھائی وسیم الحق سے متعلق ہو۔ بہر حال کوئی بتانے والا نہیں اور وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ یاد بھی اس وقت کی ہے جب میں تین سال سے کم عمر کا تھا۔

میرے والد اور ان سے چھوٹے چچا وحید الحق صاحب کے بعد میری بڑی پھوپھی تھیں جو میری پیدائش سے پہلے ہی بیوہ ہو چکی تھیں اور جن کی صرف ایک بیٹی شاہدہ بانو زندہ تھیں۔ وہ مجھ سے ڈھائی سال بڑی ہیں اور عالم بیوگی میں اپنے شوہر سید قمر الحسن صاحب کے مکان میں اعظم گڑھ میں اپنے بیٹوں کے ساتھ مقیم ہیں۔ ان پھوپھی سے چھوٹے میرے چچا منظور الحق صاحب تھے۔ ان کی تمام تر تعلیم مشرقی انداز کی تھی۔ حفظ قرآن اور درس نظامی سے فراغت کے

بعد انھوں نے عربی کے سرکاری امتحانات پاس کیے تھے اور ابتدا میں اپنے ہی خاندان کے ایک بزرگ کے قائم کردہ مدرسۂ چشمۂ رحمت (غازی پور) میں (جواب انٹرمیڈیٹ کالج بھی ہے) عربی کے مدرس ہوگئے تھے۔ اس کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں آگئے تھے اور پرتاپ گڑھ میں سرکاری ہائی اسکول میں عربک ٹیچر ہوگئے تھے۔ غالباً ۱۹۳۰ء میں ان کا گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں تبادلہ ہوگیا تھا۔ منظور چچا کی شادی جس کا ذکر کیا جاچکا ہے ۱۹۲۷ء میں ہوچکی تھی۔ میری چچی قصبۂ سدّھور ضلع بارہ بنکی کے نیاز احمد صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں جن کا ننہال ستر کھ ضلع بارہ بنکی کا عثمانی خاندان تھا۔ چچی کے ددھیالی جد شیخ الاسلام عبداللہ انصاری کے ایک فرزند ابوبکر تھے۔ ۱۹۳۱ء میں میری چھوٹی پھوپھی جن کی آغوش میں میری پرورش ہورہی تھی، کی شادی سید نپور ضلع بارہ بنکی کے محبوب علی صاحب کے ساتھ ہوگئی۔ محبوب علی صاحب کے تمام عزیز صدیقی تھے۔ ان کے ماموں زاد بھائی ولایت علی صدیقی اور خالہ زاد بھائی جنرل عنایت حبیب اللہ کے والد شیخ حبیبؒ اللہ تعلقدار سید نپور بھی صدیقی تھے۔ لہٰذا ہم سب کا خیال تھا کہ میرے پھوپھا بھی صدیقی ہوں گے (بدقسمتی سے نہ تو محبوب علی صاحب نے اور نہ میرے باپ چچاؤں نے مجھے ان کے خاندان کے متعلق کچھ بتایا) لیکن محبوب علی صاحب کے خالہ زاد بھائی شیخ حبیب اللہ کی بڑی بیٹی جو محبوب علی صاحب کی دودھ شریک بہن تھیں، ان کے صاحبزادے اچھو میاں نے جن کو علم الانساب میں دخل تھا، مجھے بتایا کہ پھوپھا جان محبوب علی صاحب ان کے خاندان کے نواسے تھے اور حقیقتاً سید تھے۔ اس زمانے میں خاندان پر بہت توجہ دی جاتی تھی اور اگر کوئی غریب شخص صحیح نسب ہوتا تو دولتمند زمیندار خاندان اپنی بیٹی کو بے تکلف اس کے ساتھ بیاہ دیتے تھے اور گزربسر کے لیے کچھ زمین دیدیتے تھے۔ پھوپھا جان کے اجداد کا بھی شاید یہی معاملہ تھا۔ بہرحال وہ سید ہوں یا نہ ہوں، ننہالی حیثیت سے وہ شیخ صدیقی تھے اور

ان کی اولادیں اپنے کو شیخ صدیقی ہی لکھتی ہیں۔ پھوپھی شادی کے بعد سیدنپور چلی گئیں۔ اور میری چچی میری تیسری ماں ہوگئیں۔ منظور چچا کے بچے زندہ نہ رہتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی وحید الحق صاحب شادی کے موڈ میں نہ تھے۔ لے دے کر پورے خاندان میں، ہی تنہا بچہ تھا۔ چچا اور چچی مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے اور ماں کی غیر موجودگی اور باپ کی غیر حاضری میں یہی چچا چچی میرے ماں باپ تھے۔ میرے پھوپھا محبوب علی صاحب کی مالی حالت درست نہ تھی۔ تھوڑی سی زمین گزر بسر کے لیے کافی نہ تھی۔ میرے پھوپھی زاد بھائی محمد لطیف ۱۹۳۳ء میں پیدا ہو چکے تھے۔ پھوپھی کو واپس لکھنؤ آ جانا پڑا اور اب میری دیکھ بھال چچی اور پھوپھی دونوں کے ذمے تھی۔ بڑی پھوپھی بھی اپنے گھر بجنور ضلع لکھنؤ سے آ جایا کرتی تھیں اور بچپن میں تنہا میرے ساتھ کھیلنے والی ان کی بیٹی شاہدہ تھیں جو آج تک میری بڑی بہن ہیں۔ میرے سب سے چھوٹے چچا ظہور الحق صاحب تھے جن کی بھی تعلیم مشرقی انداز میں مدرسۂ نظامیہ میں ہوئی تھی، قسمت کے اچھے نہ تھے۔ کوئی ملازمت نہ مل سکی اور غالباً ۱۹۳۸ء میں ان کے بڑے بھائی وحید الحق صاحب نے انھیں حیدر آباد بلا لیا اور وہاں انھوں نے ایک معمولی ملازمت کر لی۔ ۱۹۴۶ء میں اورنگ آباد میں ان کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ میرے چچا وحید الحق صاحب شادی کے موڈ میں نہ تھے۔ منظور چچا کے بے حد اصرار پر اور یہ احساس دلانے پر کہ ان کی اولادیں زندہ نہیں رہتیں اور میرے بچہ ہونے کی وجہ سے زندگی غیر یقینی ہے، خاندان ہی کے ختم ہونے کا خطرہ ہے، وہ بدقت شادی کے لیے راضی ہوئے اور خیر آباد ضلع سیتاپور کے فاروقی خاندان کی ایک سید نواسی ولی النساء کے ساتھ غالباً ۱۹۳۶ء میں ان کی شادی ہوگئی۔ وحید الحق صاحب جنھیں ان کے بھائی بہنوں کے ساتھ میں بھی بھائی جان کہتا تھا شادی کے پہلے ہر سال لکھنؤ آتے تھے لیکن شادی کے بعد ایسا ممکن نہ ہو سکا اور دو تین سال کے بعد ان کا آنا ہوتا تھا۔ میرے والد کی

پوسٹنگ ضلع جھانسی میں رہتی تھی اور دونوں بھائیوں کی ملاقات چندمنٹ کے لیے وحید الحق صاحب کے حیدرآباد سے لکھنؤ آنے کے وقت جھانسی اسٹیشن پر ہو جاتی تھی۔

غالباً ۱۹۳۲ء میں میرے والد کا تبادلہ مختصر مدت کے لیے لکھنؤ ہو گیا۔ ان کے فرائض منصبی کی وجہ سے ان کے پاس آنے والوں کی تعداد بہت ہوتی تھی اس لیے اپنے مکان کے قریب ہی انھوں نے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا تھا جس میں وہ اور میری چچی کے بھتیجے عتیق بھائی جو لکھنؤ یونیورسٹی سے بی کام کر رہے تھے رہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ میرے باپ چچا میں کسی بات پر اختلاف ہو گیا اور دونوں میں علاحدگی طے ہوئی۔ یہ طے کیا گیا کہ چھوٹے چچا ظہور الحق صاحب جو حیدرآباد جانے کے پہلے بیکار تھے، وہ چچا منظور الحق صاحب کے ساتھ رہیں گے اور ان کا خرچ وہ برداشت کریں گے اور چھوٹی پھوپھی جو لکھنؤ واپس آ چکی تھیں، ان کے ذمہ دار میرے والد ہوں گے لیکن معاملہ اس بات پر اٹک گیا کہ میرا کیا ہوگا۔ چچا اور چچی مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر بضد تھے اور والد کا کہنا تھا کہ مجھ سے الگ ہو رہے ہو تو میرے بیٹے سے کیا تعلق ۔ بہر حال کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور بات ختم ہو گئی اور حسبِ سابق سب ساتھ رہنے لگے۔ البتہ میرے چھوٹے چچا کی ذمہ داری منظور چچا کی اور پھوپھی کی ذمہ داری میرے والد کی رہی۔ سَستی کا زمانہ تھا کم تنخواہوں میں بھی سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ چھوٹے چچا کے حیدرآباد جانے کے بعد منظور چچا کی ذمہ داری ختم ہو گئی لیکن پھوپھی کے خاندان کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ میرے والد کی ذمہ داری بڑھتی گئی۔ مہنگائی جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہی بڑھنا شروع ہو گئی تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ تنگ دستی کا دور شروع ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ غالباً ۱۹۴۰ء میں گیہوں کی قیمت چھ سیر فی روپیہ ہو گئی تو ہر طرف کہرام مچ گیا اور اس خوف سے کہ قیمت اور نہ بڑھ جائے لوگ اثاثہ بیچ کر گیہوں اسٹاک کرنے لگے۔ اس وقت کسے اندازہ تھا کہ ایک ایسا

وقت آنے والا ہے کہ گیہوں بارہ روپیہ فی سیر اور اس سے بھی زیادہ قیمت پر بکے گا۔

غالباً تحریر کر چکا ہوں کہ میری تعلیم کی ابتدا قصبہ ’متیٔ‘ کے رہنے والے اور مدرسۂ ناظمیہ میں پڑھانے والے مولوی انتخاب حسین کے درس سے ہوئی۔ مولوی صاحب مجھے پڑھانے کے لیے اپنے بیٹے قمر رضا کو ساتھ لے کر آتے تھے اور ہم دونوں ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ قمر رضا کے چھوٹے بھائی آج بھی لکھنؤ میں ہیں اور ان سے معلوم ہوا کہ قمر رضا اب بھی بنگلہ دیش میں بقیدِ حیات ہیں۔ اُردو کی تعلیم کے ساتھ ساتھ سات سال کی عمر میں اسکول میں داخلے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یہ لکھ چکا ہوں کہ میرے والد کے لکھنؤ میں مختصر قیام کے دوران میری چچی کے بھتیجے عتیق احمد صاحب (عتیق بھائی) تعلیم کے سلسلے میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ مجھے انگریزی اور حساب وغیرہ پڑھانے کے لیے ان کے ایک ساتھی ولی الزّماں صاحب بحیثیت ایک ٹیوٹر مقرر کیے گئے۔ والد کے تبادلے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ میری ابتدائی زندگی کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ باوجودیکہ میرے سرپرست چچا منظور الحق صاحب خود حافظِ قرآن اور مکمل عالم دین تھے، لیکن میری دینی تعلیم کی طرف توجہ نہ دی گئی۔ اسکول میں داخلے کے بعد تعطیلات گرما میں میرے والد مجھے اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ اپنے ساتھ رکھ کر جتنی بھی مذہبی تعلیم دے سکتے تھے دیتے تھے، البتہ مذہب سے میری دلچسپی پیدا کرنے کی ان کی کوشش بارآور ہوئی اور مذہبی معلومات جو کچھ بھی میں نے بعد کو حاصل کیں وہ ان کی اسی کوشش کا نتیجہ تھیں۔

اسکولی زندگی شروع ہونے سے پہلے میرا جو ماحول تھا اس میں مجھ سے محبت کرنے والے بہت تھے لیکن ساتھ کھیلنے والا کوئی نہ تھا۔ اس ماحول نے مجھے ایک **Imaginative Child** بنا دیا اور اسی بات نے شاید آئندہ زندگی میں مجھ میں شاعرانہ صلاحیت پیدا کر دی۔ ان محبت کرنے

والوں میں میرے منجھلے چچا وحید الحق صاحب بھی تھے جو علی گڑھ سے تعلیم چھوڑ کر چلے آئے تھے اور اس وقت تک حیدر آباد نہ گئے تھے۔ ان کے دوستوں میں اہم ادبی شخصیتیں تھیں۔ شیخ ممتاز حسین عثمانی، ایڈیٹر اودھ پنچ ہمارے مکان کے قریب ہی ایک کرایہ کے مکان میں رہتے تھے اور وہیں سے اودھ پنچ نکالتے تھے۔ وحید الحق صاحب کی نشستیں ممتاز حسین صاحب کے یہاں ہوا کرتی تھیں اور وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اس وقت میری عمر بمشکل چھ سال ہوگی اس لیے یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ کیا باتیں ہوتی تھیں لیکن ممتاز حسین صاحب کا حلیہ آج تک یاد ہے۔ گندمی رنگ، پچکے گال، سیاہ (غالباً خضاب سے) موچھیں، منڈی ہوئی، داڑھی اور دبلا پتلا جسم، سیاہ ایرانی ٹوپی جس کا جز بن گئی تھی۔ ممتاز حسین صاحب کے علاوہ وحید الحق صاحب کی نشست گاہ چوک میں مسجد داروغہ حیدر بخش کے نیچے خواجہ عبدالرؤف عشرت صاحب کی کتابوں کی دوکان تھی۔ وحید چچا کے حیدر آباد جانے کے بعد بھی مجھے علمی اور ادبی ماحول ملتا رہا۔ حکیم سید علی آشفتہ صاحب کا مطب اور دواخانہ کیمیائے اودھ ہمارے مکان سے قریب تھا اور حکیم صاحب میرے سنجھلے چچا منظور الحق صاحب اور چھوٹے چچا ظہور الحق صاحب کے عزیز دوست تھے۔ شام کو حکیم صاحب کے مطب کے سامنے چوڑے فٹ پاتھ پر کرسیاں بچھا دی جاتی تھیں اور شہر کی ممتاز ادبی شخصیتیں جمع ہوتی تھیں۔ اپنے چچاؤں کے ساتھ مجھے بھی ان نشستوں میں شامل ہونے کا موقع ملتا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ جب اسکول میں میرا داخلہ ہو چکا تھا اور ادبی ماحول کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت مجھ میں پیدا ہوگئی تھی۔

نواں باب

میرا تعلیمی دور

"این جوہرِ ذات از شرفِ نسبتِ آباست"

عرض کیا جاچکا ہے کہ میرے چچااور سر پرست منظور الحق صاحب گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں ایک ٹیچر تھے، چنانچہ جب میرے اسکول میں داخلے کا سوال ہوا تو نظرِ انتخاب اسی ادارے پر پڑی۔ اس عہد میں ضروری نہ تھا کہ تعلیم کی ابتدا آج کل کی طرح پرائمری سے بھی پہلے درجوں سے کی جائے اوران معمولی درجوں کے لیے ہزاروں روپیہ فیس دی جائے۔ جوبلی کالج میں تیسرے درجے سے تعلیم شروع ہوتی تھی۔ مجھ میں چوتھے درجے کی لیاقت پائی گئی اور اسی درجے میں میرا داخلہ ہوگیا۔ اس وقت ایس۔ کے گھوش صاحب اس کالج کے پرنسپل تھے اور اس کا شمار لکھنؤ کے سب سے بہتر اداروں میں ہوتا تھا اور میرے بچپن کی شہر کی تمام ممتاز شخصیتیں بشمول علی ظہیر و آنند نرائن ملا صاحبان اسی کالج کے سابق طلبا تھیں۔ کالج تعلیم کے علاوہ کھیل کود کے نقطہ نظر سے بھی شہر کا اہم ترین ادارہ تھا اور لکھنؤ یونیورسٹی کی موجودگی میں اس نے مسلسل چھ سال تک فٹ بال میں لیکھ راج کپ جیتا تھا۔ کالج کی ہاکی ٹیم بھی اتنی ہی ممتاز تھی۔ کرکٹ کا اس زمانے میں رواج ہی نہ تھا۔ کالج کی زندگی سخت ڈسپلن کی زندگی تھی۔ چچا کے ساتھ اسکول جاتا تھا۔ انٹرول میں ٹینس کے بال سے فٹ بال کھیلا جاتا تھا، شام کو چچا کے ساتھ واپس آنے کے

بعد پھر کھیل کے لیے اسکول کی گراؤنڈ پر جاتا تھا۔ کالج میں استادوں کے لیے ٹینس کورٹ تھا۔ چچا ٹینس کھیلنے جاتے تھے اور میں انھیں کے ساتھ کالج گراؤنڈ پر فٹ بال کھیلنے جایا کرتا تھا۔ ٹینس بال پر پریکٹس سے فٹ بال اور ہاکی دونوں کو سیکھنے میں بہت مدد ملی۔ پانچویں چھٹے درجے ہی میں اسکول کی ''سی'' ٹیم میں جو بچوں پر مشتمل ہوتی تھی، مجھے جگہ مل گئی۔ مغرب کے وقت گھر واپس آنا ضروری تھا۔ اسی وقت رات کا کھانا ہو جاتا تھا اور اس کے بعد پڑھائی کا وقت شروع ہوتا تھا اور دو ڈھائی گھنٹہ پڑھنے میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اسکول میں تیز لڑکوں سے مقابلہ رہتا تھا اور اس کے لیے پڑھائی میں دل لگانے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت دینا بھی ضروری تھا۔ آج کی طرح ٹی وی اور کمپیوٹر گیمس کا وہ زمانہ نہ تھا۔ پڑھائی کے لیے اطمینان سے وقت ملتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسکول میں نچلے درجوں میں جن اساتذہ سے سابقہ پڑا وہ سب انتہائی لائق تھے۔ ایچ۔ ڈی۔ گھوش صاحب Mathematics کے بے حد اچھے استاد تھے، ینگ صاحب جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ ایچ۔ این بنرجی صاحب انگریزی کے استاد تھے۔ مولانا ثاقب حسین صاحب فارسی اور مولانا اختر علی تلہری صاحب اُردو پڑھاتے تھے۔ جیسا کہ اُردو ادب کے شائقین کو علم ہوگا، مولانا اختر علی تلہری صاحب نے نچلے درجے کا ٹیچر ہونے کے باوجود ادبی دنیا میں قابلِ احترام مقام حاصل کرلیا تھا۔ مجھ میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں ان کا اہم حصّہ ہے۔ ہفتے میں ایک روز انھوں نے بیت بازی کے لیے مقرّر کر دیا تھا اور اس کے لیے اچھے شعر یاد کرنا ضروری تھا۔ درجے میں خود مَیں، علی عباس حسینی صاحب جو اسی کالج میں ایل۔ ٹی۔ گریڈ ٹیچر تھے، ان کے بیٹے مہدی عباس اور ایک اور صاحبزادے جواد علی بیت بازی میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان نچلے درجے کے ساتھیوں میں شہر کے مشہور معالج حکیم صاحب عالم صاحب کے فرزند سید محمد سعید عرف غلام عباس میرے سب سے قریبی دوست تھے۔ چھٹے درجے کے بعد جب میں نے

اسکول سے چچا کے ساتھ واپسی چھوڑ دی تھی، میں اور سعید پاٹانالا ہوتے ہوئے واپس آتے تھے اور وکٹوریہ اسٹریٹ کے قریب پہنچ کر ہم لوگ اپنے گھروں کی طرف مڑ جاتے تھے۔ سعید کا مکان وہی تھا جس میں اب شیعہ کالج کی سٹی برانچ قائم ہے۔ سعید کا گذشتہ سال کناڈا میں انتقال ہوگیا۔ مہدی عباس کا ساتھ اسکول میں داخلے سے بھی پہلے کا تھا۔ علی عباس حسینی صاحب میرے مکان سے قریب ہی پاٹانالے کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ وہ میرے چچا کے قریبی دوستوں میں تھے اور مہدی عباس اسکول میں داخلے سے پہلے ہی میرے ساتھ کیرم کھیلنے آجاتے تھے۔ ان کا داخلہ پانچویں کلاس میں ہوا تھا۔ مہدی کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ میرے ابتدائی درجوں کے ایک اور ساتھی پرنسپل گھوش صاحب کے چھوٹے بھائی سمریند گھوش تھے۔ جنگِ عظیم چھڑنے کے بعد وہ انٹرمیڈیٹ کر کے فوج میں چلے گئے تھے اور لڑائی کے خاتمے پر پولیس میں ایس پی ہوگئے تھے۔ مدّت ہوئی ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ مہیش پرساد میڈیکل کالج کے ڈاکٹر ہرگووند پرساد کے بیٹے تھے۔ ان کا بھی پانچویں جماعت سے ساتھ ہوا۔ آگے چل کر جمشید پور سے انھوں نے انجینئرنگ کورس کیا اور ریلوے میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اب دُنیا میں نہیں ہیں۔ چھٹے درجے میں آنند موہن چک کا ساتھ ہوا۔ ان کے والد جگموہن ناتھ چک یونیورسٹی میں لا فیکلٹی میں ڈین تھے۔ آنند میرے بہت ہی عزیز بچپن کے دوستوں میں تھے۔ Mathematics میں ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد امریکہ چلے گئے۔ ان کے علاوہ کلاس کے سبھی بچوں سے میری دوستی تھی جن میں اخلاق احمد بھی تھے جن کی بہن ہاجرہ سے آئندہ میری شادی ہوئی۔ ان کے علاوہ نواب آصف جاہ بھی چوتھی جماعت کے میرے ساتھیوں میں تھے۔ جہاں تک علم ہے میرے ابتدائی عہد کے دوستوں میں اب یہی دونوں یعنی اخلاق احمد اور آصف جاہ، بقیدِ حیات ہیں۔

یہاں یہ بات بھی تحریر کرنا ضروری ہے کہ اُردو کی اس وقت وہ حیثیت نہ تھی جو آزادیٔ

ہند کے بعد ہوگئی۔ میرے استاد یوسف حسین موسوی صاحب جو خود جوبلی کالج کے طالبعلم اور آنند نرائن ملا اور علی ظہیر صاحبان کے ہم درس تھے، بتایا کرتے تھے کہ ان کے زمانے میں بھی اُردو اور ہندی کے الگ الگ کلاس ہوتے تھے لیکن ہندی پڑھنے والے اتنے کم ہوتے تھے کہ انھیں خود کو ہندی کا طالب علم بتاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ میرے طالب علمی کے ابتدائی زمانے میں یہ حالت تو نہ تھی پھر بھی کلاس میں اُردو طلبہ کی تعداد ہندی طلبا سے زیادہ ہوتی تھی اور ان میں بیشتر اہلِ ہنود بچے ہوتے تھے۔ انٹرول میں کھیل کے لیے ہندی اور اُردو پڑھنے والے طلبا کی ٹیمیں بنتی تھیں جن میں باقاعدہ میچ ہوتے تھے۔ ان دونوں زبانوں کے سلسلے میں ایک دوسری بات یہ تھی کہ ہر ہندی کے طالبعلم کو اردو اور ہر اردو کے طالب علم کو ہندی بحیثیت سکنڈ فارم کے پڑھنا پڑتی تھی۔ کتابیں ایک ہی سہل ہندوستانی زبان میں ہوتی تھیں لیکن رسم الخط جداگانہ ہوتے تھے۔ کاش دو مختلف رسم الخطوں میں لکھی جانے والی ہندوستانی، ہندوستان کی سرکاری زبان بنتی لیکن سنا جاتا ہے کہ آزادی سے پہلے اپنے کو مسلمانوں کی نمائندہ کہلانے والی جماعت سے منسلک ایک خاتون کے آزادی کے بعد چولا بدل کر کانگریسی بن کر ہندی کے حق میں ووٹ دینے سے ہندوستانی ہندوستان کی سرکاری زبان نہ بن سکی۔ خدا معلوم یہ بات کس حد تک سچ ہے۔

۱۹۳۸ء میں مَیں نے جوبلی کالج کی آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال منظور چچا کا تبادلہ جوبلی کالج سے گورنمنٹ ہائی اسکول، بارہ بنکی ہوگیا۔ ہم سب یعنی چچی، میں، پھوپھی اور ان کے دونوں بچے ان کے ساتھ بارہ بنکی گئے۔ (اس وقت تک چھوٹے چچا حیدرآباد جا چکے تھے اور خود منظور چچا کی کوئی بھی اولاد زندہ نہ تھی) لیکن پندرہ روز کے بعد ہی ان کو بخار آنا شروع ہوگیا جو وہاں کے کسی ڈاکٹر کے علاج سے نہ اترا۔ مجبوراً ہم سب کو پھر لکھنؤ آنا پڑا لیکن یہاں ان کی شدید علالت کا سلسلہ برقرار رہا۔ ان کے علاج کے سلسلے میں میرے والد آدھی تنخواہ پر طویل

چھٹی لے کر لکھنؤ آ گئے۔ ان کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ بیماری کا تعلق کسی مافوق الفطرت سبب سے تھا۔ اس خیال کی ابتدا اسی دن سے ہوئی تھی جب بارہ بنکی جا کر ہم عرصے سے خالی پڑے رہنے والے ایک مکان میں بطور کرایہ دار مقیم ہوئے۔ میرے والد کو اسی دن کچھ عجیب باتیں نظر آئیں اور انھوں نے فوراً مکان کو بدلنے کے لیے کہا لیکن منظور چچا نے توجہ نہ دی۔ ڈاکٹروں کے مطب اور دوا خانے کے چکر لگانے کے علاوہ ان کا کافی وقت دعا تعویذ کرنے والوں کی تلاش میں گزرتا تھا اور پھل وغیرہ لانا اور باہر کے دوسرے کام میرے سپرد تھے۔ خدا خدا کر کے کئی مہینہ کے بعد منظور چچا کو صحت نصیب ہوئی۔ اس وقت تک بارہ بنکی اسکول میں ششماہی امتحان ہو چکا تھا جس میں مَیں نہ بیٹھ سکا تھا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ چچا تنہا بارہ بنکی جائیں گے اور چچی (جن کے یہاں ولادت ہونے والی تھی)، میں اور پھوپھی سب لکھنؤ ہی میں رہیں۔ چنانچہ یہ بھی طے ہوا کہ بارہ بنکی اسکول سے جہاں میں نے صرف پینتیس میٹنگ پڑھا تھا، میرا نام کٹوا کر لکھنؤ میں لکھوا دیا جائے۔ جبلی کالج میں بیچ سشن میں نویں جماعت میں داخلہ ناممکن تھا۔ حسین آباد گورنمنٹ اسکول میں البتہ میرا داخلہ ہو گیا۔ اس اسکول میں بھی مجھے با استعداد اساتذہ سے سابقہ پڑا۔ ریاضی (**Mathematics**) کے استاد جوشی صاحب تھے۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ بے حد عمدہ تھا۔ جو کچھ بتا دیتے تھے وہ دل میں اتر جاتا تھا۔ انگریزی بھارگوا صاحب پڑھاتے تھے جو کلاس ٹیچر بھی تھے۔ اردو مولانا مجاور حسین صاحب پڑھاتے تھے جو بعد کو ہومیو پیتھک معالج کی حیثیت سے کافی مشہور ہوئے۔ فارسی کے استاد مولانا فواد حسین صاحب زید پوری تھے اور تاریخ تقی احمد صاحب کاکوروی پڑھاتے تھے جو اس زمانے میں خود غازی الدین حیدر یا نصیر الدین حیدر پر پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ طلبا کا معیار البتہ اتنا اچھا نہ تھا جتنا جوبلی کالج میں تھا۔ مجھ سے بہتر طلبا میں صرف مجیب الدین قدوائی

صاحب تھے جو میرے پھوپھا کے بھانجے تھے اور جن کا داخلہ نویں جماعت میں مڈل اسکول امتحان پاس کرنے کے بعد ہوا تھا۔ عمر میں وہ مجھ سے تقریباً تین چار سال بڑے تھے۔ نویں جماعت کا امتحان پاس کرنے میں کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا۔ دسویں جماعت میں البتہ یہ سوال اٹھا کہ نویں درجے میں حاضری بہت کم ہونے کی وجہ سے کیا مجھے ہائی اسکول امتحان میں بیٹھنے کی اجازت بھی ملے گی یا نہیں۔ ان حالات میں اور کسی سرپرست کے نہ ہونے کی وجہ سے اس خیال سے کہ امتحان میں تو بیٹھنا ہی نہیں ہے، میں نے پڑھائی میں ڈھیل ڈال دی۔ اس وقت حسین آباد اسکول کے ہیڈ ماسٹر امیر احمد صاحب تھے۔ انھیں اندازہ تھا کہ اگر میں امتحان میں بیٹھوں گا تو بہ آسانی امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوں گا۔ انھوں نے بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کو حاضری کی کمی کو معاف کرنے کے لیے لکھا اور امتحان سے چند روز پہلے مجھے ہائی اسکول امتحان میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ تیاری جیسی ہونی چاہیے تھی نہ تھی۔ میری ہمیشہ سے کمزوری رہی ہے کہ اگر کسی بھی امتحان کی تیاری میں کچھ کمی رہ جاتی تو ذہنی انتشار پیدا ہو جاتا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی شدید عصباتیت (Nervousness) میں مبتلا تھا لیکن اساتذہ کی ہمّت افزائی سے امتحان میں بیٹھ گیا اور امتیازی حیثیت سے سکنڈ ڈویژن پاس بھی ہو گیا۔

دوسرے سشن میں جوبلی کالج میں مجھے گیارہویں درجے میں داخل کر دیا گیا لیکن اب جوبلی کالج وہ نہ تھا جس میں مَیں نے پہلے پڑھا تھا۔ طلبا تو بہترین لیے جاتے تھے لیکن پڑھائی ویسی نہ رہ گئی تھی جیسی پہلے تھی۔ میرے ساتھ گیارہویں جماعت میں داخلہ پانے والوں میں سبھی فرسٹ ڈویژن تھے اور ان میں تین یعنی جمیل احمد، جلال احمد اور مولانا فضل عباس پوزیشن ہولڈر بھی تھے۔ اساتذہ میں پی۔ کے۔ بنرجی صاحب اکنامکس پڑھاتے تھے لیکن ان کے کلاس صرف نوٹس لکھانے تک محدود تھے۔ انگریزی عبدالحیٔ صاحب پڑھاتے تھے۔ لیکن انھیں

پڑھانے میں کوئی دلچسپی نہ تھی اس لیے کہ موصوف کا کچھ اسباب کے سبب پرنسپل کی پوسٹ سے تنزل کردیا گیا تھا اور وہ محض وقت گزار رہے تھے۔ حامد اللہ افسر صاحب اُردو پڑھاتے تھے لیکن وہ عموماً کلاس ختم ہوتے وقت تشریف لاتے تھے اور فائنل امتحان سے کچھ پہلے سرسری طور سے نظمیں یا اسباق پڑھتے جاتے تھے، یہ بتاتے ہوئے کہ سب صاف ہے۔ فارسی کے استاذ مولانا حفاظت علی صاحب فاروقی تھے جو واقعی دل لگا کر پڑھاتے تھے اور طلبا میں ادبی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی طرح جیسے ابتدائی درجوں میں مولانا اختر علی تلہری صاحب کوشش کیا کرتے تھے۔ مولانا کی سرپرستی میں انجمن فارسی بھی بنی تھی جس میں فارسی سے متعلق فارسی زبان ہی میں گفتگو کرنے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ مجھے اس انجمن کا سکریٹری بنایا گیا تھا۔ مجھے مولانا سے بہرحال صرف ایک ہی سال فیض حاصل کرنے کا موقع ملا اور اس کے بعد وہ ریٹائر ہوگئے۔ ان کی جگہ ایک نئے ٹیچر عثمانی صاحب مقرر ہوئے۔ مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ موصوف نہ کچھ جانتے تھے اور نہ پڑھا سکتے تھے۔ بہرحال جوبلی کالج میں وہ فارسی کا آخری سال تھا۔ اس کے بعد یہ مضمون ہی ختم ہوگیا۔

سطورِ بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے پیدا شدہ ماحول میں کچی عمر کے نوجوانوں کے لیے پڑھائی میں دلچسپی میں کمی کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ میرے پرانے ساتھی جن سے پڑھائی کے معاملے میں میرا مقابلہ رہا کرتا تھا چھوٹ چکے تھے، اس لیے کہ ان میں سے زیادہ تر سائنس کے سکشنوں میں جا چکے تھے پھر بھی کچھ ایسے تھے جن سے پڑھائی کے معاملے میں مقابلہ ہوسکتا تھا۔ وسیم عون جعفری ایک ایسے ہی طالب علم تھے۔ ان کے والد I.G. Prisons تھے۔ وسیم کا داخلہ نویں درجے میں میرے جوبلی کالج چھوڑنے کے بعد ہوا تھا۔ ان کی انگریزی مجھ سے بہتر تھی لیکن فارسی اور دوسرے مضامین میں میرے نمبر زیادہ رہتے تھے۔ آزادیِ ہند کے بعد

وہ .I.A.S کے پہلے بیچ میں منتخب ہو گئے تھے لیکن پاکستان چلے گئے اور وہاں بھی پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروس میں آ گئے۔ مسز بھٹو کی وزارت کے سلسلے میں ایڈوائزر کی حیثیت سے ان کا نام اخباروں میں آیا کرتا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے دوسرے قابلِ ذکر ساتھی جمیل احمد صدیقی بہر اچی تھے۔ ہائی اسکول میں تیسری پوزیشن پا کر جوبلی کالج میں داخل ہوئے تھے لیکن یہاں مشتاق نامی ایک انتہائی غلط اور مجرمانہ ذہنیت کے طالب علم کی صحبت میں پڑ گئے اور ہم سب کا خیال کہ برباد ہو گئے لیکن انٹرمیڈیٹ فائنل کے چند مہینے پہلے انھیں ہوش آ گیا اور انٹرمیڈیٹ میں بھی انھوں نے پوزیشن حاصل کر لی، جس میں ریاضی اور عربی کو جو اُن کے مضامین تھے، کافی دخل تھا۔ جمیل نے پیرس یونیورسٹی سے Mathematics میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ پہلے کشمیر یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر رہے، پھر علی گڑھ آ گئے اور وہاں سے کنیڈا چلے گئے جہاں وفات پا چکے ہیں۔ انھیں چند ذہین طلبا میں مولانا فضل عباس بھی تھے۔ مولانا انتہائی کھُرّے مزاج کے صاحبزادے تھے اور پڑھنے کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ اس زمانے میں لازمی کھیل (Compulsory Games) ہوا کرتے تھے جن میں ہر طالب علم کو حصّہ لینا ضروری ہوتا تھا۔ مولانا کو بھی حصّہ لینا پڑتا تھا لیکن اس طرح کہ شیروانی پہنے چھتری ہاتھ میں لیے فیلڈ میں گھوما کرتے تھے۔ مولانا انتہائی غیر سوشل تھے اور کسی کلاس فیلو سے بھی ان کی دوستی نہ تھی۔ نہیں کہہ سکتا کہ جوبلی کالج چھوڑنے کے بعد مولانا کہاں گئے۔ جلال بھی ایک فرسٹ ڈویژن طالبعلم تھے، لیکن پتا نہیں کہاں گئے۔ کلاس کے ساتھیوں کے علاوہ بھی کچھ طالب علم ایسے تھے جن کا ذکر کرنا مناسب ہے۔ علی ظہیر صاحب کے دونوں بیٹے جعفر ظہیر اور کاظم ظہیر مجھ سے ایک کلاس آگے اور ایک کلاس پیچھے تھے۔ جعفر ظہیر ایر فورس میں کمانڈر ہو گئے تھے اور کاظم یو۔ این۔ او چلے گئے۔ کاظم ظہیر صاحب اب شیعہ ڈگری کالج کے پریسڈنٹ ہیں اور ان سے ملاقات

ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح دوسرے دو بھائی قمر رضا اور حسن رضا بھی ایک کلاس آگے اور پیچھے تھے۔ قمر رضا پاکستان میں غالباً ڈی۔ آئی۔ جی پولیس ہو گئے تھے۔ تیسرے دو بھائی بشن کمار اور کرشن کمار تھے۔ بشن ایک سال آگے تھے اور بہت ذہین طالب علم تھے اور کرشن کمار ایک سال پیچھے تھے۔ مہدی مسعود کے والد ایک بڑے افسر تھے۔ وہ ہمارے کلاس سے دو سال پیچھے تھے۔ بنگلہ دیش بننے کے وقت وہ کلکتہ میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر ہو گئے تھے۔ طالب علمی کے ابتدائی دور میں نہیں کہا جا سکتا کہ کون طالب علم کہاں پہنچے گا۔ چوتھے درجے سے میرا ایک کلاس فیلو جگن ناتھ تھا جو کلاس میں فرسٹ آتا تھا۔ ایک دوسرے صاحبزادے مادھوری سرن تھے جو بالکل ہی معمولی طالب علم تھے لیکن آئندہ زندگی میں ریلوے آفس میں مادھوری سرن سکشن سپرنڈنٹ تھے اور جگن ناتھ ان کی ماتحتی میں ایک کلرک۔

جوبلی کالج کے اس دوسرے دور میں میری تعلیمی زندگی وہ نہ رہ گئی جو پہلے دور میں تھی۔ اب میرا گھر پر کوئی سرپرست نہ تھا۔ نئے ساتھیوں میں اگرچہ کوئی خراب نہ تھا لیکن ان میں تعلیم سے اسی حد تک دلچسپی لینے والے تھے کہ پاس ہوتے رہیں۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد میری شعر گوئی کی ابتدائی ہو گئی تھی اور میرے دوستوں کا گروہ ہمت افزائی کرتا تھا۔ گھر میں پڑھنے کے بجائے اب اپنے عزیز دوست سید محمد سعید کے والد حکیم صاحب عالم صاحب کے مطب کے اوپری کمرے ہمارا تعلیمی مرکز تھا۔ یہاں پڑھائی کم ہوتی تھی اور یار باشی زیادہ۔ سعید اور دوسرے چند دوستوں کو تاش کھیلنے کا چسکا لگ گیا تھا اور شہر کے دوسرے حصّوں سے بھی اس کے شوقین جمع ہو جایا کرتے تھے۔ اس ماحول میں میری پڑھائی کا کیا حال ہو سکتا تھا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مجھے تاش سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جیب میں اتنے پیسے ہی نہ تھے کہ فلش کھیل سکتا۔ شاعری کے علاوہ اسپورٹس اور ورزش وغیرہ میں میری دلچسپی

بڑھ گئی تھی۔ میں ہاکی اور فٹ بال کا ایک اوسط درجے کا کھلاڑی بن گیا۔ جسم سازی بطور ایک فن شروع ہو چکی تھی۔ اس کا ایک مرکز مسلم کلب تھا جو حسین گنج کے قریب اس مکان میں قائم تھا جس میں آج اطہر نبی مقیم ہیں۔ ولی صاحب اس جمنیزیم کی روحِ رواں تھے۔ وہ بے حد شاندار جسم کے مالک تھے۔ بعد میں جب پتا چلا کہ اطہر نبی ان کے بھتیجے ہیں تو دونوں کی جسمانی ساخت کے تضاد پر تعجب ہوا۔ میری جسم سازی کی ابتدا اسی مسلم کلب سے ہوئی۔ بعد کو میرا اپنا مکان ہی میرا جمنیزیم بن گیا۔ اسی زمانے میں میری پیراکی کی بھی ابتدا ہوئی۔ ہمارے ایک کلاس فیلو مشیر عباس میرے مکان کے قریب ہی رہتے تھے۔ وہ ایک صاحب سے جو عرف عام میں سید صاحب کہلاتے تھے اور امام بارہ غفران مآب میں رہتے تھے، شناوری سیکھتے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی سید صاحب کا شاگرد بنوا دیا۔ یہ دور یعنی ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کا زمانہ لکھنؤ میں شیعہ سنی منافرت کے شباب کا دور تھا۔ دونوں گروہوں کے ایجی ٹیشن شکلا گھاٹ کے بالکل قریب ہی چل رہے تھے جہاں سید صاحب پیراکی سکھاتے تھے اور شہر میں شیعہ سنی فساد ہو جانا ایک عام بات تھی۔ (افسوسناک بات یہ تھی کہ شیعوں کے تبرّا ایجی ٹیشن میں علی ظہیر صاحب کے ایسے تعلیم یافتہ سنجیدہ حضرات بھی عملاً شریک تھے)۔ ایسے ماحول میں ایک سنی کی ایک شیعہ سے پیراکی کا ایسا خطرناک فن سیکھنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ میں نے پیراکی سیکھنے کی بات بالکل خفیہ رکھی لیکن جوں ہی لوگوں کو معلوم ہوتا گیا مجھے سمجھایا جاتا رہا گیا کہ کسی روز دریا جا کر واپس نہ آؤں گا۔ لکڑی، بانک، کشتی، شناوری، رقص و نغمہ وغیرہ فنون سے دور رہنے والوں کو اس کا علم ہی نہیں کہ ان فنون کے جاننے والوں میں استاد شاگرد کا کیا رشتہ ہوتا ہے۔ ان تمام فنون میں شاگرد بیٹے سے زیادہ عزیز ہوتا ہے خواہ اس کا مذہب اور سوشل مرتبہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ لکھنؤ کے مایہ ناز پہلوان صادق ایک ہندو استاد کے شاگرد تھے جنھوں نے اپنا اکھاڑہ ان کے سپرد کر دیا تھا اور خود صادق پہلوان کے

جانشین مسلمان شاگردوں کی موجودگی میں ایک ہندو شاگرد سنارا پہلوان ہوئے جواُن کے اکھاڑے کو قائم کیے رہے۔ میرے شاگرد ہونے سے پہلے سید صاحب کے شاگرد عموماً نچلے طبقے کے شیعہ حضرات تھے۔ میرے شاگرد ہونے کے بعد گھاٹ پر پڑھے لکھے اور ہر مذہب و ملّت کے نوجوانوں کا مجمع ہونے لگا۔ حتیٰ کہ چوک کے علاقہ کے کچھ ہندو نوجوان جو ابتدا میں ہم لوگوں پر فقرہ بازی کیا کرتے تھے، وہ بھی سید صاحب کے شاگرد ہو گئے۔ ان میں رام چندر جو ایک بڑے تاجر تھے۔ غالباً ابھی حیات ہیں۔ میڈیکل کالج کے طلبا میں رگھوبیر سنگھ سیٹھ میرے عزیز دوست تھے اور بعد کو حلق، ناک، کان کے امراض کے ماہر (E.N.T. Specialist) کی حیثیت سے بلرام پور اسپتال میں ملازم تھے۔ کافی عرصہ ہوا ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ سید صاحب نے (جن کا اصل نام سید کاظم حسین تھا) آخری زمانے میں گھاٹ میرے سپرد کیا تھا لیکن اس وقت میرے پاس اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتا۔ متذکرہ تمام دلچسپیوں اور دوستوں کی موجودگی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پڑھنے کے لیے میرے پاس کتنا وقت بچتا ہوگا۔ پھر بھی میں نے اپنی پوزیشن بچانے کی کوشش کی۔ میرا نروس ہونا شروع ہی سے میری ایک کمزوری تھی اور امتحان کے لیے مجھے اس وقت تک اطمینان نہ ہوتا تھا جب تک پورے کورس پر مجھے عبور نہ ہو جاتا۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں ایسا نہ ہو سکا۔ اکنامکس کے دونوں پرچوں میں ایک ہفتے کا گیپ ملا تھا۔ میرے انھیں تعلیم کے معاملے میں غیر سنجیدہ ساتھیوں نے پورے کورس کو اس عرصے میں روائز کر لینا کافی سمجھا۔ ایسا ہو بھی سکتا تھا لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ گیپ کے اس عرصے کے بڑے حصّے کو بھی ان حضرات نے تاش کی نذر کر دیا اور خود مجھے بھی میری مرضی کے مطابق تیار نہ ہونے دیا۔ اسی عرصہ میں والد درد گردہ میں مبتلا ہو کر لکھنؤ آ گئے۔ ان حالات میں اکنامکس کا پہلا پرچہ میری مرضی کے مطابق نہ ہوا جس کا اثر دوسرے پرچے پر بھی پڑا۔ مجھے یہ

خوف ستانے لگا کہ اگر ڈویژن خراب ہوگیا تو آئندہ کیا ہوگا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈویژن خراب ہونے سے ایک سال ضائع کردینا بہتر ہے۔ میں نے بقیہ فارسی کے دونوں پرچوں کو چھوڑ دیا اور اس طرح وہ سال ضائع کردیا۔ لیکن ایک لحاظ سے یہ سودا مہنگا پڑا۔ جوبلی کالج سے اس سال فارسی ختم کردی گئی جس کی وجہ سے آئندہ سال اس کالج میں مجھے پڑھنا ممکن نہ رہ گیا۔

میرے دوبارہ جوبلی کالج میں پڑھنے کا یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم دور تھا جس پر گذشتہ باب پنجم میں روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ جنگ عظیم کے شروع ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ سیاسی انتہا پسند گروہ نے سبھاش چندر بوس کی قیادت میں آزادی کے لیے ہتھیار اٹھا لیے اور سبھاش بابو افغانستان ہوتے ہوئے جرمنی پہنچ گئے اور وہاں سے بھی روانہ ہوکر جاپان چلے آئے۔ اس وقت جاپانی فوجیں انڈو چائنا کے علاقے کو روندتی ہوئیں برما تک پہنچ گئی تھیں اور اتحادی فوجیں جن میں ہندوستانی سپاہی بھی شامل تھے ہتھیار ڈال رہی تھیں۔ جاپانی حکومت کی ایما پر ان ہتھیار ڈالنے والے ہندوستانی سپاہیوں اور ان کے افسروں پر مشتمل سبھاس بابو کے زیرِ کمان آزادی ہند فوج تشکیل پا گئی جس کا مقصد ہندوستان سے انگریزوں کو نکال باہر کرنا تھا۔ یہ ہندوستانی فوج ہر قسم کے مذہبی تعصّبات سے بالاتر تھی۔ اس میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی اور سکھ بھی (اور ممکن ہے کہ ہندوستانی عیسائی بھی ہوں)۔ جاپان کی فتوحات کے رُک جانے سے یہ ہندوستانی فوج کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکی۔ جیسا کہ لکھا جاچکا ہے، ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ سے کانگریس اور مسلم لیگ میں جو قربت ہوئی تھی وہ بھی ۱۹۳۹ء میں کانگریسی حکومتوں کے خاتمے پر جناح صاحب کے یومِ نجات منانے سے ختم ہوچکی تھی اور اب دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی مخالف تھیں اور ان دونوں پارٹیوں میں اندرونی رسا کشی چل رہی ہے۔ پنجاب میں سکندر حیات خاں اور بنگال میں

فضل حق مسلم لیگ سے نکالے جا چکے تھے اور اس کے بعد مسلم لیگ تنہا جناح صاحب اور ان کے حاشیہ نشینوں کے گروہ کا نام تھا۔ کانگریس کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ سبھاش چندر بوس اس سے پہلے ہی الگ ہو چکے تھے اور ان کے پیروؤں اور ہم خیالوں نے فارورڈ بلاک کی تشکیل کی تھی۔ اس وقت تک نوجوان کمیونسٹ اور سوشلسٹ جن میں خود پنڈت نہرو کا بھی شمار تھا، کانگریس میں شامل تھے، لیکن روس پر جرمنی کے حملے سے صورتِ حال بدل گئی۔ کمیونسٹ گروپ کے خیال میں استعماریت کے خلاف لڑائی عوامی جنگ میں بدل گئی۔ کانگریس کی پالیسی جنگ کے بعد مکمل آزادی کے وعدے کے بغیر جنگی کوششوں کی مخالفت تھی اور کمیونسٹ پارٹی ہر حال میں روس کے اتحادی انگریزوں کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر اشرف اور دوسرے کمیونسٹ لیڈروں نے اپنی اس پالیسی کے جواز میں بہت کچھ لکھا۔ انجامِ کار کمیونسٹ گروپ کانگریس سے الگ ہو گیا۔ اس نئی پارٹی کے ممبروں میں ایک نئے مذہبی کا سا جوش تھا۔ مختلف مقامات پر مارکس اور لینن کے اصولوں سے نوجوانوں کو باخبر کرنے کے لیے ٹریننگ اسکول کھولے گئے۔ لکھنؤ میں سجاد ظہیر اور ان کی بیگم کے علاوہ ڈاکٹر رشید جہاں اس پارٹی کے سرگرم رکن تھے اور یہاں کمیونسٹ ٹریننگ سنٹر کی روحِ رواں یہی ڈاکٹر رشید جہاں تھیں۔ مسلمان نوجوانوں، خصوصاً مدرسوں کے طلبا کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے سب سے موثر حربہ اسلام اور کمیونزم کے مساواتی نظریات تھے۔ خود میرے خاندان کے بہت سے نوجوان اس تحریک سے متاثر ہوئے جن میں رضا انصاری صاحب بھی شامل تھے جو بعد کو مفتی فرنگی محل بن گئے۔ برادرم جلال الدین متین بھی کمیونزم کی ٹریننگ لینے والوں میں پیش پیش تھے۔ جوبلی کالج کے طلبا کا ایک گروہ بھی کمیونسٹ تحریک سے متاثر تھا جس میں میرے دوست پرس رام کوہلی، ستیش چندر اور شری مالی شامل تھے۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل والی اصل کانگریس پارٹی کی شرائط جب برٹش سرکار قبول نہ کر سکی تو ۱۹۴۲ء میں اس

پارٹی نے ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک شروع کردی۔ کانگریس کے تمام لیڈر گرفتار کر لیے گئے اور ملک بھر میں انگریزی راج کے خلاف پرامن اور جارحانہ انداز میں بھی مظاہرے ہونے لگے۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑی جانے لگیں۔ اسٹیشن اور سرکاری عمارتیں جلائی جانے لگیں۔ اسکول کالج بند ہو گئے۔ اس وقت تک دہشت گردی کی اصطلاح ایجاد نہیں ہوئی تھی اور نہ جارج بش کے ایسے پریسیڈنٹ تھے، ورنہ اس جنگِ آزادی کے متوالوں کو بھی دہشت گرد کا نام دیا جاتا، اسی طرح جیسے آج افغانستان اور عراق میں آزادی خواہوں کو دُنیا بھر میں بدنام کیا جا رہا ہے۔ اس سیاسی اتار چڑھاؤ کا ذکر پانچویں باب میں کچھ تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔

کمیونسٹ تحریک کے زیرِ اثر ادب میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے نظریہ تو زیرِ بحث تھے ہی۔ ادب برائے زندگی کے نظریہ نے ترقی پسند تحریک کا نیا نام پایا اور ادب میں ترقی پسندی کو صرف کمیونسٹ نظریوں کی تبلیغ کا ہم معنی قرار دے دیا گیا۔ اچھے اچھے مصنف فنکار سے صرف کمیونسٹ مبلغ بن کر رہ گئے۔ ایسے ادب کی مثال میں عصمت چغتائی کا افسانہ ''سرخ چیونٹے'' پیش کیا جا سکتا ہے۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۴۲ء کے سشن کے خاتمے کے ساتھ جوبلی انٹر کالج میں فارسی ختم ہو گئی اور میرے سامنے دو ہی راستے رہ گئے۔ یا تو فارسی چھوڑ کر کوئی دوسرا مضمون لیا جائے یا گورنمنٹ جوبلی کالج کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کالج پسند کیا جائے جہاں فارسی پڑھائی جاتی ہو۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور شیعہ کالج کا طالب علم بن گیا۔ شیعہ کالج میں جوبلی کالج کی طرح بہت اچھا تعلیمی کردار رکھنے والے اساتذہ نہ تھے اور نہ اتنے اچھے اور منتخب طلبا تھے جیسے جوبلی کالج میں ہوا کرتے تھے، لیکن اس پرائیوٹ کالج کے استاد اس گورنمنٹ کالج کے استادوں کے مقابلے میں زیادہ محنت سے پڑھاتے تھے۔ جوبلی کالج میں فرسٹ ڈویژن طلبا لیے جاتے تھے

اوران میں سے زیادہ تر سکنڈ ڈویژن پا کر نکلتے تھے۔ شیعہ کالج میں تھرڈ کلاس طلبا آتے تھے اور عموماً سکنڈ کلاس پا کر نکلتے تھے۔ شیعہ کالج کے اساتذہ میں شہنشاہ حسین موسوی صاحب بھی تھے جنھوں نے چار سال قبل جب میں جوبلی کالج میں تھا بحیثیت عارضی استاد کے مجھے پڑھایا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں بیخود موہانی صاحب کے انتقال کے بعد بحیثیت اُردو اور فارسی لکچرار ان کا شیعہ کالج میں تقرر ہو گیا تھا۔ شہنشاہ حسین صاحب استاد محترم یوسف حسین موسوی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے اور انھیں کے مشورے سے میں نے بی۔ اے میں فارسی کو بحیثیت ایک مضمون اختیار کیا تھا۔ انگریزی مرزا عاشق حسین صاحب پڑھاتے تھے۔ اگرچہ اسی سال انگریزی پڑھانے کے لیے احسن فاروقی صاحب کا تقرر ہو چکا تھا (یہاں یہ ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ اس وقت تک شیعہ کالج میں کسی سنی ٹیچر کا تقرر نہ ہوتا تھا اور نہ کسی سنی کی فیس معاف ہوتی تھی۔ احسن فاروقی صاحب مذہباً شیعہ تھے۔ سنی استادوں کا تقرر بہت بعد کی بات ہے۔ میرے زمانے میں تقوی صاحب پرنسپل تھے اور انھوں نے ہی پہلی مرتبہ ایک سنی طالب علم مصطفیٰ کامل کو فری شپ دے کر روایت شکنی کی)۔ شیعہ کالج کے ایک سال کے قیام کے دوران مجھے کچھ بہت ہی مخلص دوست مثلاً آغا شفاعت قاسم قزلباش، ان کے چھوٹے بھائی ریاست قاسم، نصیرالدین، گوریشور دیال بھٹناگر وغیرہ ملے، جن کا خلوص و محبت کا رشتہ زندگی کی آخری سانس تک قائم رہا۔ ان کے علاوہ بدرالحسن (جو بعد کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے عربی و فارسی شعبہ کے صدر ہوئے) متّقی حسین زیدی، عابد حسین، دیال داس اور باقر حسین (جو عرفِ عام میں ہاکی کھیلتے وقت اکثر بال کو مِس کر جانے کی وجہ سے باقر اندھے کہلاتے تھے) وغیرہ میرے دوسرے عزیز دوست تھے جن سے تادمِ آخر رشتہ اخوت قائم رہا۔ شفاعت قاسم زبردست ڈیل ڈول کے مالک تھے اور اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح محکمۂ پولیس میں ملازم ہوئے۔ ان کے بھائی

ریاست قاسم محکمۂ نقل وحمل (Transport Deptt.) میں اسٹیشن انچارج تھے۔ گوریشور دیال بھٹنا گر بنارس یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ میں ریڈرر ہے۔ دیال داس بھی تاریخ کے طالب علم رہے اور National archives میں کسی اچھے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ بدرالحسن عابدی، جیسا لکھا جاچکا ہے، ہندو یونیورسٹی سے رٹائر ہوکر بنارس ہی میں مستقل طور سے مقیم ہوگئے ہیں۔ متذکرہ تمام دوستوں میں اب صرف وہ اور خورشید حیدر کاظمی زندہ ہیں خدا ان کی عمر دراز کرے۔
شیعہ کالج میں ان طالب علم دوستوں کے علاوہ اساتذہ میں تین بہت اچھے دوست ملے۔ ان میں ایک نوشاہ حسین صاحب تھے جو گیمس کے بھی انچارج تھے۔ میں شیعہ کالج کی ہاکی اور فٹ بال دونوں ٹیموں میں منتخب ہوگیا تھا اور اس طرح میری اور نوشاہ حسین صاحب کی دوستی کا آغاز ہوا۔ رضی صاحب لائبریرین تھے اور شہر کے مشہور کلب ایم۔ وائی۔ اے میں آفاق صاحب کے ساتھ رضی صاحب بھی مجھے لے جانے کے ذمہ دار تھے۔ تیسرے استاد احسن فاروقی صاحب تھے جو میرے مکان کے قریب ہی ایک زمانے میں رہتے تھے۔ احسن صاحب استاد انگریزی کے لیکن ادیب اُردو کے تھے۔ وہ شیعہ کالج میگزین میں ''محراب'' کے ایڈیٹر تھے اور انھیں کے اصرار پر میں نے محراب میں شائع ہونے کے لیے پہلی مرتبہ ایک غزل دی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں۔

آئی نظر حقیقت کون ومکاں مجھے	لائی مری حیات کہاں سے کہاں مجھے
سمجھیں نہ مجھ کو اہل سفر ناتواں مجھے	لیتی چلے کی خود کشش کارواں مجھے
ہمدم! تسلیوں سے تو بڑھتا ہے اور غم	رہنے دے میرے حال پہ او مہرباں مجھے
ہر چند ہے شدائد دوزخ کا سامنا	پھر بھی بہشت ہے مرا ہندوستان مجھے

ہندوستان چھوڑو (Quit India) تحریک کے تحت ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سخت خلفشار کا شکار رہی اور طلباء کے جلوس پر اکثر گولیاں بھی چلیں اور تقریباً پورے سال یہ یونیورسٹی بند

رہی۔۱۹۴۳ء میں میرا بی۔اے کے پہلے سال میں داخلہ ہوا۔اس وقت یونیورسٹی پر امن ہو چکی تھی۔داخلے کے لیے میں اور میرے عزیز دوست آغا شفاعت قاسم قزلباش ساتھ ساتھ یونیورسٹی گئے اور ہمارا پہلا سابقہ جن صاحب سے پڑا وہ امتحانات انچارج رضوی صاحب تھے۔(آج کے برخلاف ۱۹۴۳ء میں Examination Section صرف دو اشخاص رضوی صاحب اور ان کے اسسٹنٹ اعجاز حسین صاحب پر مشتمل تھا)۔رضوی صاحب کی شکل وصورت اور حلیہ ایسا تھا جس کو دیکھ کر ہنسی آ جائے۔جب گفتگو کی نوبت آئی تو اور زیادہ دلچسپ ثابت ہوئے۔اس وقت کی یونیورسٹی آج کی یونیورسٹی نہ تھی۔تین مہینہ کا سشن ہوا کرتا تھا اور ہر سشن کی فیس چھتیس روپیہ ہوتی تھی اور غریب طلبا کو اس میں بھی Concession مل جایا کرتا تھا۔یونیورسٹی میں نظام کی سختی سے پابندی ہوتی تھی۔یونیورسٹی کھلتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ کس کس تاریخ کو فیس داخل کرنا ہوتی تھی۔اسی طرح پراس پکٹس میں ہی وہ تاریخیں دی ہوتی تھیں جن میں امتحان کے فارم داخل ہوتے تھے۔امتحانوں کی تاریخیں اور یونیورسٹی بند ہونے اور کھلنے کی تاریخیں بھی پراس پکٹس میں دی ہوتی تھیں اور ان پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ ہر سال باقاعدہ کانوکیشن ہوتا تھا اور اسی میں ہر شخص کو ڈگری ملتی تھی خواہ وہ بی۔اے کی ہو یا پی۔ایچ۔ڈی کی۔

اپنے ایک عجیب خیال کے تحت جن مضامین میں میری واقعی دلچسپی ہوتی تھی انھیں کالج اور یونیورسٹی میں اختیار نہیں کرتا تھا۔ ہسٹری میں مجھے بے حد دلچسپی تھی۔ ہائی اسکول کے بعد ہی میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔اسی طرح اردو سے مجھے عشق تھا لیکن انٹرمیڈیٹ کے بعد میں نے اسے بھی چھوڑ دیا۔یہ اس خیال کے تحت تھا کہ یہ وہ مضامین ہیں جو مجھے کبھی نہ چھوڑیں گے اس لیے یونیورسٹی میں ان کے بجائے کوئی دوسرا مضمون کیوں نہ پڑھا جائے۔عملی زندگی میں ہوا بھی ایسا ہی۔ ہسٹری مجھ سے پوری زندگی نہ چھوٹی اور وہ صرف ہندوستان کے کسی پیریڈ تک

محدود نہ رہی۔ انڈین ہسٹری میں قدیم سے لے کر جدید عہد کی تاریخ میرے گہرے مطالعہ میں رہی اس لیے کہ ان تینوں ادوار کا ایک تسلسل ہے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے پڑوسی مسلم ممالک کی تاریخ جاننا لازمی ہوتا ہے اور اس میں مراکش اور اسپین سے لے کر ایران، ترکستان اور منگولیا تک کی تاریخ جاننا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ فارسی ادبیات کی تعلیم کے سلسلے میں بھی ان علاقوں کا جغرافیہ اور تاریخ جاننا ضروری ہوتا ہے جہاں فارسی بولی جاتی ہے۔ انگریزی دور (British Period) کی ہسٹری کے سلسلے میں انگلینڈ اور کچھ حد تک فرانس جرمنی اور اسپین کی تاریخ کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہائی اسکول میں انڈین ہسٹری کے ساتھ ساتھ انگلینڈ کی ہسٹری بھی پڑھائی جاتی تھی۔ انگلینڈ کی تاریخ اور اس کے دیگر یوروپین ممالک سے تعلقات کے حالات کچھ اتنے دلچسپ معلوم ہوتے ہیں کہ پورے یورپ کی ہسٹری پڑھے بغیر سکون نہیں ملتا۔ تاریخ کی یہی دلکشی تھی جس نے زندگی بھر اس کا مطالعہ کرنے کے لیے مجھے مجبور کیا، خواہ وہ ہندوستان کی تاریخ ہو یا ایران کی یا انگلینڈ اور یورپ کی یا پوری اسلامی دنیا کی (بشمول اسپین) یا پوری دُنیا کی۔ اس سلسلے میں ایچ۔ جی ولس کی دُنیا کی تاریخ کا مطالعہ بھی کیا جو اہانت رسولؐ کے لیے بدنام کتاب ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت علیؓ کے متعلق غلط باتیں ملتی ہیں لیکن یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ مصنف کو صحیح اطلاعات نہ ہونے کی وجہ سے ہیں نہ کہ منافرت کی وجہ سے۔ اردو کا بھی یہی حال تھا۔ ہائی اسکول تک میں تمام اردو کلاسیکی ادب کا مطالعہ کر چکا تھا۔ باغ و بہار، فسانۂ عجائب، فسانۂ آزاد، رانی کیتکی کی کہانی، طلسم ہوشربا سب تفریحاً میری نظر سے گزر چکی تھیں۔ یہی حال اردو نظم کا بھی تھا۔ آٹھویں کلاس میں مولانا اختر علی تلہری صاحب نے بیت بازی کے سلسلے میں شعرا کے دواوین کے مطالعہ کا ایسا چسکا ڈال دیا تھا کہ عمر بھر اس سے نہ بچ سکا۔ امیر مینائی اور داغ کے دواوین آٹھویں ہی درجے میں زیرِ مطالعہ

آچکے تھے۔ میرتقی میرؔ کے پورے کلیات کا مطالعہ اس وقت کیا جب میں نویں جماعت میں تھا اور اس وقت کے اپنے معیار کے مطابق اس کا انتخاب بھی کیا تھا۔ کلامِ میرؔ کی طرف راغب کرنے والے حسین آباد ہائی اسکول میں عمر میں مجھ سے کافی بڑے ایک ساتھی باقر حسین تھے۔ بی۔ اے میں مَیں نے انگریزی، فارسی اور اکنامکس کو اپنے لیے منتخب کیا۔ اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں اکنامکس کو ہندوستان بھر کی تمام یونیورسٹیوں میں سب سے مشکل بنادیا گیا تھا۔ بی۔ اے میں اصل اکنامکس کے مضامین کے علاوہ علم انسان شناسی (Anthropology) کو بھی شامل کرلیا گیا تھا جب کہ اس کا اقتصادیات سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ڈاکٹر ڈی۔ این۔ مجمدار (D.N. Majumdar) کو جو اینتھروپالوجی میں سند کی حیثیت رکھتے تھے یونیورسٹی کھونا نہیں چاہتی تھی۔ انھیں اکنامکس ڈپارٹمنٹ میں جگہ دی گئی اور بی۔ اے اور ایم۔ اے میں اینتھروپالوجی کے پیپر شامل ہوگئے۔ ان پرچوں کا معیار ایسا تھا کہ بعد کو جب Anthropology ایک الگ شعبہ کی طرح وجود میں آیا تو اس کو پڑھانے والے وہی اساتذہ تھے جن کے پاس اقتصادیات کی ایم۔ اے کی ڈگری تھی اور اسی کے تحت انھوں نے اینتھروپالوجی پڑھی تھی۔ ایم۔ اے کی منزل پر اکنامکس کے ساتھ ساتھ علم اجتماع (Sociology) بھی پڑھایا جاتا تھا جس کا بھی اقتصادیات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بعد کو ایم۔ اے اقتصادیات میں علم الاعداد (Statistics) کا بھی اضافہ ہوگیا۔ اکنامکس کے لکھنؤ یونیورسٹی میں مشکل ترین مضامین ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایم۔ اے میں ہر دوسرے مضمون کے دو پیریڈ روزانہ یعنی ہفتے میں بارہ پیریڈ اور اکنامکس کے ہفتے میں اُنیس پیریڈ ہوتے تھے۔ سنیچر کو چار اور باقی دنوں میں تین۔ اکنامکس کے مضامین کے ساتھ پڑھائی جانے والی Sociology کا معیار بھی اتنا بلند تھا کہ الگ سوشیالوجی ڈپارٹمنٹ کے وجود میں آنے کے بعد اس کے اساتذہ وہی تھے جن کے پاس

اکنامکس کی ڈگری تھی اور جنھوں نے سوشیالوجی کو اکنامکس کے تحت ہی پڑھا تھا۔ بعد کو سوشیالوجی ڈپارٹمنٹ کی Sociology اور Social Work ڈپارٹمنٹس کی صورت میں تقسیم کے وقت ان دونوں شعبوں کے صدور ڈاکٹر ظفر احمد اور ڈاکٹر مہروترا وہی تھے جن کے پاس اکنامکس کی ڈگریاں تھیں اور جو میرے جونیر رہ چکے تھے۔ اس وقت کا اکنامکس ڈپارٹمنٹ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ یونیورسٹی کے وجود میں آنے کے وقت پہلے وائس چانسلر چکرورتی صاحب نے کلکتہ یونیورسٹی کے بہترین طلبا کو اس یونیورسٹی کے لیے منتخب کیا تھا۔ ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی بحیثیت پروفیسر، مسٹر بھجنگا بھوشن مکرجی بحیثیت ریڈر اور مسٹر ڈی۔ پی۔ مکرجی بحیثیت لکچرر مقرر ہوئے تھے۔ ان تینوں ہی کا اپنی عظمت میں جواب نہ تھا۔ رادھا کمل مکرجی اپنے مضامین میں سند سمجھے جاتے تھے یہی حال دوسرے دو مذکورہ اساتذہ کا تھا۔ بحیثیت استاد کے مجھے بی۔ بی مکرجی صاحب سے بہتر ٹیچر کوئی نہ ملا۔ وہ اقتصادیات کے سب سے زیادہ غیر دلچسپ مضامین پڑھاتے تھے (اقتصادیاتؑ خود ہی ایک غیر دلچسپ مضمون ہے) اور سنیچر کے روز ان کے مسلسل دو پیریڈ ہوتے تھے لیکن ان کے پڑھانے کا انداز اتنا دلچسپ تھا کہ کلاس میں مکمل خاموشی رہتی تھی۔ ڈی۔ پی مکرجی اگرچہ صرف لکچرر تھے لیکن ڈپارٹمنٹ میں وہ سب سے اہم سمجھے جاتے تھے۔ ان کا شمار یونیورسٹی کے دانشمندوں (Intellectuals) میں ہوتا تھا۔ ان کا علم صرف اقتصادیات اور سوشیالوجی تک محدود نہ تھا۔ ادبیات، فائن آرٹس، موسیقی ہر علم میں ان کو دخل تھا۔ ڈی۔ پی مکرجی سے میرا خاص تعلق تھا اس لیے کہ ان کے بیٹے کمار پرساد مکرجی جوبلی کالج میں انٹرمیڈیٹ میں میرے ہمدرس تھے۔ کمار پرساد ابھی بقید حیات ہیں اور کلکتہ میں مقیم ہیں۔ سلی گوڑی کے قیام کے دوران ایک صاحب سے ان کا فون نمبر مل گیا تھا اور پچاس سال کے بعد ہم دونوں کی گفتگو ہوئی تھی۔ اکنامکس ڈپارٹمنٹ میں بعد کو ایم۔ ڈی جوشی اور سکسینہ

صاحبان کا اضافہ ہوا تھا اور بی۔ اے میں ہمیں یہی دونوں حضرات پڑھاتے تھے۔ اکنامکس ڈپارٹمنٹ کے سلسلے میں کچھ اور بھی تحریر کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر رادھا مکر جی اور ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر رادھا کمد صاحبان کا تعلق ہندو مہا سبھا سے تھا۔ (اس وقت تک جن سنگھ وجود میں نہیں آئی تھی)۔ لہٰذا مشہور ہو گیا تھا کہ اکنامکس میں مسلمان پاس ہو ہی نہیں سکتے۔ کچھ اس عام خیال کے تحت اور کچھ اس بات کی وجہ سے کہ وہ ایک بے حد مشکل مضمون تھا، مسلمان طلبا اکنامکس بہت ہی کم لیتے تھے۔ بی۔ اے میں میرے ساتھ صرف تین چار مسلمان طلبا تھے اور بعد کو ایم۔ اے میں بھی یہی حال تھا۔ لیکن حقیقت جب سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ یہ عام خیال بالکل غلط تھا۔ بی۔ اے سے لے کر ایم۔ اے تک جس لڑکے کا جو معیار تھا ویسے ہی اسے نمبر ملتے تھے۔ ایم۔ اے میں مجھ سے دو سال پہلے ڈاکٹر نصیر احمد خان نے ٹاپ کیا تھا اور یو۔ این۔ او۔ چلے گئے تھے۔ خود میرے بیچ میں اکبر عادل فرسٹ کلاس فرسٹ تھے اور میرے بعد والوں میں ڈاکٹر ظفر احمد امتیازی نمبر پانے والوں میں تھے۔ خود اکنامکس میں مجھے سکنڈ ڈویژن ملا اور اسی م َیں حقدار بھی تھا۔ میرا دوسرا مضمون فارسی تھا۔ اس وقت تک اردو فارسی ایک شعبہ تھا جس میں پروفیسر کی جگہ نہ تھی۔ مسعود حسن رضوی صاحب اس کے بحیثیت ریڈر کے سربراہ تھے۔ ان کے پاس فارسی کی ڈگری تھی (جیسا کہ اس عہد میں سبھی اُردو کے پروفیسروں کا معاملہ تھا) لیکن وہ اُردو کے مستند عالم تھے۔ مرثیہ اور انیسیات ان کے خاص مضامین تھے۔ دوسرے دو اساتذہ یوسف حسین موسوی صاحب اور عبدالقوی فانؔی صاحب تھے۔ موسوی صاحب نظم پڑھانے میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور عرفؔی شیرازی ان کا محبوب شاعر تھا۔ فانؔی صاحب خود شاعر تھے اور بیحد نیک انسان تھے۔ بدقسمتی سے ان تینوں اساتذہ کے ایک دوسرے کی طرف سے دل صاف نہ تھے جس کے کیا اسباب تھے اس کو تحریر کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے انگریزی ڈپارٹمنٹ کی بھی

امتیازی حیثیت تھی۔ پروفیسر این۔ کے سدّھانت صاحب صدر شعبہ اور ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ سرِ سِتھ صاحب بہت پڑھے لکھے اور انگریزی زبان کے شاعر تھے۔ مترا صاحب نظم پڑھانے کے لیے مشہور تھے۔ نریش چندر صاحب انگریزی کے علاوہ اُردو میں بھی صاحب استعداد تھے اور یہی حال ایس۔ کے۔ نرائن صاحب کا بھی تھا جو لکھنوی تہذیب کا نمونہ تھے۔ رادھے شیام رستوگی صاحب کی فارسی میں دلچسپی انگریزی سے کم نہ تھی۔ وہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور احقرؔ تخلص تھا۔ ''نقش ہائے رنگ رنگ'' ان کے مجموعہ کلام کا نام ہے۔ اے۔ کے بھٹاچاریہ صاحب بی۔ بی۔ مکرجی صاحب کے بعد میری نظر میں دوسرے ایسے استاد تھے جن کا کلاس اٹنڈ کرنے کے بعد پھر پڑھنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔

جس زمانے کا ذکر ہو رہا ہے اس وقت یونیورسٹی میں بی۔ اے پاس کے ساتھ ساتھ بی۔ اے آنرز کا کورس بھی رائج تھا۔ طلبا کو بی۔ اے سال اوّل میں داخلہ لینے کے بعد اختیار ہوتا تھا کہ وہ بی۔ اے پاس کے مطابق پڑھائی کریں گے یا بی۔ اے (آنرس) کے مطابق۔ اس فیصلے سے یونیورسٹی کو سال اوّل ہی میں اطلاع دینا ہوتی تھی اور یہ بھی بتانا ہوتا تھا کہ کس مضمون میں آنرز کرنا ہے۔ بی۔ اے پاس کا کورس دو سال کا اور بی۔ اے آنرس کا تین سال کا ہوتا تھا۔ بی۔ اے آنرس کے طالب علم کو اختیار ہوتا تھا کہ دو سال کے بعد بی۔ اے پاس کے امتحان میں اگر کامیاب ہو جاتا ہے تو یا تو آنرس کے مضمون میں ایک سال اور پڑھ کر بی۔ اے آنرس کی ڈگری بھی لے لے یا آنرس کے مضمون کو چھوڑ کر بی۔ اے پاس کی ڈگری لے کر بقیہ دو مضامین میں سے کسی ایک میں ایم۔ اے کر لے۔ بی۔ اے آنرس کرنے والوں کو پہلے اور دوسرے سالوں میں آنرس کے مضمون میں ایک پیپر زیادہ لینا ہوتا تھا اور تیسرے سال ایم۔ اے سال اوّل کے چار پرچوں کے علاوہ تین مزید پرچوں میں امتحان دینا ہوتا تھا۔ بی۔ اے آنرس کی

ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایم۔اے اسپشل کا ایک سال کا کورس پڑھ کر ایم۔اے اسپشل کی ڈگری مل جاتی تھی جس کا شمار ایم اے کی ڈگری سے کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ چنانچہ راقم الحروف نے بی۔اے آنرس کورس اختیار کیا تھا لیکن دو سال کے بعد بی۔اے پاس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آنرس چھوڑ کر اکنامکس میں ایم۔اے سال اوّل جوائن کر لیا تھا۔ اس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ڈبل کورس کرنے کی اجازت تھی۔ چنانچہ ایم۔اے کے ساتھ ایل۔ایل۔بی بھی کیا جاسکتا تھا جس کا دو سال کا کورس ہوتا تھا۔ راقم الحروف نے اکنامکس میں سال اوّل پاس کرنے کے بعد ایل۔ایل۔بی کا پہلا سال جوائن کیا تھا چنانچہ ۱۹۴۷ء میں جب میں نے اکنامکس میں ایم۔اے کیا تو ایل ایل بی کا سال اوّل پاس کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میری زندگی کا اہم ترین سال تھا۔ ۱۵ راگست کو ہندوستان تقسیم ہو کر آزاد ہوا تھا، اور ۶ راکتوبر ۱۹۴۷ء کو میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ ذکر کیا جا چکا ہے کہ والد مرحوم کے سر اپنی چھوٹی بہن کے خاندان کی بھی ذمہ داری تھی جو اَب میرے سر آ گئی تھی۔ اکنامکس اور ریاضی وہ مضامین تھے جن میں شاذ و نادر مسلمان ملتے تھے اور یوں بھی مسلمانوں کی تعلیمی حالت پاکستان بننے کے وقت قابلِ تسلی نہیں تھی۔ پاکستان میں جو ہائی اسکول بھی نہ تھے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے تھے جن میں میرے عزیز اور بچپن کے ساتھی قمر الحسن صدیقی بھی تھے۔ تحریکِ پاکستان سے اتفاق نہ رکھتے ہوئے بھی درخشاں مستقبل کے لیے پاکستان جانے کا خیال میرے دل میں بھی پیدا ہوتا تھا۔

ایماں مجھے روکے تھا تو کھینچے تھا مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے تھا کلیسا مرے آگے

اس گومگو کیفیت سے والد کے انتقال کے بعد سامنے آنے والی ذمہ داریوں نے نجات دلادی۔ مجھے ہندوستان ہی میں رہنا تھا، نہ صرف اس لیے کہ میں نہ صرف پاکستان تھیوری سے

اتفاق نہ رکھتا تھا بلکہ والد مرحوم کے چھوڑے ہوئے کام کو اور ان کی اپنے سر لی ہوئی ذمہ داری کو مجھے پورا کرنا تھا۔ پھوپھی کے خاندان کی ذمہ داری کے علاوہ منجھلے دادا ضیاء الحق صاحب کی بیوہ کی ذمہ داری بھی کچھ حد تک والد کے سر تھی۔ ضیاء الحق صاحب کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا تھا۔ وہ لاولد تھے اور اس وقت سے ان کی بیوہ کی ذمہ داری ان کے بھتیجے یعنی میرے والد اور چچا وحید الحق صاحب اور منظور الحق صاحب سنبھالے ہوئے تھے اور اس سلسلے میں تینوں بھائی دس دس روپے ماہوار انھیں دیا کرتے تھے۔ دس روپے انھیں دکان کا کرایہ مل جاتا تھا اس طرح وہ چالیس روپے میں بسر کر رہی تھیں۔ مہنگائی بڑھنے کے بعد بھتیجوں نے دس دس کے بجائے پندرہ پندرہ روپے دینا طے کیا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری بھی میرے سر آ گئی تھی اور خدا کا شکر ہے کہ اس رقم کی ادائیگی میں کبھی دیر نہ ہوئی۔ پھوپھی کے بڑے بیٹے لطیف تو ہائی اسکول تک بھی نہ پہنچے تھے اور ان سے چھوٹی بہن کا تو اسکول مین داخلہ بھی نہ کرایا گیا تھا اس لیے کہ اس وقت تک لڑکیوں کو تعلیم دلانے کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ والد کے انتقال کے وقت گھر میں ایک مہینہ کے خرچ تک کا انتظام نہ تھا۔ وحید چچا نے اس وقت سو روپیہ بھیج دیئے تھے جو بہت بڑا سہارا تھے۔ فوری نوکری کی تلاش ہوئی لیکن جس سے ذکر کرتا تھا یہی جواب ملتا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو ملازمت ملنے کا کیا سوال۔ میرے عزیز فرحت اللہ صاحب یوپی گورنمنٹ کے انفارمیشن ڈائریکٹریٹ میں ملازم تھے۔ جب ان سے بات ہوئی تو ان کا بھی یہی جواب تھا لیکن ''کارسازِ ما بفکر کارِ ما''۔ ایک روز اسی الجھن میں وکٹوریہ اسٹریٹ کے کنارے کھڑا تھا کہ میرے ایک ہم درس مرزا محمد حسین جو مشہور شاعر جعفر علی خان صاحب اثرؔ کے نواسے تھے، سڑک پر سے گزرتے نظر آئے۔ میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ جواب ملا حسین آباد ہائی اسکول میں C.T گریڈ میں جس میں کل ۸۰ (اسّی) روپیہ تنخواہ ملتی ہے ملازمت کر لی ہے۔ میں نے پوچھا

کہ کیا کوئی دوسری جگہ بھی خالی ہے۔ بتایا گیا کہ ہاں ایل۔ ٹی۔ گریڈ میں جس میں تنخواہ ایک سو چوالیس روپیہ (۱۲۰ روپیہ تنخواہ، ۲۴ روپیہ مہنگائی بھتہ) ہے، جگہ خالی ہے۔ اگر چاہو تو ہیڈ ماسٹر امیر احمد صاحب سے مل لو۔ میں تیار ہو گیا۔ گھر آ کر شیروانی پہنی (اس وقت تک صرف شیروانی پہنتا تھا) اور محمد حسین کے ساتھ حسین آباد گورنمنٹ ہائی اسکول پہنچ گیا۔ جب میں حسین آباد کا طالب علم تھا اس وقت سے امیر احمد صاحب مجھے جانتے تھے۔ تیز لہجے میں بات کرتے تھے چنانچہ اسی انداز میں پوچھا کہ کیوں آئے ہو؟ میں نے کل بات بتا دی۔ اس شریف انسان نے کچھ بھی پوچھے بغیر حکم دیا کہ آخری کمرے میں جا کر IX B کلاس کو انگریزی پڑھانا شروع کر دو۔ میں حیران تھا کہ سرکاری اسکول میں ہیڈ ماسٹر کو یہ اختیار کیسا کہ وہ کسی کو ملازمت دیدے۔ اسکول ختم ہونے کے بعد جب امیر احمد صاحب کے پاس آیا تو مجھ سے درخواست لکھوائی اور اپنے دوست انسپکٹر آف اسکولس ہیکڑوال صاحب کو بھیج دی۔ وہ تھا میری ملازمت کا پہلا روز۔ حسین آباد کی ملازمت کا زمانہ میری انتہائی مشغولیت کا زمانہ تھا۔ ایل۔ ایل۔ بی کے دوسرے سال کا امتحان دینا تھا (ایل۔ ایل۔ بی کے کلاسز شام کو ہوتے تھے)، بی۔ اے آنرز کے تیسرے سال کے امتحان میں بحیثیت ٹیچر کینڈیڈیٹ بیٹھنے کا فارم بھی بھر دیا تھا اور دن بھر اسکول میں پڑھاتا بھی تھا۔ ۱۹۴۸ء میں امتحانات قریب آنے کے وقت یہ طریقۂ کار ہو گیا تھا کہ دوپہر کو اسکول سے واپس آ کر کھانا کھا کر یونیورسٹی چلا جاتا تھا۔ کلاسز اور لائبریری کے بعد اپنے ایک Law کے ساتھی خواجہ ضمیر حسین کے یہاں جاتا تھا جو ایل۔ ایل۔ بی کے سال دوم میں فیل ہو چکے تھے اور جن کے پاس ایل۔ ایل۔ بی دوسرے سال کی کتابیں اور نوٹس موجود تھے۔ ہمارے پرانے ساتھیوں میں محشر لکھنوی کے متبنّٰی قاسم حسین تھے انھوں نے کہہ رکھا تھا کہ وہ ہم لوگوں کو ایل۔ ایل۔ بی میں پاس نہ ہونے دیں گے۔ چنانچہ مغرب کے بعد وہ ہم لوگوں کو

ڈسٹرب کرنے کے لیے خواجہ ضمیر کے مکان پر آجایا کرتے تھے۔ ان کی کوشش اس حد تک کامیاب ہوئی کہ خواجہ ضمیر اس سال بھی فیل ہوکر پاکستان چلے گئے اور میں فرسٹ ڈویژن نہ لاسکا جس کی مجھے امید تھی۔ بی۔ اے آنرس میں سوائے میرے سب باقاعدہ طالب علم تھے لیکن امتحان کے نتیجہ میں سرِ فہرست میرا نام رہا۔ میرے تعلیمی کیریر کا مختصر حال یہاں ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ بھی میری دوسری دلچسپیوں کا دور تھا۔ یونیورسٹی کے شہر میں رہنے والے طلبا کے لیے شہر کے مختلف حصّوں میں ڈیلی گیسی سنٹر کھول دیے گئے تھے جن میں اخبارات کے علاوہ کھیل کود اور تفریحی سامان بھی فراہم کردیا گیا تھا۔ وکٹوریہ پارک ڈیلی گیسی میرے مکان کے بہت قریب تھی اور میں اسی کا ممبر تھا۔ ٹیبل ٹینس سے دلچسپی جو آئندہ زمانے میں میری کمزوری بن گئی، اسی ڈیلی گیسی کی دین تھی۔ قاسم رضوی، علی نقی اور عابد علی جو مجھ سے سینئر ہونے کی وجہ سے اس ڈیلی گیسی کے پہلے ہی سے ممبر تھے، یونیورسٹی کے اچھے ٹیبل ٹینس پلیر سمجھے جاتے تھے۔ انھیں حضرات سے میں نے ٹیبل ٹینس کھیلنا سیکھا۔ ڈیلی گیسی میں ایک چھوٹا سا جمنیزیم بھی تھا جس کا مَیں پہلے ہی سال میں انچارج بنادیا گیا تھا۔ ڈیلی گیسی ہی میں تاش سے میری دلچسپی شروع ہوئی لیکن وہ صرف برج اور کٹ تھروٹ تک محدود تھی۔ ڈیلی گیسی کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر سکسینہ میرے اکنامکس کے استاد بھی تھے۔ وہ ایک اچھے دوست کی طرح ہم لوگوں سے گھلے ملے رہتے تھے اور ہمارے برج کے ساتھی تھے۔ کے۔ ایم۔ وہال جو آئندہ میڈیکل کالج میں پیتھالوجی کے پروفیسر ہوئے، اس وقت میڈیکل کالج کے اسٹوڈنٹ تھے، وہ بھی ڈیلی گیسی کے روزانہ آنے والوں میں تھے۔ وہ شطرنج کے شوقین تھے اور ان کے ساتھ اس کھیل کی بھی بیٹھکیں ہوا کرتی تھیں اور یہ تمام کھیل بعد مغرب سے آٹھ بجے تک ہوتے تھے جب ڈیلی گیسی بند کردی جاتی تھی۔ یہی زمانہ میرے مردانہ کھیلوں اور ورزشوں کا دور بھی تھا۔ یونیورسٹی میں داخلے کے بعد

میں یونیورسٹی کی ہاکی ٹیم میں منتخب نہ ہوسکا اور ہاکی سے میری دلچسپی کم ہوگئی۔ البتہ پیراکی اپنے پورے شباب پر پہنچ گئی۔ پہلے ہی سال میں بمبئی میں ہونے والی Inter'Varsity Swimming Meet میں حصّہ لینے والی ٹیم میں منتخب ہوگیا اور خود یونیورسٹی کے مقابلوں میں اوّل رہا۔ پیراکی کے علاوہ کُشتی رانی بھی میرا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ دوسرے ہی سال Rowing & Swimming Club کا Vice Captain مقرر ہوا اور اس کے آئندہ سال University Swimming Captain مقرر ہوا اور "Universty Colour" سے نوازا گیا۔ یہ اعزاز ہر اسپورٹس مین کے حصّہ میں نہیں آتا۔ کشتی رانی کا وائس کیپٹن ہونے کے باوجود میں Inter ' Versity Regetta میں کبھی حصّہ نہ لے سکا اس لیے کہ کشتی رانی میں میرے خاص آئیٹم Canoe اور Double Cutter تھے جن کا انٹر ورسٹی میں مقابلہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ یونیورسٹی مقابلوں میں البتہ میں ان دونوں آئیٹمس میں مَیں ہمیشہ اوّل آیا کرتا تھا۔ جسم سازی اور کچھ حد تک کُشتی میں بھی میری دلچسپی برقرار رہی۔ اس وقت کا یونیورسٹی کے جسم سازوں کا ایک گروپ فوٹو آج تک میرے پاس بطور یادگار موجود ہے جو ۱۹۴۵ء میں جب میں بی۔ اے فائنل کا سٹوڈنٹ تھا کھینچا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ اکسٹھ سال پہلے کھینچے گئے اس گروپ میں اب صرف میں اور علی مہدی بلرامپوری زندہ رہ گئے ہیں۔ اس گروپ میں مشرف حسین بھی موجود ہیں جنھوں نے پول والٹ میں ہندوستان کی نمائندگی کی تھی اور علی مہدی بھی جنھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ Inter'Varsity Wrestling میں حصّہ لیا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں مجھے دوبارہ لاہور میں ہونے والے یونیورسٹیوں کے پیراکی کے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے منتخب کیا گیا۔ کھیل کود میں حصّہ لینے والے میرے تمام ساتھی سوائے علی مہدی کے پڑھنے میں کمزور تھے، چنانچہ نہ صادق حسین بی۔ اے پاس کر سکے اور نہ شفاعت قاسم اور نہ مشرف حسین۔ علی مہدی نے

بھی بی۔اے میں تھرڈ ڈویژن پایا اگرچہ آئندہ تاریخ میں .M.A میں انھوں نے فرسٹ ڈویژن لاکر تلافی کر لی۔ عابد علی رضوی جنھوں نے ہاکی میں ہندوستان کی نمائندگی کی تھی، یونیورسٹی میں مجھ سے سینئر تھے لیکن عزیز دوست تھے۔ انھوں نے بہر حال کسی نہ کسی طرح بی۔اے اور انگریزی میں ایم۔اے پاس کر لیا اور شیعہ کالج میں لکچرر ہو گئے۔ میں اپنے ڈویژن اس لیے بچا گیا کہ دن بھر مشغول رہنے کے بعد رات کو آٹھ بجے سے میری پڑھائی کا وقت شروع ہوتا تھا اور کم از کم تین گھنٹے پڑھنے میں صرف ہوتے تھے۔ صبح کو بھی تین گھنٹے ورزشوں، دوڑنے اور پیرنے کے بعد بھی چند گھنٹے پڑھنے کو مل جاتے تھے۔

میرا یونیورسٹی کا تعلیمی دور ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں کا غالباً سب سے اہم زمانہ تھا۔ ۱۹۴۲ء کی ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک دبائی جا چکی تھی اور جنگِ عظیم بھی خاتمے کے قریب آ چکی تھی۔ انگریزوں کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ انھیں ہندوستان بہر حال چھوڑنا ہے، اس لیے ہندوستانی فوج پر بھی انھیں بھروسہ نہیں رہ گیا تھا اور وہ جانتے تھے کہ اگر پھر کوئی پر تشدد تحریک سامنے آئی تو وہ اسے دبا نہ سکیں گے۔ کانگریس اور مسلم لیگ دو متحارب جماعتیں بن چکی تھیں اور کمیونسٹ اور سوشلسٹ جماعتیں کانگریس سے الگ ہو کر اپنا وجود قائم کر چکی تھیں۔ ان تمام جماعتوں کے تحت طلبا کی جماعتیں یونیورسٹیوں میں موجود تھیں۔ اسٹوڈنٹ فیڈریشن کمیونسٹوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ اسٹوڈنٹ کانگریس، کانگریس کا طلبا کا بازو تھا اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن، مسلم لیگ کا طلبا کا دستہ تھا۔ میرے ان تمام جماعتوں کے لیڈروں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ ستیش چندر، شریمالی، منیش چندر سے جوبلی کالج سے دوستی تھی۔ خلیق نقوی سے بھی اچھی خاصی شناسائی تھی۔ یہ سب کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ علی رضا، عباس مرزا، انوار احمد اناوی، ادریس احمد وغیرہ مسلم لیگی تھے۔ رام کشن اوستھی (جو بعد کو لوہیا وادی سوشلسٹ ہو گئے)

اور سید محمد جعفر وغیرہ کانگریسی تھے۔ ان سب سے میرے دوستانہ تعلقات تھے اور ان سبھی کی پیش کش تھی کہ میں ان کی جماعت سے منسلک ہو جاؤں لیکن عملی سیاست سے نہ مجھے دلچسپی تھی اور نہ میں خود کو اس میں حصّہ لینے کا اہل سمجھتا تھا۔ ۱۹۴۲ء کے بعد یونیورسٹی ہمیشہ پر امن رہی حتیٰ کہ مسلم لیگ کے ڈائرکٹ ایکشن ڈے کا بھی یہاں کچھ اثر نہ ہوا۔ تحریر کر چکا ہوں کہ ۱۹۴۷ء برصغیر ہند ہی کے لیے ایک اہم سال نہ تھا بلکہ خود میری زندگی کا بھی اہم ترین سال تھا۔

دسواں باب

سرکاری ملازمت کا دور

بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی ہے یہ سزا
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی میری ذاتی آزادی سلب ہوگئی۔ آزادی ملنے کے دو مہینے کے اندر ہی مجھے فکرِ معاش سے دو چار ہونا پڑا جس کا واحد ذریعہ ملازمت تھی جس کے دروازے ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں پر بند سمجھے جاتے تھے لیکن خدا کا کرم ہمیشہ میرے شاملِ حال رہا اور اگر اس نے میرے اوپر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا تھا تو وہی اس کو اٹھانے کا انتظام کرتا رہا۔ تحریر کر چکا ہوں کہ ۶ر اکتوبر کو والد کے انتقال کے بعد ۲۵ر نومبر کو حسین آباد اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ مئی ۱۹۴۷ء میں تعلیمی سشن ختم ہوئے پر یہ ملازمت بھی ختم ہوگئی۔ اسی ملازمت کے دوران میں نے سکریٹریٹ کے پی۔ ڈبلو۔ ڈی میں ایک درخواست دے رکھی تھی۔ تقریباً پندرہ دن بے کار رہنے کے بعد سکرٹیریٹ سے ایک خط ملا کہ اگر پسند کروں تو پی۔ ڈبلو۔ ڈی میں ایک سو پانچ روپیہ ماہانہ (۸۰ روپیہ تنخواہ اور پچیس روپیہ مہنگائی بھتہ) کی ملازمت کر سکتا ہوں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ دوسرے روز جا کر ملازمت کا چارج لے لیا۔ جن صاحب کی چھٹی لینے کی

وجہ سے یہ جگہ خالی ہوئی تھی انھوں نے چھٹی پندرہ روز اور بڑھا دی۔ اس طرح قدرت کی طرف سے ایک مہینہ کے کھانے کا انتظام ہو گیا۔ جولائی کا مہینہ آ گیا اور ۹/ تاریخ کو حسین آباد اسکول کھل گیا لیکن امیر احمد صاحب نے بتایا کہ جس ایل۔ ٹی گریڈ کی پوسٹ پر میں متعین تھا اس پر ڈپارٹمنٹ کی طرف سے کوئی صاحب بھیج دیے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ اگر سی۔ ٹی گریڈ میں (ساٹھ روپیہ تنخواہ اور بیس روپیہ مہنگائی بھتہ) ملازمت کرنا پسند کروں تو جگہ خالی ہے۔ بیکاری سے تو یہ بھی غنیمت تھا۔ چنانچہ قبول کر لی۔ لیکن کچھ ہی روز کے بعد سکریٹریٹ کے فائنانس ڈپارٹمنٹ سے، جہاں میں نے درخواست دے رکھی تھی، پندرہ روز کی ملازمت کا بلاوا آ گیا اور میں وہاں ۸۰+۲۵ روپیہ کی ماہانہ تنخواہ پر چلا گیا۔ ساتھ ہی کچھ آمدنی بڑھانے کے لیے میں نے سکریٹریٹ میں فائنانس ڈپارٹمنٹ کے ایک سپرنٹنڈنٹ اشتیاق علی صاحب کی صاحبزادی کا اُردو پڑھانے کا ٹیوشن بھی کر لیا جو کرامت حسین کالج میں بی۔ اے کی طالبہ تھیں۔ چنانچہ آٹھ بجے صبح کو بلنٹ اسکوائر اشتیاق علی صاحب کے گھر جانے کے لیے نکل جاتا تھا اور وہیں سے سکریٹریٹ چلا جاتا تھا۔ اس وقت فائنانس ڈپارٹمنٹ میں عارضی ملازمین میں مَیں تنہا اکنامکس میں ایم۔ اے تھا۔ پانچ مہینہ کے بعد ہی مجھے ۱۶۰+ ۳۵ روپیہ تنخواہ پر ۱۶۰۔۴۰۰ کے اسکیل میں ترقی دے دی گئی اور ریاستی بجٹ کا کام میرے سپرد ہوا جسے بخوبی انجام دینے کی وجہ سے افسران بالا مجھ سے بے حد خوش تھے۔ فائنانس ڈپارٹمنٹ جوائن کرنے سے پہلے بی۔ اے آنرس پاس کرنے بعد میں نے ایم۔ اے اسپشل میں داخلہ لے لیا تھا۔ بجٹ سکشن کے سپرنٹنڈنٹ نے نے صاحب (Nene) اور انڈر سکریٹری کیشو پرساد صاحب نے لنچ کے وقت یونیورسٹی جا کر کلاس اٹینڈ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس طرح ۱۹۴۹ء میں میں نے فارسی میں بھی ایم۔ اے اسپشل کر لیا۔ مجھے صرف لنچ کے وقت یونیورسٹی جانے ہی کی اجازت نہیں دی

گئی بلکہ ایم۔اے اسپشل کرنے کے بعد جب میں نے پی۔ایچ۔ڈی اور ایل۔ایل۔ایم دونوں کو جن میں کلاس ضروری نہیں ہوتے، جوائن کرنے کی اجازت مانگی تو دونوں کی باقاعدہ اجازت دے دی گئی۔ یہ غالباً سکرٹیریٹ کی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا۔۱۹۵۰ء کے آخری مہینے میں کئی سال پہلے ہونے والے سکریٹیریٹ کے امتحان میں پاس ہونے والے امیدوار جوائن کرنے لگے تھے اور جب کوئی ایسا شخص آتا تھا تو جونیر عارضی ملازم معزول ہوجاتا تھا جس میں میرا نمبر بھی آنے والا تھا۔ کیشو داس صاحب روز تسلی دلاتے تھے کہ جلد از جلد ترقی دلوادوں گا لیکن میں سوچتا تھا کہ جب تک معزول رہوں گا تب تک کیا ہوگا۔لیکن پھر کارساز کی کارسازی ملاحظہ ہو۔ایک روز ایک دیال صاحب جوائن کرنے آئے اور میری برابر والی سیٹ پر کام کرنے والے صاحب کو معزول کر کے وہ سیٹ انھیں دے دی گئی۔ اسی روز میری ان سے دوستی ہوگئی۔ انھوں نے بتایا کہ Economics & Statistics ڈپارٹمنٹ میں 160-400 کے اسکیل میں جس میں مَیں فائنانس ڈپارٹمنٹ میں کام کر رہا تھا، جگہ خالی ہے۔اس وقت Statistics Deptt. بھی فائنانس سکریٹری کے تحت تھا۔ میں نے درخواست لکھی جسے دیکھ کر کیشو داس صاحب سخت ناراض ہوئے کہ کوئی ضرورت جانے کی نہیں لیکن جب میں بضد ہوا تو سفارش کر کے فائنانس سکریٹری بی۔جی۔راؤ آئی۔سی۔ایس کو بھیج دی اور اسی پر Economics and Statistics Department میں میرا تقرر ہوگیا۔ میری اکنامکس کی ڈگری پھر کام آئی۔لوگ حیران تھے کہ یہ کیسے ہوا اس لیے کہ جب کوئی عارضی ملازم کہیں دوسری جگہ کے لیے درخواست دیتا تھا تو درخواست اس شرط پر بھیجی جاتی تھی کہ اگر وہاں تقرر ہوگیا تو سکریٹریٹ سے استعفیٰ دینا ہوگا۔ میرے معاملے میں ایسا نہ ہوپایا اور سروس برک کیے بغیر میں نے Statistics Department جوائن کرلیا۔لیکن وہاں کی سروس کے تین سال میری

پریشانیوں کا دور رہا۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں بیدر میں ہیڈ ماسٹر کی پوسٹ پر کام کرنے والے میرے چچا وحید الحق صاحب پر دل کا دورہ پڑا۔ میں انھیں لکھنؤ لانے کے لیے بیدر گیا لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور دل کے دورے کو محض دمہ کا دورہ سمجھتے ہوئے انھوں نے مئی میں لکھنؤ آنے کا وعدہ کیا۔ جب بیدر سے واپس آیا تو لکھنؤ آتے ہی معلوم ہوا کہ میری چچی یعنی منظور چچا کی بیوی جن کی حیثیت میری ماں کی تھی، ان کا سیتا پور میں انتقال ہو گیا۔ ابھی دو مہینہ بھی نہ گزرے تھے کہ حیدر آباد سے خبر آئی کہ وحید چچا کا دل کے دورے میں وہاں انتقال ہو گیا۔ مجھے دوبارہ چھٹی ملنا ناممکن تھا۔ والد کے پراویڈنٹ فنڈ سے ملنے والی رقم سے منظور چچا کو وحید چچا کے بیوی بچوں کو لکھنؤ لانے کے لیے بھیج دیا۔ اسی عرصے میں میرے والد کے تنہا چچازاد بھائی جو میرے خالہ زاد بھائی بھی تھے، علیل ہو کر لکھنؤ آئے اور ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان خاندانی پریشانیوں کے علاوہ فائنانس ڈپارٹمنٹ کے افسروں کے برخلاف میرے موجودہ ڈپارٹمنٹ کے افسران، خصوصاً ڈائرکٹر جے۔ کے۔ پانڈے سے میری قطعاً نہیں بن رہی تھی۔ لیکن میں ملازمت کے لیے مجبور تھا اس لیے کہ منجھلی دادی اور پھوپھی کی ذمہ داریوں کے علاوہ وحید چچا کے خاندان کی ذمہ داری بھی بڑی حد تک میری ہی تھی اگرچہ منظور چچا بھی تا حد امکان ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔ چچی جان (وحید چچا کی بیوی) کو کچھ عرصہ کے بعد ریاست آندھرا پردیش سے تیس روپے ماہوار پنشن ملنے لگی تھی۔ گھر کی نازک اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے منظور چچا نے چچی جان کی مرضی سے فیصلہ کیا کہ چچی جان ان تیس روپیوں میں سے پندرہ روپے گھر کے خرچ کے لیے دے دیا کریں اور بقیہ پندرہ روپے اپنے خرچ کے لیے رکھ لیا کریں۔ مجھے یہ فیصلہ پسند نہ آیا لیکن ابا جانی کی مرضی کے خلاف لب کشائی ممکن نہ تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ وہ پندرہ روپے اپنے جیب خرچ سے ان کے جیب خرچ میں ملا دیا کروں۔ اپنے گھر کے ان حالات کے علاوہ میرے ایک عزیز کلاس فیلو

نصیر الدین کا بھی مسئلہ تھا۔ ان کی ہائی اسکول کے بعد شادی ہوگئی تھی اور بی۔اے نہ کر سکے تھے۔اس وقت ان کی کئی اولادیں تھیں اور ایک چھوٹی سی تجارت ذریعہ معاش تھی جس سے ان کا خرچ بمشکل چل پاتا تھا۔انھیں بھی لے دے کر بطور سہارا میں ہی نظر آتا تھا۔نتیجہ یہ تھا کہ میرے پاس اپنے جیب خرچ کے لیے اتنا بھی نہ رہتا تھا جتنا ۱۹۳۳ء میں چوتھے درجے میں ملا کرتا تھا یعنی ایک آنہ روز۔لیکن جلد ہی:

رسید مژدہ کہ ایّامِ غم نخواہد ماند

چناں نماند، چنیں نیز ہم نخواہد ماند

میری شادی ۳۰؍اکتوبر ۱۹۵۹ء کو (بروز دیوالی) ہوئی۔ چند ہی مہینوں کے کے بعد اس خاندانی باغ کے درخت بار آور ہونا شروع ہوگئے جس کی آبیاری میں خون پسینہ ایک کیا گیا تھا۔۱۹۶۰ء میں میری پھوپھی زاد بہن شمیم نے ایم۔اے پاس کرلیا اور الٰہ آباد کے ایک انٹرمیڈیٹ کالج میں پولیٹیکل سائنس کی لکچرر ہوگئیں۔ ان سے بڑے بھائی لطیف میرے پلاننگ ڈپارٹمنٹ چھوڑنے سے پہلے ہی ٹی۔ڈی۔ پانڈے صاحب کی مہربانی سے اسی ڈپارٹمنٹ میں عارضی ملازم ہو چکے تھے۔۱۹۶۱ء میں شمیم سے چھوٹی بہن نسیم نے بی۔ایس۔سی کرلیا تھا اور نویگ کالج میں ملازم ہوگئی تھیں اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد **Physics** میں **M.Sc. (Condensed Course)** کرنے کے بعد انھیں انٹرمیڈیٹ گریڈ مل گیا تھا۔ ۱۹۶۱ء ہی میں منظور چچا کی بیٹی عابدہ نے بھی بی۔اے کرلیا تھا اور اسی سال وحید چچا کے بڑے بیٹے نے انجینئرنگ ڈپلوما امتحان پاس کرلیا اور ملازمت میں آگئے۔۱۹۶۲ء میں میری پھوپھی کے دوسرے بیٹے الطاف نے بھی انجینئرنگ ڈپلوما پاس کرلیا، اور اسی زمانے میں میرے ساتھی نصیر الدین جنکا ذکر کر چکا ہوں، انکے بیٹوں نے بھی انجینئرنگ ڈپلوما کیا۔ان سبھوں کو اعلیٰ

یونیورسٹی کی تعلیم کے بجائے پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف میں ہی نے لگایا تھا اور مستقبل نے بتایا کہ میرا فیصلہ درست تھا۔ منظور چچا کے بیٹے عبدالوہاب نے بھی ۱۹۶۲ء میں انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کرلی اور ۱۹۶۳ء میں میری چچا زاد بہن عابدہ بھی نفسیات میں ایم۔ اے ہوگئیں۔ اس طرح میری شادی کے بعد ہی میرے خاندان کے تاریک دور کا خاتمہ اور روشن عہد کی ابتدا کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن اس کو دیکھنے کے لیے میرے بزرگوں میں کوئی نہ رہا اس لیے کہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۱ء میں ابا جانی (منظور چچا) کا بھی ہارٹ فیل ہوگیا اور ان کے بعد پورے خاندان میں میں ہی سب سے بڑا ہوگیا۔ یہ دور خوش حالی خدا کے فضل سے آج بھی برقرار ہے اور ہمارے خاندان کا موجودہ نسل کا ہر بچہ ذمہ دار جگہوں پر فائز ہے جس میں سب سے اونچا مرتبہ میرے بیٹے کا ہے جو عمر میں سب سے بڑے بھی ہیں۔

کاروانِ حیات نوع بشر کی ارتقائی منزلوں طرف گامزن رہتا ہے۔ اگر ان اوپر چڑھتی ہوئی سیڑھیوں پر کسی جگہ شکستہ پائی یا کسی دوسرے سبب سے کچھ لوگ رک جانے پر مجبور ہوتے ہیں تو وہ نیچے کی سیڑھیوں والوں کا راستہ بھی مسدود کردیتے ہیں اور سفر حیات میں افراتفری مچ جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر اوپری سیڑھی والوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ان شکستہ پا مجبوروں کی دستگیری کرکے انھیں اوپری سیڑھی تک پہنچنے میں کمک رساں ہوں۔ اس سلسلے میں اگر وقتی طور سے انھیں کچھ پریشانیوں اور سختیوں کا سامنا کرنا بھی پڑے تو اس کا صلہ اس سکون قلب اور مسرت سے مل جائے گا جو ان خستہ حالوں کو خوش حال دیکھ کر حاصل ہوگا۔

ان جملات معترضہ کے بعد میں پھر اصل موضوع کی طرف راجع ہوتا ہوں۔ پلاننگ ڈپارٹمنٹ نیا نیا وجود میں آیا تھا اور محکمۂ زراعت کے سکریٹری کے تحت تھا جس کے تحت Statistics Department بھی تھا۔ محکمہ زراعت کے جوائنٹ سکریٹری کا ایک نوٹ

جس پر سکریٹری .A.N.Jha I.C.S کی منظوری تھی Statistics Department میں آیا جس میں مجھے اور محکمۂ زراعت کے ایک صاحب ودیا شنکر کو نام لے کر پلاننگ ڈپارٹمنٹ میں بلایا گیا تھا۔ مجھ سے مذاق کیا جانے لگا کہ کیونکہ جے۔کے۔ پانڈے سے میری نہیں بن رہی تھی اس لیے میں نے سکریٹریٹ واپس جانے کا انتظام کرلیا۔ لیکن میں خود حیران تھا کہ جوائنٹ سکریٹری .K.A.P. Slevenson I.A.S جن کی یہ تجویز تھی، کون صاحب تھے اور انھیں میرا نام کیسے معلوم ہوگیا۔ بہر حال جے۔کے پانڈے کی اس دھمکی کے باوجود کہ اگر میں پلاننگ ڈپارٹمنٹ چلا گیا تو میرا Lien ختم کردیا جائے گا میں نے فوراً Relieve کیے جانے کا مطالبہ کیا اور شام کو جا کر پلاننگ ڈپارٹمنٹ جوائن کرلیا۔ کئی سال کے بعد جب میں نے گزیٹیڑ ڈپارٹمنٹ جوائن کیا تب پتا چلا کہ جے۔کے پانڈے نے ایک ایسی کمینی حرکت کی تھی جس کی وجہ سے میں گورنمنٹ آف انڈیا کی ایک پوسٹ پر نہ جاسکا تھا لیکن خدا کی اس میں بھی مصلحت تھی کہ اگر میں گورنمنٹ آف انڈیا چلا جاتا تو یونیورسٹی کیسے پہنچتا جو میرا مقصد تھا۔

پلاننگ ڈپارٹمنٹ کا ماحول اسٹیٹکس ڈپارٹمنٹ کے ماحول سے یکسر جداگانہ تھا اور اس چھچھورے پن کا نام ونشان نہ تھا جس سے مجھ کو آخر الذکر شعبے میں سابقہ پڑا تھا۔ جوائنٹ سکریٹری اسٹیونسن ملٹری سے واپس آکر آئی۔اے۔ایس ہوئے تھے اور فوجی افسروں کی تمام خوش مزاجی ان میں تھی۔ آئی۔اے۔ایس ہونے کے باوجود وہ میرے ایک نہایت اچھے دوست ثابت ہوئے۔ وہ ہاکی پلیر رہ چکے تھے۔ میری خواہش کے مطابق وہ ہمارے کلب ایم۔وائی۔اے کے وائس پریسیڈنٹ بننے پر راضی ہوگئے۔ ڈپٹی سکریٹری تارادت پانڈے صاحب ایک مخلص اور ہمدرد بزرگ ثابت ہوئے۔ میرے بھائی لطیف بی۔اے پاس کرنے کے بعد بے کار تھے۔ پانڈے صاحب کو چندروز کے لیے تقرری کے اختیارات مل گئے اور لطیف کا پلاننگ ڈپارٹمنٹ میں

تقرر ہو گیا۔ ہمارے سپرنٹنڈنٹ افتخار صاحب بظاہر ایک انگریز لیکن بباطن ایک مخلص خاموش طبع مسلمان تھے۔ ایک روز میں نے ان سے دریافت کیا کہ آخر اسٹیونسن صاحب کو میرا نام کیسے معلوم ہوا جو انھوں نے نام بتا کر مجھے Statistics Department سے بلوالیا۔ افتخار احمد صاحب نے بتایا کہ انھوں نے میرا نام انھیں بتایا تھا۔ یہ پوچھنے پر کہ انھیں خود میرا نام کیسے معلوم ہوا انھوں نے جواب دیا کہ ان کے ایک دوست نے بتایا تھا۔ پتا چلا کہ ان کے تنہا دوست سید مسعود حسین صاحب تھے۔ مسعود صاحب کا اور میرا صرف چند روز کا ساتھ Statistics Department میں ہوا تھا۔ جب فائنانس ڈپارٹمنٹ سے میں وہاں گیا تو وہ وہاں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھے اور چند ہی روز کے بعد سکریٹریٹ واپس آ گئے تھے اور یہی چند دن کا میرا ان کا ساتھ تھا۔ میں نے مسعود صاحب سے پوچھا کہ آپ کو میرا خیال کیسے آیا جو آپ نے میرا نام افتخار صاحب کو بتا دیا۔ کہنے لگے کہ جے۔ کے پانڈے کی فطرت اور ڈپارٹمنٹ کے ماحول کو جانتے ہوئے میں سمجھتا تھا کہ تم وہاں خوش نہ رہ سکو گے اس لیے میں نے افتخار سے کہہ کر تمھیں پلاننگ ڈپارٹمنٹ میں بلوالیا۔ یہ اتفاق دیکھئے کہ صرف ایک صاحب سے ایک روز کی ملاقات فائنانس ڈپارٹمنٹ سے اسٹیٹکس ڈپارٹمنٹ میرے جانے کا ذریعہ بنی اور ایک دوسرے صاحب سے صرف چند روز کی ملاقات مجھے سکریٹریٹ واپس آنے کا سبب بنی۔ پلاننگ ڈپارٹمنٹ میں میں چار سال رہا اور اس آن بان سے کہ سکریٹری اے۔ این۔ جھا، آئی۔ سی۔ ایس سے سپرنٹنڈنٹ عبدالستار صدیقی تک افسر سے زیادہ میرے دوست تھے۔ ماحول میں اس ذہنیت کا نام ونشان نہ تھا جسے کلرکل ذہنیت کہا جاتا ہے اور جس میں تنگ نظری ہوتی ہے اور ہر افسر اپنے افسر کے سامنے بھیگی بلی اور ماتحت کے ساتھ شیر ہوتا ہے۔

پلاننگ ڈپارٹمنٹ میں چار سال رہنے کے بعد قسمت نے پھر پلٹا کھایا اور میں ایک ایسے

ڈپارٹمنٹ میں پہنچ گیا جس سے یونیورسٹی جانے میں آسانی ہوگئی۔ ہوا یوں کہ ایک روز پلاننگ ڈپارٹمنٹ میں ایک اشتہار آیا کہ نئے نئے قائم ہونے والے گزیٹرز ڈپارٹمنٹ میں کمپائی لیشن افسروں کی ضرورت ہے جن کا کام مختلف ضلعوں کے گزیٹروں کے لیے ان کے مختلف رخوں پر مضامین لکھنا ہوگا۔ ایک تاریخ بتا دی گئی تھی جس دن امتحان ہونا طے تھا۔ میں نے امتحان میں بیٹھنے کے لیے درخواست بھیج دی۔ پہلے عبدالستار صدیقی ناراض ہوئے اور بعد کو ٹی۔ ڈی پانڈے صاحب درخواست واپس لینے کے لیے کہنے خود آئے۔ چند مہینے کے بعد وہ رٹائر ہونے والے تھے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ جب آپ ریٹائر ہو جائیں گے تو مجھے کسی نئے صاحب سے سابقہ پڑے گا اور پتا نہیں ان سے میری بنے یا نہ بنے۔ اس لیے اگر ابھی کسی ایسے ڈپارٹمنٹ چلا جاؤں جو میری طبیعت اور کوالی فیکیشن سے زیادہ مناسبت رکھتا ہو تو بہتر ہے۔ پانڈے جی کی سمجھ میں میری بات آ گئی۔ میں ٹسٹ میں بیٹھا اور منتخب ہو گیا اور ایک خاص تاریخ کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ میں تاریخ بھول گیا۔ وہ زمانہ میرے ٹیبل ٹینس میں میری انتہائی دلچسپی کا زمانہ تھا۔ میں نے ایم۔ وائی۔ اے میں ٹیبل ٹینس سکشن کھول رکھا تھا اور جونیر کھلاڑیوں میں سے ایک ونود چند مہتا نے ہندوستان میں جونیر کھلاڑیوں میں تیسری پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ ونود کے والد ملٹری میں کیپٹن تھے اور کنٹونمنٹ مین ان کی قیام گاہ تھی۔ ونود نے اپنی کامیابی کے سلسلے میں میری دعوت کی تھی۔ اس دعوت میں شرکت کے لیے جب جا رہا تھا تو اکبر پور ہاؤس (جہاں اب قیصر باغ بس اڈا ہے) کے سامنے جب پہنچا تو خیال آیا کہ آج تو یہاں گزیٹر ڈپارٹمنٹ میں میرا انٹرویو تھا۔ انٹرویو کا وقت گزر چکا تھا پھر بھی میں نے سوچا کہ کیا ہرج ہے اگر چل کر دیکھ لیا جائے کہ اب بھی انٹرویو دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ امیدواروں میں میرے کئی جاننے والے مثلاً ڈاکٹر گوریشور بھٹناگر، ڈاکٹر کے۔ سی۔ جین، وغیرہ موجود تھے۔ انٹرویو بورڈ میں پروفیسر کے۔

سی۔ ترپاٹھی، مسٹر ونود چند شرما آئی۔اے ایس۔اور ڈاکٹر اطہر عباس رضوی شامل تھے۔ معلوم ہوا کہ انٹرویو دینے والوں میں آئندہ نمبر میرا ہی تھا۔ میں نے انٹرویو دیا اور ونود مہتا کی پارٹی میں چلا گیا۔ (ونود مہتا کا آج کل ہندوستان کے معروف جرنلسٹوں میں شمار ہوتا ہے اور ان کے بھائی ہندوستانی فوج میں لیفٹیننٹ جنرل ہیں)۔ چند روز کے بعد پلاننگ ڈپارٹمنٹ میں میری تقرری کا خط آ گیا اور میں سکریٹریٹ سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔

گزیٹرز ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ونود چند شرما صاحب آئی۔اے۔ایس (رٹائرڈ) تھے۔ ان کا **Designation** اسٹیٹ ایڈیٹر تھا۔ ان کے ماتحت دو پی۔سی۔ایس افسر ایڈیٹر تھے۔ ان کے نیچے کمپائی لیشن آفیسر اور ان کے بعد اسسٹنٹ کمپائی لیش آفیسر تھے۔ گزیٹرز کا دفتر اکبر پور ہاؤس میں تھا لیکن چھ سینئر کمپائی لیشن افسروں کو شرما جی نے اپنی کوٹھی کے ایک کمرے میں بیٹھا لیا تھا۔ ونود چند شرما صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ انتہائی سخت گیر افسر رہ چکے تھے لیکن میرا تجربہ اس کے برعکس تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب میری **Sports activities** اپنے شباب پر تھیں۔ پڑھنا لکھنا چھوٹ چکا تھا اور گیمس کو آرگنائز کرنے میں دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ **U.P. Aquatic Association** کا جوائنٹ سکریٹری اور لکھنؤ ٹیبل ٹینس ایسوسی ایشن کا خازن تھا۔ ان کے علاوہ یو پی اسپورٹس کونسل، جس کے صدر صدیق حسن صاحب آئی۔سی۔ایس تھے، کا بھی جوائنٹ سکریٹری تھا۔ میرے گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا اس لیے دفتر کا ٹیلی فون کا نمبر سب کو دے رکھا تھا۔ دن بھر میرے ٹیلی فون آیا کرتے تھے اور شرما جی خنداں پیشانی کے ساتھ مجھے بلوایا لیا کرتے تھے۔ شرما جی لنچ کے وقت ٹیلی فون اپنے ساتھ اندر لے جاتے تھے۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ کال ایسے وقت آئی جب ٹیلی فون شرما جی کے گھر میں ہوا۔ وہ خود ٹیلی فون ہاتھ میں لیے باہر چلے آتے کہ لو انصاری تمھارا ٹیلی فون ہے۔ ایک مرتبہ انتہا ہوگئی۔ اسپورٹس کونسل کے

سکریٹری کی حیثیت سے میں لکھنؤ میں انٹر ڈسٹرکٹ ٹیبل ٹینس ٹورنامنٹ کا منتظم تھا اور تمام خط وکتابت دفتر (یعنی ونود چند شرما صاحب کی کوٹھی) کے پتے سے ہوتی تھی۔ ٹورنامنٹ سے ایک روز پہلے رات کے وقت شرما جی کا چپراسی میرے مکان پر آیا، یہ اطلاع دینے کے لیے کہ میرے مہمان شرما جی کی کوٹھی پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ہوا یوں کہ کیوں کہ خط وکتابت شرما جی کی کوٹھی کے پتے پر ہوئی تھی، ضلع میرٹھ کی ٹیم اسی پتے پر رات کے وقت پہنچ گئی۔ جب میں ان کے یہاں پہنچا، شرما جی ٹیم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ مسکرا کر صرف اتنا کہا لو بھئی اپنے مہمانوں کو سنبھالو، اب میں اندر جا رہا ہوں۔ ان کا یہ رویہ ایک مشفق بزرگ کا تھا۔ میرے چچا پیلی بھیت میں پوسٹڈ تھے۔ انھیں دل کی تکلیف ہوگئی۔ ونود چند شرما صاحب سکریٹری، محکمۂ تعلیمات رہ چکے تھے۔ اس وقت کے ایجوکیشن ڈائرکٹر ان کے ماتحت رہ چکے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے چچا پیلی بھیت میں ٹیچر ہیں، ان کا لکھنؤ تبادلہ کرا دیجئے۔ اسی وقت ڈائرکٹر ایجوکیشن کو خط لکھا کہ منظور الحق عربک ٹیچر، گورنمنٹ اسکول پیلی بھیت کا لکھنؤ یا نواح لکھنؤ میں تبادلہ کر دیا جائے۔ میں نے کہا کہ خط مجھے دے دیجیے تاکہ پوسٹ کر دوں۔ جواب دیا کہ اپنے پیسے کیوں خرچ کروگے، میں بھیج دوں گا۔ خط بھیج دیا گیا اور ایک ہفتے میں چچا کا بارہ بنکی تبادلہ ہوگیا۔ شرما جی جو انتہائی سخت مزاج مشہور تھے، ایک مرتبہ مجھ سے بھی خفا ہوگئے لیکن سن لیجیے کہ کیوں۔ میں برسات میں کبھی برساتی یا چھتری کا استعمال نہ کرتا تھا، بھیگتا اور سوکھتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اسی طرح بھیگتا ہوا دفتر پہنچا۔ شرما جی باہر ہی برآمدے میں کھڑے تھے۔ سخت ناراض ہوئے کہ یوں بھیگتے ہوئے کیوں آئے۔ فوراً مجھے گھر بھیج دیا۔ اس ناراضگی میں کتنی محبت تھی اس کا لطف ابھی تک اٹھاتا ہوں۔

ونود شرما صاحب کا میرا ساتھ تقریباً دو سال رہا۔ اس کے بعد گورنمنٹ نے انھیں

Re-employment نہیں دیا اور ان کی جگہ مسز ایشا بسنتی جوشی، اسٹیٹ ایڈیٹر مقرر ہوئیں۔ (چند روز قبل جنوری ۲۰۰۷ء میں نوے سال سے زیادہ عمر میں ان کے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھی)۔ وہ ایک معمر خاتون تھیں اور .I.A.S کیڈر میں سب سے سینئر۔ وقت کی انتہائی پابند تھیں۔ ٹھیک دس بجے دفتر آ جاتی تھیں اور ٹھیک پانچ بجے دفتر چھوڑ دیتی تھیں۔ شرما صاحب کے رٹائرمنٹ کے بعد ہم چھ سینئر کمپائی لیشن آفیسر اکبر پور ہاؤس میں جہاں گزیٹرز کا سارا اسٹاف بیٹھتا تھا، بلا لیے گئے۔ اسٹیٹ ایڈیٹر شرما صاحب کے ساتھ بیٹھنے کی وجہ سے ہمارا پی۔ سی۔ ایس گریڈ کے ایڈیٹروں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ بات ان کو کھلتی تھی۔ ولیم مودی سنگھ کو کم لیکن سریواستو صاحب کو جو غالباً افسریت کے زیادہ شوقین تھے، زیادہ۔ میرے چچا منظور الحق صاحب رٹائر ہو کر بارہ بنکی سے لکھنؤ آ چکے تھے اور ان پر انجائنا کا ایک سخت دورہ پڑ چکا تھا اور ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کا علاج ہو رہا تھا۔ ان کا مطب اکبر ہاؤس سے زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ پر تھا۔ حال کہنے والا میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ میں نے سریواستو صاحب سے اجازت مانگی کہ لنچ کے وقفے میں مَیں حال کہہ آیا کروں۔ غالباً اسے وہ باہر جانے کا بہانہ سمجھے اور انکار کر دیا۔ میں نے مسز جوشی کو حالات بتائے اور انھوں نے ڈاکٹر کے یہاں جانے کی اجازت دے دی لیکن واپس آ کر عجیب منظر دیکھا۔ سریواستو صاحب جوشی صاحبہ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی برس پڑیں کہ جب سریواستو نے اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا تو مجھ سے کیوں اجازت لی۔ میرا جواب تھا کہ میرا ڈاکٹر کے یہاں جانا ضروری ہوتا ہے۔ آپ سے اجازت اسی لیے لی تھی کہ انھوں نے ایک جائز ضرورت کے لیے اجازت دینے سے انکار کیا تھا۔ میں مزید گفتگو کا انتظار کیے بغیر یہ کہہ کر چلا آیا کہ مجھے سکریٹریٹ میں میری مستقل جگہ پر واپس بھیج دیا جائے۔ (میں سکریٹریٹ کے امتحانات پاس کر چکا تھا اور پی۔ ڈبلو۔ ڈپارٹمنٹ

میں مستقل تھا اور اس کے بعد گز یٹڑ ز ڈ پارٹمنٹ میں مَیں ڈیپوٹیشن پر تھا)۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا کچھ روز کے بعد مسز جوشی کو میرے **Chapters** پسند آنے لگے۔ شرما صاحب کی طرح بغیر ایڈیٹروں کی مداخلت کے وہ میرے نوشتہ ابواب کو مجھے ساتھ بیٹھا کر دیکھنے لگیں۔ وہ بہت جلد باز تھیں۔ پورا جملہ پڑھے بغیر اصلاح شروع کر دیتی تھیں اور اس اصلاح کے بعد جب جملے کا آئندہ ٹکڑا دیکھتی تھیں تو وہ میل نہ کھاتا تھا جس کے نتیجہ میں اس کی بھی اصلاح کرنا پڑتی تھی اور بحیثیت مجموعی **Chapter** کاٹ پیٹ کا پلندہ بن جاتا تھا۔ چنانچہ ہم کمپائی لیشن افسروں کو ہدایت تھی کہ ان کے دیکھنے کے بعد ابواب کو صاف طور سے لکھ کر ٹائپسٹ کو دیا جائے۔ وقت گزرتا گیا۔ مسز جوشی سے تعلقات بہتر سے بہتر ہوتے گئے۔ گز یٹڑ ز ڈ پارٹمنٹ اکبر پور ہاؤس سے دلکشا کے قریب منتقل ہو چکا تھا۔

۱۹۵۹ء میں میری شادی ہاجرہ خاتون سے ہوگئی تھی۔ اس وقت تک وہ پی۔ اچ۔ ڈی نہ تھیں۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں، سروس میں آنے کے بعد میری پڑھائی لکھائی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ سکریٹریٹ سے اٹھ کر سیدھا چھتر منزل چلا جاتا تھا اور وہاں سوئمنگ پول میں ڈیڑھ دو گھنٹے مسلسل پیراکی ہوتی تھی۔ ایک اینگلو انڈین نوجوان رینجرس **American Crawl** کا ماہر تھا۔ اس کے ساتھ سوئمنگ کر کے مجھے اپنے کرال کے اسٹائل کو درست کرنے کا موقع ملا۔ چھتر منزل سے سیدھا کارپوریشن بلڈنگ چلا جاتا تھا، جہاں اوپری ہال میں ایڈمنسٹریٹر چوڑامنی صاحب آئی۔ اے۔ ایس نے اسٹیونسن صاحب مذکورہ کے کہنے سے ٹیبل ٹینس کی میزیں لگانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہاں سے ٹیبل ٹینس کھیل کر دس گیارہ بجے رات کو گھر واپسی ہوتی تھی۔ جیسا لکھ چکا ہوں سکریٹریٹ کے فائنانس ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے کے دوران ہی مجھے پی۔ اچ۔ ڈی اور ایل۔ ایل۔ ایم دونوں کرنے کی اجازت مل چکی تھی لیکن اس وقت تک

(یعنی ۱۹۶۰ء) تک میں ادھر متوجہ نہ ہوا تھا، اگر چہ یونیورسٹی سروس کا خیال دل سے نہ نکلا تھا۔ ایک روز اسی موضوع پر باتیں ہورہی تھیں، میری بیوی کے منھ سے نکل گیا کہ آپ کبھی بھی پی۔ایچ۔ڈی نہ کریں گے۔ یہ جملہ دل میں پیوست ہوگیا اور وہ دن میرے عملی کھیل کود کا آخری دن تھا۔ Lucknow Acquatic Association کے سکریٹری کی حیثیت سے گیریسن پول میں انٹر ڈسٹرکٹ سوئمنگ کامپٹیشن کروارہا تھا۔ اس کا تمام ریکارڈ اپنے اسٹیٹ سکریٹری کے حوالے کرکے بے تعلق ہوگیا۔ میونسپل کارپوریشن کی عمارت کی طرف جہاں میرے کلب کی تین بہترین میزیں لگی ہوئی تھیں، پلٹ کر رخ بھی نہ کیا۔ اور بعد کو یہ بھی پتا نہ چلا کہ ان میزوں اور کلب کا کیا حشر ہوا۔ میں ان تمام کھیل کود کی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوکر دوبارہ حصولِ علم کی طرف متوجہ ہوا اور تحقیقی مقالے کے لیے کام کرنا شروع کردیا۔ گزیٹیرز ڈپارٹمنٹ میں ۱۹۶۰ء سے میرا دوسرا تعلیمی دور شروع ہوا جس میں مَیں یونیورسٹی کے تعلیمی دور سے کہیں زیادہ سنجیدہ تھا۔ گزیٹیرز کے کام کے سلسلے میں اہم کتاب خانوں مثلاً خدا بخش لائبریری، رضا لائبریری، مولانا آزاد لائبریری وغیرہ جانے کے مواقع ملا کرتے تھے۔ میں نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی تھیسس کا مواد جمع کرلیا اور ڈیڑھ سال کے عرصے میں عرفی شیرازی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر جمع کردیا۔ (اس وقت تھیسس جمع کرنے کے لیے کم از کم دو سال کی مدّت درکار ہوتی تھی جو بعد کو تین سال کردی گئی لیکن جن اسکالروں کا ایم۔اے میں فرسٹ کلاس ہوتا تھا انھیں کم وقفہ میں بھی مقالہ جمع کرنے کی اجازت مل جاتی تھی)۔ میں نے کل کام حتیٰ کہ تھیسس کی ٹائپنگ بھی خود کی تھی۔ میرے سپروائزر یوسف حسین موسوی صاحب سے اتنی مدد ضرور ملی تھی کہ انھوں نے کلیاتِ عرفی کا ایک بہت اہم نسخہ مطالعہ کے لیے میرے حوالے کردیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں مَیں پی۔ایچ۔ڈی ہوگیا جس کی خوشی میں مسز جوشی بھی شامل تھیں۔ تھیسس کے سلسلے میں پڑھنے لکھنے کا عادی ہوچکا تھا۔ دفتر میں مَیں اور ایس۔بی۔پی۔نگم

ایک علاحدہ کمرے میں بیٹھتے تھے۔ نگم میڈیول انڈین ہسٹری میں پی۔ایچ۔ڈی کی تیاری کررہے تھے۔ان کا ٹاپک ''Nobility Under the Sultants of Delhi'' تھا۔مسز جوشی کی طرف سے ہمیں ہر کتاب کو خریدنے کی اجازت تھی اور جو کتابیں بازار میں نہیں ملتی تھیں مختلف کتاب خانوں سے ہمارے لیے فراہم کرادی جاتی تھیں۔نگم نے تاریخ کے متعلق ہر ضروری کتاب خریدوالی تھی اور میں نے ہر چھپا ہوا تذکرہ، خواہ اُردو شاعروں سے متعلق ہو یا فارسی شاعروں سے، منگوالیا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ کے عمیق مطالعہ کا موقع انھیں دنوں حاصل ہوا۔ بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تاریخ کے سلسلے میں میری معلومات کم از کم لکھنؤ یونیورسٹی کے تاریخ کے اساتذہ سے کسی طرح کم نہ تھیں۔اس زمانہ میں نے Cambridge History of India کی تمام جلدوں کا گائز مطالعہ کرلیا تھا۔اس کے علاوہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان پر ڈاکٹر ایشوری پرساد اور ڈاکٹر حبیب اللہ کی مستند کتابیں بشمول Foundation of Muslim Rule in India میری نظر سے گذر چکی تھی۔ڈاکٹر مہدی حسن کی Tughlaq Dynasty، ڈاکٹر قانون گو کی Sher Shah، ڈاکٹر آشیروادی لال شریواستو کی Shujaud Daulah اور First Two Nawabs of Avadh کے علاوہ تاریخ فرح بخش کا انگریزی کم یاب ترجمہ Memoirs of Avadh اور مغل تاریخ پر ایک بہت ہی کمیاب کتاب Humayun in Iran کا بھی مجھے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ان سب کے علاوہ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن کی تاریخ ہند'' جیسی کہ ہندوستانی مصنّفین نے بیان کی ہے بھی وہ کتاب تھی جس سے میں نے فیض اٹھایا۔ان ثانوی مآخذوں کے علاوہ اصل فارسی مآخذوں کا بھی مجھے مطالعہ کرنے کا موقع ملا جن میں طبقاتِ ناصری، تاریخ فیروز شاہی، تاریخ داؤدی، منتخب التواریخ، اکبر نامہ (اور اس کے مآخذ گل بدن بیگم کا ہمایوں نامہ، بایزید بیات تذکرۂ ہمایوں و

اکبر، خان خاناں کی ترجمہ کردہ تزک بابری وغیرہ)، تزک جہاں گیری، عمل صالح، بادشاہ نامہ، منتخب اللباب، اور سیر المتاخرین جن میں شامل ہیں۔ یہی حال اُردو اور فارسی کا تھا۔ ان دونوں زبان کے ادب کا بھی اس زمانہ میں نے گہرا مطالعہ کیا۔ ۱۹۶۳ء میں ایک اور واقعہ پیش آیا جو میرے یونیورسٹی جانے میں معاون ہوا۔ شیعہ کالج سے شہنشاہ حسین موسوی صاحب رٹائر ہو گئے تھے اور فارسی لکچرر کی جگہ خالی تھی جس پر کالج کی منتظمہ مرزا محمد اطہر کو رکھنا چاہتی تھی لیکن اس وقت تک انھوں نے ایم۔ اے سال اوّل پاس کیا تھا۔ مرزا اطہر کے والد ملا طاہر صاحب سے میرے نظامی پریس جانے کے وقت کے تعلقات تھے۔ اطہر میاں میرے پاس آئے کہ ولی بھائی آپ اس سشن میں شیعہ کالج میں بطور اعزازی استاد پڑھا دیجئے۔ میں نے مسز جوشی کو یہ بات بتائی، انھوں نے منظوری دیدی۔ شیعہ کالج میں رات کو کلاسز لگا کرتے تھے اور کالج میرے مکان سے ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلے پر تھا۔ میرے شاگردوں میں بہت سے عمر میں مجھ سے زیادہ تھے۔ شیعہ کالج میں ایک سشن پڑھانے کے بعد دوسرے سال ۱۹۶۴ء میں مَیں یونیورسٹی پہنچ گیا (میرے علاوہ بھی آئندہ کافی گزیٹرز ڈپارٹمنٹ کے کمپائیلیشن آفیسر مختلف یونیورسٹیوں میں چلے گئے۔ ایس۔ بی۔ پی نگم نے ہسٹری میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور کروشیتر یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئے اور ابھی ریڈر ہی تھے جب انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر رام آسرے اوستھی قدیم ہندوستان کی تاریخ میں پی ایچ ڈی کر کے لکھنؤ یونیورسٹی آ گئے۔ ڈاکٹر صفی احمد ماڈرن انڈین ہسٹری میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے۔ وقار الحسن جو کسی زمانے کے میرے شاگرد بھی تھے، میڈیول انڈین ہسٹری میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا چلے گئے اور وہاں سے بحیثیت ڈائرکٹر رٹائر ہوئے اور اب برسوں سے رضا لائبریری، رام پور میں بحیثیت آفیسر آن اسپشل ڈیوٹی کام کر رہے ہیں۔ ایسا ہی کچھ دوسرے لوگوں کا بھی حال تھا۔ ڈاکٹر مس

سیگل نے شادی کے بعد گزیٹیر ڈپارٹمنٹ چھوڑا۔ ڈاکٹر کے۔ سی جین اسی ڈپارٹمنٹ سے رٹائر ہوئے۔

میرے یونیورسٹی جانے کا واقعہ بھی کافی دلچسپ ہے۔ ۱۳؍اکتوبر ۱۹۶۴ء کو میرے بیٹے سلیم انوارالحق کی ولادت بذریعہ آپریشن ہوئی اور آپریشن میں کچھ خرابی کی بدولت میری بیوی کو کافی دنوں ڈفرن اسپتال میں رہنا پڑا۔ ایک روز شام کو شریف الحسن صاحب جو اس وقت ایم۔اے کررہے تھے (اور بعد کو میرے تحت پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد ممتاز ڈگری کالج میں پرنسپل ہوگئے تھے)، میرے پاس آئے اور نورالحسن ہاشمی صاحب، جو اس وقت اُردو۔ فارسی ڈپارٹمنٹ کے سربراہ تھے، کا پیغام پہنچایا کہ فارسی لکچرر کی جگہ خالی ہے۔ دو دن کے اندر جوائن کر لیجیے۔ میرے لیے فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ یونیورسٹی لکچرر کی تنخواہ بغیر کسی الاؤنس اور پنشن کی آسانی کے تین سو روپیہ سے شروع ہوتی تھی۔ میں گزیٹیرز ڈپارٹمنٹ میں ساڑھے چار سو روپیہ ماہانہ پارہا تھا اور رٹائر ہونے کے بعد پنشن کا بھی حقدار تھا۔ ایسی ملازمت کو ترک کرنے کا فیصلہ کرنا سہل نہ تھا۔ لیکن میری بیوی نے جو خود تعلیم گاہ نسواں کالج میں اس وقت اُردو لکچرر تھیں، یہی رائے دی کہ تنخواہ کی کمی کی فکر نہ کیجیے۔ آپ کو آپ کے مزاج کے مطابق نوکری پیش ہورہی ہے اس میں خدا کی کچھ مصلحت ہوگی۔ آپ ضرور جوائن کر لیجیے۔ خدا کی کرشمہ سازیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ گورنمنٹ رضا ڈگری کالج میں درخواست دی تھی۔ پبلک سروس کمیشن سے انتخاب ہونا تھا۔ ایک ممبر حماد فاروقی صاحب کی کج بحثی کے سبب میرا انتخاب نہ ہوا۔ ہوا یہ کہ انھوں نے فارسی زبان کے مختلف ادوار کے متعلق سوال کیا۔ میں نے صحیح جواب دیا کہ ایران میں اسلام آنے کے بعد جب فارسی زبان نے عربی رسم الخط اختیار کیا اسی وقت سے زبان فارسی جدید کہلائی۔ وہ دری کو بھی ایک اسٹیج منوانا چاہتے تھے۔ میری ان کی بحث ہوتی

رہی۔ میں نے اکسپرٹ ڈاکٹر سعید حسن صاحب سے نظروں نظروں میں دخل دینے کو کہا۔ ان بے چارے نے نظریں نیچی کرلیں۔ فاروقی صاحب کی بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ممبر ڈاکٹر راما دھر مصرا نے فرمایا کہ کہاں تک پڑھاتے رہیے گا۔ دوسرا سوال کیجیے۔ یہیں سے مجھے انٹرویو کا نتیجہ معلوم ہو گیا۔ مجھے ڈاکٹر سعید کے رویہ سے سخت تکلیف ہوئی تھی۔ انٹرویو کے بعد میں سعید صاحب کی قیام گاہ پر گیا اور میں نے ان سے پوچھا کہ میں صحیح کہہ رہا تھا یا ڈاکٹر حماد فاروقی۔ بے چارے عربی کے عالم ہونے کی وجہ سے خود ہی اس سوال کا جواب نہ جانتے تھے۔ کئی سال کے بعد پتا چلا کہ جن صاحب کا انتخاب ہوا وہ میرے رشتے کی ایک چچی بیگم سلطانہ حیات اللہ صاحبہ کے چچا زاد بھائی تھے اور میرے چچا حیات اللہ انصاری صاحب نے حماد فاروقی صاحب سے ان کے لیے سفارش کی تھی۔ ان کو شاید یہ خبر نہ تھی کہ میں بھی ایک امیدوار تھا اور اس سفارش کا اثر براہ راست مجھ پر پڑے گا۔ اس وقت تک میں بھی دُنیاداری سے کم واقف تھا۔ پبلک سروس کمیشن کی ہدایات میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ سفارش کروانے والا رَد ہو جائے گا۔ لیکن عملی تجربہ یہ ہوا کہ یہ ہدایت صرف کاغذ تک محدود ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ مجھے انٹرویو میں شکست دینے والے ذکا الرحمٰن صاحب رضا ڈگری کالج چھوڑ کر سعودی عرب چلے گئے تھے لیکن وہاں سے واپس آنا چاہتے تھے۔ اس وقت میں لکھنؤ یونیورسٹی میں صدرِ شعبہ ہو چکا تھا۔ میری چچی سلطانہ حیات صاحبہ نے مجھ سے کہا تھا کہ بھیا ذکا الرحمٰن واپس آنا چاہتے ہیں تم انھیں اپنے شعبے میں رکھ لو۔ دوسری مرتبہ میں علی گڑھ میں رَد ہوا۔ اس وقت تک میں سمجھتا تھا کہ انٹرویو میں لوگ بلائے جاتے ہیں، جو بہتر ہوتا ہے اس کا انتخاب ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ سامنے آئی کہ کسی خاص جگہ کے لیے امیدوار پہلے سے تیار کرلیا جاتا ہے اور انٹرویو محض ایک رسمی بات ہوتی ہے۔
انٹرویو بورڈ کے سامنے جب گیا تو دیکھا کہ استاد محترم پروفیسر مسعود صاحب بحیثیت اکسپرٹ

موجود ہیں۔ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر تھے اور ہادی حسن صاحب صدرِ شعبہ۔ ذاکر حسین صاحب نے کچھ تفریحی سوالات کیے اور انٹرویو ختم ہوگیا۔ چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ اسی یونیورسٹی کے ایک دوسرے صاحب کا انتخاب ہوگیا۔ خیر کوئی بات نہ تھی لیکن عرصے کے بعد جب غالب صدی منائی جارہی تھی تو وہی صاحب مقالہ پڑھنے لکھنؤ تشریف لائے اور مسعود صاحب سے ملے بغیر واپس چلے گئے۔ برادرم نیر مسعود صاحب سے پتا چلا کہ ان کے جانے کے بعد مسعود صاحب نے فرمایا تھا کہ میں نے ان کو ولی الحق کو سپورٹ نہ کر کے رکھوایا تھا لیکن جب مشیت یہ تھی کہ میں اپنے وطن میں ان سے پہلے پروفیسر ہوجاؤں تو پھر علی گڑھ میں اس وقت لکچرر کیسے ہوتا؟ کئی سال کے بعد جب میں لکھنؤ میں کافی عرصے پہلے پروفیسر ہوچکا تھا، علی گڑھ یونیورسٹی میں نذیر احمد صاحب کے رٹائرمنٹ کے بعد پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی تو اس کے امیدوار اور حقدار وہی صاحب تھے جن سے میرے قریبی دوستانہ تعلقات ہوچکے تھے۔ نذیر احمد صاحب ان کے خلاف تھے اور اکسپرٹ نذیر صاحب کے قریبی دوست یعنی سید حسن صاحب اور عابدی صاحب تھے۔ اس لیے انتخاب نذیر صاحب کی مرضی کے مطابق ہی ہونا تھا۔ مفتی رضا انصاری صاحب کے ذریعہ مجھے پیغام بھیجا گیا کہ میں درخواست بھیج دوں اور علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر ہوجاؤں۔ میں نے یہ پیش کش رَد کردی اس لیے کہ میں اپنے وطن ہی میں پروفیسر تھا، دوسرے یہ کہ میری اہلیہ وطن ہی میں پرنسپل تھیں اور علی گڑھ جانے کا مطلب دو گھروں کا چلانا تھا۔ تیسرے یہ کہ کسی قریبی ساتھی کا حق مارنا شرافت کے خلاف تھا۔ آئندہ واقعات سے معلوم ہوا کہ میرا فیصلہ درست تھا۔ جب میں اپنے ساتھی کو زک دینے کو راضی نہ ہوا تو دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر نورالحسن انصاری کو جو اس وقت ریڈر تھے، علی گڑھ آنے کے لیے راضی کرلیا گیا لیکن انٹرویو سے پہلی شب کو لوکل امیدوار نبی ہادی صاحب اور نذیر صاحب میں صلح

ہو گئی اور فیصلہ کر لیا گیا کہ انھیں کو پروفیسر بنوا دیا جائے گا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ نورالحسن آئے لیکن ان کو اس فیصلہ کی اطلاع نہ دی گئی۔ انٹرویو ہوا اور وہ رَد ہونے کا داغ لے کر چلے گئے۔ اگر میں علی گڑھ کے سیاست داں صاحب کی پیش کش قبول کر لیتا تو میرا بھی یہی حشر ہوتا۔ تیسری مرتبہ میں انھیں نورالحسن انصاری صاحب کے مقابلے میں رَد ہوا تھا۔ دہلی یونیورسٹی میں لکچرر کی جگہ مشتہر ہوئی تھی میں نے درخواست دے دی تھی اور انٹرویو میں بلایا گیا تھا۔ دہلی جاتے وقت راستے میں علی گڑھ میں رُکتا گیا۔ نذیر صاحب سے معلوم ہوا کہ ایک اسی یونیورسٹی کے امیدوار کا تقرر طے ہو چکا ہے اور جانا بے کار ہے۔ میں بہر حال گیا اور رَد ہو گیا لیکن قدرت کا کھیل یہ دیکھیے کہ دہلی یونیورسٹی میں آئندہ جب پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی اور وہی صاحب (یعنی ڈاکٹر نورالحسن) امیدوار ہوئے تو میں جو اُن کے مقابلے میں ایک وقت رد کیا چکا تھا، ان کی سلکشن کمیٹی میں بحیثیت اکسپرٹ موجود تھا۔ ان تینوں واقعات کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیشہ یقین رکھنا چاہیے کہ کارسازِ مطلق ہمارے حق میں جو کرتا ہے وہی بہتر ہوتا ہے خواہ وقتی طور پر وہ تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہو۔ جب وطن لکھنؤ ہی میں مجھے سب سے پہلے پروفیسر ہونا تھا تو رام پور، علی گڑھ اور دہلی میں میرا تقرر کیسے ہوتا۔

ذکر کر رہا تھا لکھنؤ یونیورسٹی میں اپنے تقرر کا اور بات کرنے لگا آئندہ کے واقعات کی۔ لکھ چکا ہوں کہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی پیش کش کے مطابق مجھے دو روز کے اندر جوائن کرنا تھا اور میری پوزیشن یہ تھی کہ میں سکریٹریٹ میں مستقل تھا اور گزیٹرز میں ڈیپوٹیشن پر اور ان دونوں سرکاری محکموں سے دو دنوں میں خلاصی حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ لیکن پھر تائید ایزدی شاملِ حال ہوئی۔ دوسرے روز دفتر جا کر مسز جوشی کو اس پیش کش سے مطلع کیا۔ بہت خوش ہوئیں فوراً دفتر کے ہیڈ کلرک کو بلوایا اور مجھے Relieve کرنے کے کاغذات درست کرنے کو کہا۔ ساتھ ہی

چشتی صاحب آئی ۔ اے۔ایس کو، جن کے شعبے میں مَیں مستقل تھا، ٹیلی فون کیا کہ ڈاکٹر انصاری کو میں Relieve کر کے واپس بھیج رہی ہوں ۔ اس عرصے میں تم بھی Relieve کرنے کی کارروائی مکمل کرلو۔ ایک خط یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر راؤ کو لکھا کہ ڈاکٹر انصاری کو Relieve کیا جارہا ہے ان کا انتظار کیا جائے۔ یہ سب ان سینئر موسٹ آئی۔اے۔ ایس۔خاتون نے کیا جن سے کچھ ہی روز پہلے میری کافی جھک جھک ہو چکی تھی۔اس کو بھی بیان کرتا چلوں۔تحریر کر چکا ہوں کہ مسز جوشی کا حکم تھا کہ ان کا درست کیا ہوا چیپٹر کمپائیلیشن آفیسر پہلے صاف کریں پھر وہ ٹائپسٹ کے پاس بھیجا جائے۔ مسز جوشی میرا ایک کافی طویل مضمون دیکھ رہی تھیں ۔ میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور جہاں ضرورت ہوتی تھی ان کو سمجھاتا جاتا تھا۔لنچ کے وقت تک یہ کام ہوتا تھا اور لنچ کے بعد وہ دوسرے دفتری کام دیکھتی تھیں اور کمپائیلیشن آفیسر اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔جس روز کا ذکر ہے اس دن بھی یہی ہوا۔لنچ کے وقت میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔تقریباً تین بجے اسٹیٹ اَیڈیٹر کا چپراسی آیا اور بولا کہ میڈم سلام کہہ رہی ہیں۔جب میں ان کے سامنے گیا تو انھیں انتہائی چراغ پا پایا۔ بولیں کہ میں نے ان کے حکم کی خلاف ورزی کیوں کی۔ میں نے پوچھا کہ کیا خلاف ورزی ہوئی۔ کہنے لگیں کہ Chapter صاف لکھے بغیر ٹائپسٹ تک کیسے چلا گیا۔(ٹائپسٹ کوئی لفظ پوچھنے ان کے پاس چلا گیا تھا)۔ میں تم سے جواب طلبی کروں گی۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے کہا طلب کیجیے۔میں جواب دے دوں گا۔ یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔موڈ سخت خراب تھا۔ میں نے درخواست لکھی کہ دفتر میرے مکان سے کافی دور ہے اور اتنی دور سائیکل چلانا میری تندرستی پر اثر کر رہا ہے۔لہٰذا مجھے سکریٹریٹ واپس بھیج دیا جائے۔اسے میں نے چپراسی کے ہاتھ ان کے پاس بھیج دیا۔ پانچ بجنے سے کچھ پہلے چپراسی آیا کہ میڈم سلام کہہ رہی ہیں۔ میں خراب موڈ لیے ہوئے

گیا۔ انھیں انتہائی اچھے موڈ میں پایا۔ گھریلو باتیں پوچھتی رہیں یہ گویا میرا موڈ ٹھیک کرنے کی کارروائی تھی۔ جب میں کچھ نارمل ہوگیا تو پھر وہی سوال ہوا کہ چیپٹر بغیر صاف کیے ہوئے ٹائپسٹ تک کیسے پہنچ گیا۔ میں نے کہا کہ میں چیپٹر دیکھنے کے وقت آپ کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پھر مجھے کیا معلوم کہ اصلاح کردہ چیپٹر آپ نے کہاں بھیجا۔ کہنے لگیں کہ میں نے ایڈیٹر ولیم مودی سنگھ کو بھیج دیا تھا۔ میں نے کہا کہ پھر ان سے پوچھے کہ انھوں نے مجھے بھیجنے کے بجائے اسے ٹائپسٹ کو کیوں بھیج دیا۔ بات سمجھ میں آ گئی اور یہ کہہ کر اٹھیں کہ کل مودی سنگھ سے جواب طلب کروں گی۔ اس تمام گفتگو کے بعد میرا خط نکال کر سامنے رکھ دیا کہ کیا اب تم اسے واپس لے سکتے ہو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

میں دوپہر کو گزیٹیرز ڈپارٹمنٹ سے **Relieve** ہوکر جب سکریٹریٹ پہنچا تو وہاں بھی کاغذات تیار تھے۔ میں نے وہاں سے بھی **Relieve** ہوکر اسی روز یونیورسٹی جوائن کر لی۔ دوسرے دن کا سوال ہی نہ اٹھا۔ یونیورسٹی کا قانون تھا کہ اگر کسی عارضی ٹیچر کی ملازمت تعطیلات گرما سے پہلے چھ مہینے سے کم ہوتی تھی تو تعطیلات گرما کی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ میرے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا۔ میں پھر گزیٹیرز ڈپارٹمنٹ گیا۔ مسز جوشی سے بات ہوئی۔ کہنے لگیں کہ تعطیلات کے زمانے میں پھر یہاں چلے آؤ۔ چنانچہ ایک ہی دن میں سکریٹریٹ سے ہوتا ہوا گزیٹیر ڈپارٹمنٹ چلا آیا اور تعطیلات ختم ہونے کے بعد جب یونیورسٹی جوائن کرنا تھی تو پہلے ہی کی طرح ایک روز میں دونوں سرکاری محکموں سے نجات پا کر یونیورسٹی چلا گیا۔ مسز جوشی کی خواہش پر اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک گزیٹیرز کے لیے ابواب لکھتا رہا۔

یہاں سرکاری ملازمتوں کا میرا دور ختم ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اتنا اور عرض کرنا ہے کہ ملازمت کے اس تقریباً سولہ سال میں یونیورسٹی سروس کا خیال کبھی دل سے نہیں گیا اور

آخرایک زبردست نقصان قبول کر کے میں نے اس مقصد کو حاصل کرلیا۔اس سرکاری ملازمت کے دوران مجھے زیادہ تر مختلف آئی۔سی۔ایس اور آئی۔اے۔ایس مرتبہ کے افسروں سے سابقہ پڑا جن میں تقریباً سبھی ہندو حضرات تھے۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی ہوتی ہے سوا ایک صاحب جے۔کے پانڈے کے (جو آئی۔اے۔ایس تک نہ تھے اور جن کی ایذا پسند طبیعت نے پورے ڈپارٹمنٹ کی ذہنیت بگاڑ دی تھی) باقی سب انتہائی شریف، ہمدرد اور دوستانہ طبیعت کے مالک تھے۔کے۔اے۔پی۔اسیٹی ونس کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ مدارج کے اختلاف کے باوجود وہ میرے ایک اچھے دوست تھے۔اے۔این۔جھا آئی۔سی۔ایس ایگری کلچر ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری تھے۔ (اس وقت اسپشل اور پرنسپل سکریٹری نہیں ہوتے تھے)۔جن کے تحت پلاننگ ڈپارٹمنٹ بھی تھا۔ٹی۔ڈی پانڈے صاحب ڈپٹی سکریٹری تھے۔وہ لنچ جھا صاحب کے کمرے میں انھیں کے ساتھ کرتے تھے۔اکثر چائے میں شریک ہونے کے لیے مجھے بھی بلالیا جاتا تھا اور افسری ماتحتی کی تفریق چھوڑ کر تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح دوستانہ انداز میں گفتگو ہوتی تھی۔ایک موقع پر جھا صاحب کا یہ جملہ مجھے آج تک یاد ہے کہ انصاری صاحب یہ نہ سمجھیے کہ آئی۔سی۔ایس ہونے کی وجہ سے میں ایک بڑا آدمی ہوں۔مہینہ کی آخری تاریخوں میں میرا بھی وہی حال ہوتا ہے جو آپ کا۔سکریٹریٹ میں افسروں کے مرتبہ کے صرف ایک مسلمان حنفی صاحب سے کچھ ساتھ ہوا۔موصوف میرے ایک ہمدرس غلام قادر حنفی کے چچا تھے اور افسروں میں سب سے نیچی پوسٹ اسٹیٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے لیکن چہرے پر ہمیشہ افسریت کا جلال قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔نتیجتاً ایک ہی ڈپارٹمنٹ میں ہوتے ہوئے مجھ سے ان سے سلام دعا بھی نہ تھی۔اس لیے کہ میں ان لوگوں کو سلام کرنے سے ہمیشہ بچتا ہوں جو سلام لینے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔پندرہ سال کے عرصے میں مجھے ایک مرتبہ بھی کسی کے تعصب کا شکار

ہونے کا احساس نہ ہوا۔ بلکہ جیسا لکھ چکا ہوں، اپنے ذاتی معاملات تک میں بھی مجھے اپنے غیر مسلم افسروں سے مدد ملتی رہی رہا Statistics Department کے ڈائرکٹر جے۔ کے پانڈے کا جہاں تک سوال ہے وہ بے چارے احساس کمتری کا شکار ہونے کی وجہ سے ایذا پسند بن گئے تھے۔ ان کے عہد میں ان کا ڈپارٹمنٹ پانڈوؤں اور چوبوں کا ڈپارٹمنٹ کہلاتا تھا۔ اس ڈپارٹمنٹ میں تین سال میں دماغی الجھن میں رہا لیکن ایسی ہی کیفیت سے تقریباً اتنے ہی زمانے یونیورسٹی میں ایک مسلمان کرم فرما کی مہربانی سے دوچار ہونا پڑا جس کا ذکر آئندہ کروں گا۔

سرکاری ملازمت کے سلسلے کا ایک واقعہ اور قابلِ تحریر ہے۔ مستقل سرکاری ملازموں کو مکان بنانے کے آٹھ ہزار روپے تک قرض ملتا تھا۔ لوگ Cooperative Society سے قرض لے کر آٹھ آنے اسکوائر فٹ زمین ماہ نگر میں خرید کر آٹھ ہزار روپے House Building Allowance لے کر شاندار مکان بنوا رہے تھے۔ میرے دل میں بھی مکان بنانے کا خیال آیا اور Cooperative Society کا ممبر بن گیا اور اتنے شیئر خرید لیے کہ دو ہزار روپے قرض مل سکے۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ میں اس پوزیشن میں بھی نہ تھا کہ اگر دو ہزار روپے قرض لیتا تو اس کی ادائیگی کی قسطیں ادا کر سکتا۔ چنانچہ قرض لینے اور مکان بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن Cooperative Society کا ممبر بنا رہا۔ جس زمانے میں میں گزیٹیرز ڈپارٹمنٹ میں تھا کئی سال پہلے میرے ساتھ فائننس ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے والے ایک صاحب محمد شمیم پریشان صورت بنائے ہوئے تشریف لائے کہ ان کی بیوی سخت علیل ہیں اور ان کے علاج کے لیے کواپریٹیو سوسائٹی سے قرض لینا چاہتے ہیں جس کے لیے ضمانت درکار تھی۔ میں نے ضمانت کے فارم پر دستخط کر دیے۔ کئی سال کے بعد جب میں یونیورسٹی پہنچ چکا تھا تو کواپریٹیو سوسائٹی کا رجسٹرار کے نام میری تنخواہ سے آٹھ ہزار روپے کاٹ کر کواپریٹیو ڈپارٹمنٹ کو دینے کا

خط آیا۔ معلوم ہوا کہ شمیم کواپریٹیو سوسائٹی سے روپے لے کر مستقل نوکری چھوڑ کر پاکستان بھاگ گئے تھے اور قرض بڑھ کر آٹھ ہزار ہو چکا تھا جسے ضامنوں سے وصول کیا جانا تھا۔ کچھ قسطیں میری تنخواہ سے کٹیں اور اس کے بعد مقدمے بازی کے نتیجہ میں خود کواپریٹیو سوسائٹی کی لاپروائی ثابت ہوئی اور Share Money کے علاوہ تقریباً ایک ہزار روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ پوری سرکاری ملازمت میں مَیں نے Provident fund بھی نہ لیا تھا۔ اس پر یہ نقصان مزید تھا۔ مکان بنانے کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ غالباً قدرت کو منظور نہ تھا کہ اپنا مکان بنتا۔ یونیورسٹی ملازمت کے زمانے میں بھی یونیورسٹی کے ملازمین کی کوآپریٹیو کا ممبر بنا تھا اور وہاں بھی آٹھ ہزار روپے کھو بیٹھا۔

آزادی کے بعد جتنا جتنا وقت گزرتا جاتا ہے اس میں البتہ اپنے قریب ترین لوگوں کے انداز میں بھی تعصب کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ میرے ایک دوست تھے ہائی کوٹ کے رٹائرجج ورما صاحب۔ ایک روز باتوں ہی باتوں میں فرمانے لگے کہ بھائی آپ لوگ بچے زیادہ پیدا کرتے ہیں۔ مجھے پوچھنا پڑا، ورما صاحب آپ کی کتنی اولادیں ہیں۔ فرمانے لگے چار۔ میں نے جواب دیا کہ میری دو ہیں۔ کیا آپ کا اعتراض میں آپ کے سلسلے میں دہرا سکتا ہوں؟ اسی طرح طالبعلمی کے دور کے ساتھی پیتھالوجی ڈپارٹمنٹ کے رٹائرڈ پروفیسر ڈاکٹر وہال ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ بھائی ایک مرتبہ بی۔ جے۔ پی۔ گورنمنٹ کا تجربہ تو کیجیے۔ ان کے لیے بی۔ جے۔ پی۔ قومی پارٹی تھی اور میرے لیے کمیونل پارٹی۔ جب دوستوں سے ایسے ڈنک لگتے رہتے ہیں تو غیروں کا کیا ذکر۔ کیا آزادی کے لیے قربانیاں دینے والوں نے کبھی سوچا ہوگا کہ آزاد ہونے کے بعد وطن فرقہ پرستوں، گنڈوں اور رشوت خوروں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا؟

ہر شاخ پہ الّو بیٹھے ہیں، انجام گلستاں کیا ہوگا

گیارہواں باب

یونیورسٹی کی ملازمت کا اوّلین دور

المنت للہ کہ نیازم بہ نسب نیست　　　　اینک بہ شہادت طلبم لوح و قلم را

جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے نومبر کے چوتھے ہفتے کے کسی روز ۱۹۶۴ء میں پہلی مرتبہ یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرار چارج لیا تھا۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب سے میری شناسائی ۱۹۴۵ء سے تھی، جب انھوں نے یونیورسٹی میں بحیثیت اُردو لکچرار چارج لیا تھا۔ چند سال کے بعد انھوں نے فارسی میں بھی ایم۔اے کرنا چاہا۔ اس وقت تک میں فارسی میں بھی ایم۔اے کر چکا تھا۔ چنانچہ میری ہی کتابیں اور نوٹس ہاشمی صاحب کے کام آئے تھے۔ کبھی کبھی جب ضرورت پڑتی تھی تو مجھ سے مشورہ بھی کرلیا کرتے تھے۔ فارسی کے کورس میں اس وقت سہ نثر ظہوری، شبنم شاداب، اخلاق ناصری کی ایسی مشکل کتابیں داخل تھیں۔ نظم میں شاہنامہ، سکندر نامہ، غزلیات حافظ و نظیری و غالبؔ وغیرہ کے علاوہ عرفیؔ اور خاقانیؔ کے مشکل قصائد بھی سلیبس (Syllabus) کا حصّہ تھے۔ میری صلاحیتوں سے کچھ حد تک وہ اسی وقت سے واقف تھے لیکن میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس وقت کی باتیں ان کو اس حد تک یاد ہوں گی کہ ان کی بنیاد پر انھوں نے مجھے یونیورسٹی کی ملازمت قبول کرنے کی وائس چانسلر کے ذریعہ سے خود پیش کش کرائی۔ چنانچہ چارج لینے کے

بعد ہی میں نے ان سے سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو مجھے ڈپارٹمنٹ میں لینے کا خیال کیسے پیدا ہوا۔ فرمایا کہ آپ کے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کے ایک ممتحن سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ بہت عرصے کے بعد اتنا اچھا تحقیقی مقالہ دیکھنے کو ملا۔ اسی وقت سے آپ کو ڈپارٹمنٹ میں شامل کرنے کی خواہش تھی۔ البتہ یہ شبہ ضرور تھا کہ شاید آپ سرکاری ملازمت چھوڑ کر نہ آئیں۔ بہرحال آپ آ گئے اور امید ہے کہ آپ اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے خود کو ایک اچھا استاد ثابت کریں گے۔ بہرحال ہاشمی صاحب میری طرف سے کبھی ناامید نہ ہوئے۔ یہاں یہ تحریر کرنا بھی مناسب ہے کہ اس وقت سے پہلے بھی مواقع آتے رہے جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں آ سکتا تھا۔ میرے ایم۔اے۔ کرنے کے چند ہی سال بعد عبدالقوی فانؔی صاحب رٹائر ہو گئے لیکن غالباً اسی سال نذیر احمد صاحب نے ظہوریؔ پر پی۔ایچ۔ڈی کر لیا تھا اور اس جگہ کے لیے وہ امیدوار تھے اور مسعود صاحب ان کی صلاحیت اور محنت کے قائل تھے۔ ایسے میں میرے لیے اس جگہ کی خواہش کرنا ہیچ بے کار تھی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد مسعود صاحب بھی رٹائر ہو گئے لیکن اس وقت شعبہ میں صدارت کے لیے سخت کشمکش تھی۔ آل احمد سرور صاحب بحیثیت سینئر ریڈر صدر بننا چاہتے تھے اور یوسف حسین موسوی صاحب کا دعویٰ تھا کہ اصل شعبہ فارسی ہے جس میں بعد کو اُردو کو شامل کر لیا گیا، اس لیے فارسی کے استاد ہی کو صدر شعبہ ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی وائس چانسلر تھے۔ انھوں نے موسوی صاحب کی دلیل کو قبول کرتے ہوئے انھیں کو صدر بنا دیا اور سرور صاحب نے یونیورسٹی سے استعفیٰ دیدیا۔ موسوی صاحب نے اس خیال سے کہ کہیں مسعود صاحب کے صاحبزادے اختر مسعود صاحب جوڑ توڑ کر کے اس جگہ پر نہ آ جائیں، مسعود صاحب کے رٹائرمنٹ سے خالی شدہ جگہ کو ضرورت سے زیادہ قرار دیتے ہوئے یونیورسٹی کو واپس کر دیا۔ میرے لیے یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ فانؔی

صاحب کے رٹائر ہونے پر نذیر صاحب ڈپارٹمنٹ میں آ گئے تھے۔ اس عرصے میں انھیں کچھ مہینوں کے لیے ایران جانے کا موقع مل گیا اور ان کی جگہ عارضی طور سے خالی ہوگئی۔ لیکن اپنی گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے مَیں اس پوزیشن میں نہ تھا کہ سرکاری ملازمت چھوڑ کر چند مہینے یونیورسٹی کی ملازمت کر کے آئندہ بے کاری کا خطرہ مول لے سکتا۔ اور الہٰ آباد یونیورسٹی کے ایک صاحب ڈاکٹر رغیب حسین نے یہ عارضی ملازمت حاصل کرلی۔ ایران سے واپسی کے بعد کچھ عرصہ لکھنؤ یونیورسٹی میں رہ کر سرور صاحب کی کوشش سے نذیر صاحب علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے اور اس وقت مستقل طور سے جگہ خالی ہوگئی۔ رغیب صاحب کو پھر اس پر تقرر مل گیا۔ غالباً ان کی کوشش کی وجہ سے کافی عرصے تک یہ جگہ مشتہر ہی نہ ہوئی اور رغیب صاحب اس پر کام کرتے رہے۔ میں یونیورسٹی سے بے تعلق تھا۔ کافی عرصے کے بعد جب یہ جگہ مشتہر ہوئی تو میں نے درخواست دے دی اور انٹرویو کا انتظار کرتا رہا جو کبھی بھی نہ ہوا۔ سبب یہ تھا کہ رغیب صاحب نے کچھ دوسرے عارضی لکچرروں کے ساتھ مل کر کوشش کر کے یونیورسٹی کی مجلسِ انتظامیہ (Executive Council) سے یہ فیصلہ کرالیا کہ جن عارضی لکچرروں کی ملازمت ایک خاص عرصے تک بغیر برک کے جاری رہی ہے انھیں سلکشن کمیٹی کا سامنا کیے بغیر مستقل کر دیا جائے۔ اس فیصلے کے تحت میرا درخواست دینا بے کار ہو گیا اور رغیب حسین صاحب مستقل کر دیے گئے۔ یہ درخواست دینا میرے لیے آئندہ پریشانی کا سبب بنا، اس لیے کہ رغیب حسین صاحب دل میں یہ بات لے کر بیٹھ گئے کہ ولی الحق ان کو بے دخل کر کے خود لکچرر بننا چاہتے تھے جب کہ اس وقت میں ان کے نام تک سے واقف نہ تھا۔ (اس بات کا علم مجھے ڈپارٹمنٹ جوائن کرنے کے بعد ہوا)۔

اس وقت اُردو۔ فارسی ایک شعبہ تھا۔ آل احمد سرور صاحب کے جانے کے بعد

احتشام صاحب اُردو ریڈر ہو گئے تھے لیکن جب وہ بحیثیت پروفیسر الہٰ آباد یونیورسٹی چلے گئے تو نورالحسن صاحب ہاشمی ان کی جگہ اردو ریڈر ہو گئے۔ موسوی صاحب کے رٹائرمنٹ کے بعد عبدالاحد خاں خلیل صاحب جو اُردو لکچرر تھے لیکن اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ایم۔ اے تھے عارضی طور سے فارسی ریڈر ہو گئے۔ اس وقت یو۔ جی۔ سی کے احکام کے مطابق لکچرر اور ریڈر کی جگہوں کے لیے پی۔ ایچ۔ ڈی لازمی کوالی فیکیشن ہو گئی تھی لیکن خلیل صاحب کو اطمینان تھا کہ جب سلکشن کمیٹی ہوگی تو کیونکہ وہ پہلے سے کام کر رہے تھے اس لیے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی سے مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔

یونیورسٹی جوائن کرنے کے بعد میرے سبھی اساتذہ سے بہترین تعلقات تھے بشمول رغیب صاحب جن کے ساتھ اکثر تفریحاً حضرت گنج وغیرہ جانے میں ساتھ ہوتا تھا۔ غالباً ۱۹۶۶ء میں فارسی ریڈر کی جگہ کے لیے انٹرویو ہوا۔ اکسپرٹ کی حیثیت سے پٹنہ سے ڈاکٹر اقبال حسین صاحب اور عطا کاکوری صاحب کو بلایا گیا تھا۔ خلیل صاحب اور رغیب صاحب دونوں حضرات نے درخواست دی لیکن رغیب صاحب نے خلیل صاحب کو سمجھا دیا کہ انھوں نے تو درخواست محض اس لیے دی کہ کہیں ان کے تنہا امیدوار ہونے کی وجہ سے انتخاب ملتوی نہ ہو جائے۔ خلیل صاحب سیدھے سادھے صاف دل پٹھان تھے۔ انھیں اس بات کا یقین ہو گیا۔ انٹرویو کے چند روز پہلے یکا یک خبر آئی کہ رغیب صاحب بہار یونیورسٹی، مظفر پور سے ڈی۔ لٹ ہو گئے، اگرچہ ان کا ڈی۔ لٹ کے لیے رجسٹریشن لکھنؤ یونیورسٹی میں تھا۔ (دو یونیورسٹیوں میں بیک وقت رجسٹریشن غیر قانونی ہے)۔ خلیل صاحب کھیل اب بھی نہ سمجھ سکے۔ انٹرویو کے ایک روز پہلے دونوں اکسپرٹ حضرات بیگم شبیر فاطمہ صاحبہ کے ساتھ لکھنؤ تشریف لے آئے۔ سلکشن کمیٹی ہوئی۔ خلیل صاحب فارسی میں صرف ایم۔ اے ہونے کی وجہ سے ڈس کوالی فائی ہو گئے۔ رغیب

صاحب اکسپرٹ صاحبان کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکے (یہ بات کافی عرصے بعد مجھے پروفیسر اقبال حسین صاحب نے بتائی) کمیٹی میں غور ہونے لگا کہ پوسٹ کا دوبارہ اشتہار دیا جائے لیکن شری دھرمصرا صاحب نے، جن کے یہاں رغیب صاحب حاضری دیا کرتے تھے اور جو پہلے بھی ان کی مدد کر چکے تھے، کہا کہ آئندہ بھی کوئی نیا امیدوار نہ ہوگا اس لیے رغیب حسین ہی کو ریڈر بنا دیا جائے۔ اس فیصلے کے بعد ایک طوفان آ گیا۔ خلیل صاحب سے سب کو ہمدردی تھی۔ وہ ڈپارٹمنٹ میں کھلے عام رغیب حسین کو برا بھلا کہتے تھے۔ انھوں نے ان کا نام ''احراری'' رکھ دیا تھا جس کے ابجد کے حساب سے چار سو بیس عدد ہوتے ہیں۔ انھوں نے فیصلہ پر نظر ثانی کے لیے چانسلر کے یہاں درخواست دی اور رغیب صاحب کے کیریر کے متعلق اطلاعات جمع کرنے لگے۔ اس کام میں الہٰ آباد یونیورسٹی کے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب نے ان کی کافی مدد کی۔ پتا چلا کہ رغیب حسین مجھ سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے لیکن ایم۔ اے انھوں نے مجھ سے پانچ سال بعد کیا تھا۔ ہائی اسکول میں وہ تیسری یا چوتھی کوشش میں کمپارٹمنٹل پا کر پاس ہوئے تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں بھی تیسری کوشش میں کمپارٹمنٹل پایا تھا۔ بی۔ اے بھی کئی مرتبہ کوششوں کے بعد سپلی منٹری امتحان میں پاس ہوئے تھے۔ اسی وقت الہٰ آباد یونیورسٹی میں عربی کے استاد نامی صاحب کی صاحبزادی شبیر فاطمہ سے ان کی شادی ہوگئی اور وہ ایم۔ اے میں فرسٹ ڈویژن پاس ہو گئے۔ انھوں نے ڈاکٹریٹ بھی حاصل کر لی لیکن کبھی ان کا تحقیقی مقالہ کسی کو نہ معلوم ہو سکا اور اس کے بعد وہ پی۔ ایچ۔ ڈی ہونے کی وجہ سے لکھنؤ یونیورسٹی آ گئے۔ آئندہ جب فارسی اور اُردو الگ الگ شعبے ہو گئے تو خلیل صاحب نے اس اطلاع سے متعلق کاغذات مجھے دے دیے اس لیے کہ انھیں یقین تھا کہ رغیب حسین صاحب کی احساسِ کمتری کی وجہ سے پیدا ہونے والی سازشی فطرت کا مجھے نشانہ بننا ہے۔ چانسلر نے رغیب صاحب اور خلیل صاحب دونوں کو بلایا۔

خلیل صاحب کی پٹھانیت نے وہاں بھی زور مارا اور انھوں نے اپنا کیس وہاں بھی خراب کرلیا۔ رغیب صاحب کے باقاعدہ ریڈر ہونے کے بعد ہاشمی صاحب نے فارسی سے متعلق سب کام انھیں دے دیا۔ ان کی پہلی کارروائی یہ تھی کہ ایم۔ اے اُردو کے ٹائم ٹیبل سے میرا نام نکلوادیا۔ اس کے بعد مجھ میں اور ڈاکٹر شکیل میں جو انتہائی شریف انسان تھے، غلط فہمیاں پیدا کرانے کی کوشش کی لیکن ہم دونوں ہی، ساتھ ہی ہاشمی صاحب بھی، رغیب صاحب کو سمجھ چکے تھے۔ اب یہ وہ معصوم سے سیدھے سادھے رغیب حسین نہیں تھے جو ریڈر بننے سے پہلے نظر آتے تھے۔

۱۹۶۷ء میں فارسی لکچرر شپ کی دو جگہوں کے لیے سلکشن کمیٹی بیٹھی جس میں مستقل جگہ کے لیے میرا اور عارضی جگہ کے لیے ڈاکٹر چودھری ثروت علی کا انتخاب ہوا تھا لیکن ایک احتجاج کی وجہ سے ثروت علی صاحب کا انتخاب نامنظور ہوگیا۔ مستقل لکچرر شپ کی ابتدا کا ایک واقعہ دلچسپ ہے جو درج ذیل ہے۔ یونیورسٹی کا قاعدہ تھا کہ مستقلی سے پہلے میڈیکل ٹسٹ ضروری تھا۔ اس وقت میری بہترین تندرستی تھی۔ باڈی بلڈنگ کا شوق اپنے عروج پر تھا اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے کسی بیماری کا شکار بتایا جائے گا۔ میڈیکل بورڈ میں سرجری کے پروفیسر ڈاکٹر آر۔ وی سنگھ (جو بعد کو میرے دوست اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوگئے)، میڈیسن کے پروفیسر ڈاکٹر کنور اور امراض چشم کے پروفیسر ڈاکٹر گپتا تھے۔ میڈیکل بورڈ کے چک اپ کے بعد میں ایکسرے ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر ڈاکٹر لال کے پاس بھیجا گیا۔ انھوں نے اسکریننگ کرنے کے بعد سوال کیا کہ کیا آپ کی سانس پھولتی ہے، مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا کہ آپ کے کالج میں نمائش کے موقع پر میرے پھیپھڑوں کا ٹسٹ لے کر بتایا گیا تھا کہ وہ انگریز ہوابازوں کے معیار پر ہیں۔ لال صاحب فرمانے لگے معاملہ پھیپھڑوں کا نہیں ہے۔ آپ کا دل بڑھا ہوا یعنی ڈائی لیٹڈ ہے۔ میں دوبارہ میڈیکل بورڈ کے سامنے بھیجا گیا۔ یہی سوال ڈاکٹر کنور نے کیا اور

ساتھ ہی فرمایا کہ ایک وقت وہ ہوتا ہے جب آپ لوگ بتاتے ہیں کہ یہ تکلیف ہے اور ہم (یعنی ڈاکٹر) کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے اور ایک وقت ہم (یعنی ڈاکٹر) کہتے ہیں کہ آپ کو یہ تکلیف ہے اور آپ لوگ انکار کرتے ہیں ۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا آیئے ہم آپ دونوں دوڑیں اور دیکھیں کہ کس کی سانس پھولتی ہے۔ بہر حال فیصلہ یہ ہوا کہ مجھے بھرتی کر کے اور زیادہ Ckeekup کیا جائے Dilatation of Heart کے متعلق مجھے علم تھا کہ لا علاج مرض ہے۔ گزیٹیرز ڈپارٹمنٹ میں میرے ایک ساتھی اس کے مریض تھے اور انگلینڈ میں جا کر آپریشن کرایا تھا لیکن بچ نہ سکے تھے۔ میں اس تشخیص سے سخت پریشان تھا۔ نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ یونیورسٹی واپس جا کر سیڑھیاں چڑھنے لگا تو واقعی سانس پھول گئی۔ جس ڈاکٹر کے پاس جاتا تھا (بشمول اپنے دوست ڈاکٹر حلیم اور ڈاکٹر کوہلی) وہ یہی کہتا تھا کہ اگر پروفیسر لال نے بتایا ہے تو درست ہی ہوگا۔ اس وقت مجھے طالب علمی کے زمانے کے زور خانے (جمنیزیم) کے ساتھی ڈاکٹر جے۔ بی چارلس یاد آئے جو ملیٹری ڈاکٹر بھی تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور پوری بات بتائی۔ انھوں نے بہت اچھی طرح دیکھنے کے بعد میڈیکل کالج کے ڈاکٹروں کو برا بھلا کہنے کے بعد پوچھا کہ تم نے انھیں بتایا تھا کہ تمھارا جسم ورزشی ہے۔ میں نے کہا کہ میرا جسم کھلا ہوا تھا اور اس بات کی خود گواہی دے رہا تھا۔ مجھے بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ انھوں نے پھر میڈیکل کالج والوں کو برا بھلا کہا (ڈاکٹر کنور غالباً ان کے کلاس فیلو رہ چکے تھے) اور رائے دی کہ تمھارا دل Athletic Heart ہے نہ کہ Dilated Heart۔ میرے لیے دوسری نئی اصطلاح تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ کیوں مجھے بہلا رہے ہو۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ انھوں نے کتابیں کھولیں اور کہنے لگے کہ جو لوگ سخت ورزش کرتے ہیں ان کے جسم کے ساتھ ساتھ خون کو زیادہ پھینکنے کی وجہ سے دل بھی حدوں کے باہر چلا جاتا ہے۔ تمھارا یہی معاملہ ہے۔ بہر حال میں اسپتال میں داخل ہوا اور دل تندرست پایا گیا۔ آئندہ زندگی

میں بھی ایک مرتبہ سینے میں کچھ تکلیف ہوئی۔ اپنے ایک ماہر قلب دوست کے پاس گیا۔ انھوں نے انجائنا پکٹورس تجویز کیا اور برسوں علاج کیا۔ دس بارہ سال قبل جب بنگلور میں میرا پورا چک اپ ہوا تو دل تندرست بتایا گیا۔ میں نے اپنے دوست ڈاکٹر منصور کو یہ رپورٹیں دکھلائیں۔ کہنے لگے کسی وقت آپ کو زیادہ تکلیف ہوئی ہوگی اور دل کی دوسری رگیں کھل گئیں اور نیچرل بائی پاس ہوگیا۔ بہرحال ڈاکٹروں نے میرے ورزش کے شوق کو تقریباً ختم کردیا۔ دل کے مریض ہونے کا خیال دل سے اس وقت نکلا جب ایران میں مجھے بہت وزنی مگدر چلانے کی ضرورت ہوئی جس کا ذکر کہیں اور کیا گیا ہے۔ اگر میں دل کا مریض ہوتا تو یقیناً ان وزنی مگدروں کو ہلاتے وقت ہارٹ فیل ہوجاتا۔ ریڈر ہونے کے کچھ ہی عرصے کے بعد اپنی سازشی فطرت اور دوڑ دھوپ کے باعث رغیب حسین صاحب نے شعبہ کو تقسیم کروالیا اور بحیثیت ریڈر صدر شعبہ فارسی بن گئے۔

یونیورسٹی میں آنے کے بعد میں نے ڈی۔ لٹ میں داخلہ لے لیا تھا جو میرے لیے دردسر بن گیا۔ رغیب صاحب جو اس وقت بظاہر میرے دوست تھے، روز مشورہ دیا کرتے تھے کہ فارسی میں ڈی۔ لٹ کرکے کیا کیجیے گا۔ اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کرلیجیے۔ اس مشورے کے پیچھے کیا مقصد تھا یہ بعد میں سمجھ میں آیا۔ مجھے کسی کو سپروائزر بنانے کی ضرورت نہ تھی پھر بھی ہاشمی صاحب کیونکہ صدر شعبہ تھے، اس لیے میں نے اخلاقاً ان کا نام سپروائزر کی حیثیت سے فارم میں لکھ دیا تھا۔ انھوں نے کبھی میرے مقالے کی شکل بھی نہ دیکھی۔ صدر شعبۂ فارسی ہونے کے بعد رغیب حسین نے کوشش کی کہ جو لوگ ان اساتذہ کے تحت جو شعبہ اُردو میں چلے گئے ہیں ڈاکٹریٹ کے لیے کام کررہے ہیں وہ ان کو چھوڑ کر خود ان کے ساتھ کام کریں۔ ایک محترمہ خلیل صاحب کے ساتھ کام کررہی تھیں لیکن اپنا مستقبل اسی میں نظر آیا کہ وہ خلیل صاحب کے بجائے

رغیب حسین صاحب کو اپنا سپروائزر مقرر کروالیں اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ مجھ سے بھی ایسی ہی خواہش کی گئی لیکن میں یہ ابن الوقتی قبول نہ کرسکا۔ یہ صدر شعبہ صاحب کے لیے ناراضگی کا سبب بنا۔ اسی زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو ٹیچرز کانفرنس ہوئی۔ ہاشمی صاحب نے مجھ سے تعاون کرنے کو کہا جسے میں نے قبول کرلیا۔ یہ مزید ناراضگی کا سبب ہوا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھ چکے تھے پھر بھی منافقانہ دوستی تھی۔

خوب جانے ہیں میؔر کو خوباں
میؔر بھی ان کو خوب جانے ہے

رغیب صاحب دل کے مریض ہو چکے تھے لیکن ان کی مخصوص کارروائیاں جاری تھیں جن کی خبر مجھ تک پہنچتی رہتی تھی۔ محسن عثمانی جو کبھی میرے شاگرد رہ چکے تھے اور اس وقت ڈاکٹر ظفر کے ساتھ سوشیالوجی ڈپارٹمنٹ میں لکچرر تھے اور یونیورسٹی کے اچھے سیاستداں بن چکے تھے، انھوں نے مجھے آگاہ کیا کہ میرے خلاف دوہرا کھیل کھیلا جارہا ہے۔ اپنے پروفیسر بن جانے کے بعد ایک طرف تو نیر مسعود صاحب کو ریڈر بنانے کا خیال ظاہر کیا جارہا ہے، دوسری طرف ڈاکٹر انوارالحسن صاحب کو بھی ایسی ہی امید دلائی جارہی ہے جو ان کے تحت ڈی۔لٹ کی تیاری بھی کررہے تھے۔ اسی طرح ڈاکٹر رضوان علوی صاحب بھی جو رغیب صاحب سے بھی زیادہ کامیاب ڈپلومیٹ اور میرے خیر خواہ تھے، مجھ سے جلد از جلد ڈی۔لٹ تھیسس داخل کرنے کے لیے اصرار کررہے تھے۔ تھیسس کا مسئلہ یہ تھا کہ میں نے ڈی۔لٹ میں صرف ڈگری کے حصول کے لیے داخلہ نہیں لیا تھا۔ میں کلیات عرفؔی شیرازی کو واقعی ایڈٹ کرنا چاہتا تھا اس لیے کہ مجھے کچھ ایسے قیمتی نسخے مل گئے تھے جن تک میرے خیال میں دوسروں کی رسائی مشکل تھی۔ میرا کام بڑھتا جاتا تھا جس سے میرے بہی خواہ پریشان تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ رغیب صاحب کی پریشانی

کا باعث بھی بنتا جا رہا تھا جس کی وضاحت آئندہ سطور میں کی جائے گی۔ سکریٹریٹ کے میرے کچھ دوست محکمۂ تعلیمات میں اعلیٰ افسر ہو چکے تھے۔ میں نے رغیب صاحب سے کہا کہ اگر اس وقت کوشش کی جائے تو ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر شپ آسکتی ہے۔ رغیب صاحب میری بات مان گئے۔ دو تین مرتبہ سکریٹریٹ میرے ساتھ گئے بھی لیکن یکا یک رویہ بدل گیا۔ مصاحبین نے یہ سمجھا دیا کہ ولی الحق تو وہ پوسٹ اپنے لیے چاہتے ہیں۔ مجھے جب اس کا پتا چلا تو میں نے صاف الفاظ میں موصوف کو بتا دیا کہ واقعی میری اپنی دلچسپی ہے وہ یوں کہ جب تک آپ پروفیسر نہ ہوں گے میں ریڈر کیسے بنوں گا۔ لیکن رغیب صاحب کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی۔ بدگمانیاں اور بڑھتی گئیں۔ انھیں ڈر تھا کہ جو کھیل وہ خلیل صاحب کے ساتھ کھیل چکے تھے وہی ان کے ساتھ نہ کھیلا جا رہا ہو۔ ضرورت سے زیادہ دور اندیشی بھی کبھی نقصان دہ ہوتی ہے۔ رغیب صاحب کے گھر میں (اور آئندہ انوار صاحب کے مکان میں) میرے خلاف جو سازشیں ہوا کرتی تھیں ان کی خبر بھی مجھے ان پریشان شدہ اسکالروں کے ذریعہ ملا کرتی تھیں جن سے بیگار لی جاتی تھی۔ (اس کی وضاحت بھی آئندہ کی جائے گی)۔ رغیب صاحب کی پریشانیاں میرے ڈی۔ لٹ کے کام کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھیں۔ ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر کی جگہ کا دور دور پتا نہیں تھا لیکن میں ان کا زبردست خیالی رقیب تھا۔ اس پریشانی میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب یو۔ جی۔ سی کی طرف سے یونیورسٹی کی جگہوں کے لیے **Good Academic Record** کی شرط لگ گئی۔ اب منافقت کی منزل بھی ختم ہو چکی تھی۔ ہم دونوں میں صاف گفتگو ہوتی تھی۔ ایک موقعہ پر فرمانے لگے کہ آپ کے تو ایک ہی ساتھی ہیں، وہ کہاں تک آپ کی مدد کر سکیں گے۔ (ان کا اشارہ مرحوم پروفیسر سید حسن صاحب کی طرف تھا۔ ان کو شاید یہ علم نہیں تھا کہ وہ حضرات بھی جو ان کا ساتھ دے چکے تھے ان کی فطرت سے واقف ہو چکے تھے۔ یہ علم مجھے پروفیسر اقبال حسین

صاحب سے ہوا جو اس وقت تک میرے مشفق بزرگ دوست بن چکے تھے اور جن کے یہاں پٹنہ میں میرا قیام ہوا کرتا تھا)۔ اسی زمانے میں خان محمد عاطف صاحب کو رغیب صاحب بحیثیت عارضی لکچرر ڈپارٹمنٹ میں لا چکے تھے۔ خان صاحب بے چارے مجھ سے دُور دُور بھاگتے تھے کہ کہیں صدر شعبہ صاحب انھیں میرے قریب نہ دیکھ لیں ۔ ریسرچ اسکالروں اور عارضی لکچرروں کی بھی کیا مجبوریاں ہوا کرتی ہیں ۔ رغیب صاحب کا دل کا مرض ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ ایک موقع پر مجھے ان سے کہنا پڑا کہ رغیب صاحب میری اور میری تھیس کی فکر چھوڑ کر فی الحال اپنی صحت کی فکر کیجیے۔ جب پروفیسر شپ آئے گی تب دیکھا جائے گا۔ ابھی سے ٹنشن لے کر اپنی زندگی کو کیوں خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ لیکن ان پر اثر نہ ہوا۔ آخر میری تھیس مکمل ہوگئی۔ ہاشمی صاحب نے ضروری سرٹیفکیٹ دے دیا، فیس جمع کر دی گئی اور تین ضخیم جلدوں پر مشتمل تھیس کی تین جلدیں دوسرے روز رجسٹرار کے دفتر میں جمع کرنا طے پایا۔ ہمارے دوست ڈاکٹر کیسری کشور، ریڈر فارمیکا یو.جی ڈپارٹمنٹ، میڈیکل کالج، دنیا داری کے گرُوں سے خوب واقف تھے۔ وہ بضد ہوئے کہ مقالہ جمع کرنے سے پہلے اخلاقی طور سے صدرِ شعبہ کو ضرور دکھا دینا چاہیے۔ میں راضی ہوگیا۔ شام کو مقالے کی ایک کاپی لے کر رغیب صاحب کے مکان پر گیا۔ دریافت کیا گیا کہ آنے کا مقصد؟ میں نے بتایا کہ آئندہ روز مقالہ جمع کرنے جا رہا ہوں، آپ کو بھی اسے دکھا دینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تلخ گفتاری کا سلسلہ شروع ہوا جس کے گواہ ڈاکٹر سید محمد سعید صاحب، سابق صدر پولیٹیکل سائنس ڈپارٹمنٹ، آج بھی یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ مجھ سے سوال کیا گیا کہ کیا کلیاتِ عرفی کے ایرانی ایڈیشن کو پوری طرح نقل کر لیا۔ مجھے سخت غصہ آیا لیکن پی گیا اور خاموش رہا۔ پھر پوچھا کون سپروائزر ہے۔ میں نے جواب دیا نورالحسن ہاشمی صاحب۔ فرمایا کہ اچھا، تو اُردو ڈپارٹمنٹ سے جمع کروا دوں۔ میں خاموش رہا۔ پھر سوال کیا

گیا کہ کس زبان میں مقالہ ہے۔ میں نے کہا پیش لفظ انگریزی میں ہے۔ فرمایا گیا تو انگریزی ڈپارٹمنٹ سے جمع کروادوں؟ اب بات برداشت سے باہر ہوگئی۔ میں نے مقالے کی جلدیں اٹھا کر کہا کہ آپ کو مقالے کو جمع کروانے کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں فارسی ہی ڈپارٹمنٹ سے اسے آئندہ روز ہی جمع کردوں گا۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہو کر لیجیے۔ دوسرے روز مقالہ جمع ہوگیا۔ مقالوں کے ممتحنوں کا تقرر بورڈ آف اسٹڈیز کی سفارش پر وائس چانسلر کرتے تھے۔ رجسٹرار کے یہاں سے ممتحنوں کی فہرست مانگے جانے کے باوجود بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ نہ کی جارہی تھی۔ اس میٹنگ میں شعبے کے مستقل ممبر شامل ہو سکتے تھے جو صرف تین تھے، یعنی رغیب صاحب، میں اور ڈاکٹر نیر مسعود۔ میرا خود معاملہ تھا اس لیے میری شرکت کا سوال نہ تھا۔ میٹنگ کر کے فہرست صرف رغیب صاحب کو اور نیر مسعود صاحب کو ترتیب دینا تھی۔ کئی ریمائنڈروں کے بعد ان دونوں حضرات کی میٹنگ اس طرح ہوئی کہ بقول نیر مسعود صاحب کے، ایک کاغذ پر میٹنگ کی کارروائی اس طرح درج کی گئی تھی کہ چھ ناموں میں سے پانچ نام پہلے صفحہ پر تھے اور چھٹا نام دوسرے صفحے پر تھا اور اسی پر دونوں ممبروں کے دستخط ہوئے تھے۔ میں نے نیر مسعود صاحب سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے کن حضرات کے ناموں کی سفارش کی ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ پانچ نام ورق کے پہلے صفحہ پر تھے جو مجھے دکھایا نہیں گیا۔ چھٹا نام قاضی عبدالودود صاحب کا دوسرے صفحے پر تھا جس پر ان سے (نیر مسعود صاحب سے) دستخط کروا لیے گئے۔ قاضی عبدالودود صاحب کی شہرت یہ تھی کہ اگر کسی مقالے کو رَد کروانا ہوتا تھا تو ان کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ ان کے قلم سے کبھی بھی کسی کو پی۔ ایچ۔ ڈی تک کی ڈگری نہ ملی تھی ڈی۔ لٹ کا کیا سوال۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ باقی کن حضرات کے نام ہوں گے۔ چند روز کے بعد مجھے تمام ناموں کے متعلق اطلاع مل گئی۔ وہ یہ تھے۔ ڈاکٹر زبیر احمد، عربک ریڈر، بھوپال

یونیورسٹی ، ڈاکٹر امہانی، ریڈر، علی گڑھ یونیورسٹی، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی، ڈپٹی ڈائرکٹر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ڈاکٹر غلام رضا ستودہ، استاد تہران یونیورسٹی ، ڈاکٹر حسین بحرالعلومی ، استاد تہران یونیورسٹی اور قاضی عبدالودود صاحب ۔ میں نے وائس چانسلر مستقیم صاحب آئی ۔اے ۔ایس سے احتجاج کیا کہ اوّل تو یہ کہ ضابطہ کے مطابق سپروائزر کا نام فہرست میں ہونا چاہیے اور اصل تین ممتحنوں میں اس کا شمول ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ چھ ناموں میں دو ایسے لوگوں کے نام ہیں جو محض ریڈر ہیں، اور دو نام ان حضرات کے ہیں جن کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں اور دو ہندوستان کے باہر کے حضرات ہیں ۔ اصول یہ تھا کہ بورڈ آف اسٹڈیز کے سفارشی ناموں میں سے وائس چانسلر کوئی تین نام منظور کر لیتا تھا اور اس سلسلے میں عموماً صدر شعبہ یا سپروائزر سے مشورہ کر لیا جاتا تھا۔ رغیب صاحب مشورے کے لیے بلائے گئے اور ان کے مشورے کے بعد دونوں ایرانی استادوں کے ناموں کے ساتھ قاضی عبدالودود صاحب کا تیسرا نام منظور ہوا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے فارسی ڈپارٹمنٹ کے سلسلے میں یہ پہلا (اور اب تک آخری بھی) معاملہ تھا جب مقالے کے تین میں سے دو ممتحن ہندوستان کے باہر تھے۔ ممتحنوں کے ناموں سے اندازہ ہو گیا کہ مقالے کو رَد کرانے کی پوری کوشش کی گئی تھی ۔ میں سخت پریشان تھا اس لیے کہ میں نے اس مقالے کی تیاری میں بے حد محنت کی تھی اور بہت کافی وقت صرف کیا تھا۔ مقالے کو رَد کروانے کے لیے صرف قاضی عبدالودود صاحب کا نام ہی کافی تھا۔ لیکن ''خدا شرّی برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد'' ۔ جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں، مشیتِ ایزدی کے تحت بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو وقتی طور سے تکلیف دہ ہوتی ہیں لیکن حقیقتاً وہ ہمارے حق میں ہوتی ہیں ۔ یہی موجودہ معاملے میں بھی ہوا۔ عرصۂ دراز کے بعد ایرانیوں کی رپورٹیں آئیں جو میرے حق میں تھیں۔ قاضی صاحب کا جواب آیا کہ دو مرتبہ رپورٹ لکھی لیکن کھو گئی اور یہ کہ وہ جلد ہی تیسری

مرتبہ رپورٹ لکھ کر روانہ کریں گے ۔خدا خدا کر کے یہ رپورٹ آئی، اس شکل میں کہ مختلف چھوٹے بڑے اٹھارہ کاغذات پر اعتراضات درج تھے اور آخر میں لکھا تھا کہ پہلے ان اعتراضات کے جواب دیے جائیں پھر فیصلہ سنایا جائے گا۔رپورٹیں اکزمینیشن کمیٹی کے سامنے پیش ہونا تھیں جس کا ممبر صرف سپروائزر کو ہونا تھا۔صدر شعبہ کو شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ اکزامینیشن کمیٹی کی میٹنگ ہوئی لیکن ہاشمی صاحب بحیثیت سپروائزر نہ پہنچ سکے لہٰذا میرا کیس توقف میں پڑ گیا۔آئندہ میٹنگ رمضان کے مہینے میں پڑی۔ میں روزہ رکھے ہوئے تھا اور اس الجھن میں تھا کہ دیکھیں پھر ہاشمی صاحب میٹنگ میں جاتے ہیں یا نہیں۔ کلاسز ختم ہونے کے بعد میں ہاشمی صاحب کے یہاں یاد دہانی کرانے گیا۔انھوں نے یقین دلایا کہ وہ ضرور جائیں گے۔ میں گھر واپس چلا آیا۔ مغرب کے بعد مسجد سے روزہ کھول کر واپس لوٹا ہی تھا کہ ڈپٹی رجسٹرار کوشل کشور صاحب کا میرے مکان کے سامنے پولیس اسٹیشن پر فون آیا۔(اس وقت تک میرے گھر میں فون نہ تھا)۔کانسٹبل مجھے بلانے آیا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید تھیسس پر میرے حق میں فیصلہ ہوا ہے اور کوشل کشور جو میرے دوست تھے مجھے مبارکباد دینا چاہتے ہیں لیکن معاملہ دوسرا ہی تھا۔کوشکل کشور صاحب سے چند جملوں کی گفتگو ہوئی اور وہ یہ تھی ''فوراً آجائیے۔رغیب حسین صاحب پر دل کا دورہ پڑ گیا''۔میں نے پوچھا حال کیا ہے؟ جواب ملا ختم ہو چکے ہیں۔ میری عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہوا۔رغیب صاحب اس میٹنگ میں جس میں صرف سپروائزر بلائے جاتے ہیں کیسے پہنچ گئے اور یکا یک ہاٹ فیلور کا سبب کیا ہوا۔ بہر حال میں نے کپڑے تبدیل کیے اور یونیورسٹی پہنچ گیا۔ دیکھا کہ وائس چانسلر کے کمرے سے ملحقہ کمرے میں بنچ کے اوپر رغیب صاحب کی لاش رکھی ہوئی ہے اور اندر اس وقت تک میٹنگ ہو رہی تھی۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد جب ہاشمی صاحب باہر نکلے تو میں نے ان سے واقعہ پوچھا۔انھوں

نے بتایا کہ وہ میٹنگ میں شمولیت کے لیے یونیورسٹی سے گزر کر وائس چانسلر کے کمرے کی طرف جارہے تھے تو فارسی ڈپارٹمنٹ کے باہر رغیب صاحب سے ملاقات ہوگئی اور وہ ان کے ساتھ ہولیے۔ رجسٹرار آفس کی طرف مڑنے کا جب وقت آیا تو ہاشمی صاحب کو خیال ہوا کہ وہ جدا ہوجائیں گے چنانچہ انھوں نے انھیں خدا حافظ کہا لیکن اَن سنی کر کے رغیب صاحب بھی رجسٹرار آفس کی طرف مڑ گئے۔ بقول ہاشمی صاحب کے، وہ یہ سمجھے کہ رجسٹرار آفس میں کسی کام سے جارہے ہیں۔ لیکن انھوں نے دیکھا کہ وہ رجسٹرار کے کمرے سے بھی آگے بڑھ گئے۔ ہاشمی صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب وہ وائس چانسلر کے کمرے کے دروازے پر پہنچے تو پھر انھوں نے رغیب صاحب کو خدا حافظ کہا لیکن اَن سنی کر کے موصوف بھی کمرے میں داخل ہوگئے اور انھیں کے برابر (ہاشمی صاحب کے برابر) بیٹھ گئے۔ ڈی۔ لٹ کا تنہا میرا کیس تھا۔ کوشل کشور صاحب نے رپورٹیں سنائیں جنھیں سننے کے بعد ہی رغیب صاحب نے ہیجانی انداز میں کہنا شروع کیا کہ مقالہ رَد ہو جانا چاہیے۔ وائس چانسلر نے ڈپٹی رجسٹرار سے قاعدہ پوچھا۔ کوشل کشور صاحب نے بتایا کہ جب دو رپورٹیں حق میں ہیں اور تیسری میں مختتم رائے کا اظہار نہیں کیا گیا ہے تو مقالے کے رَد ہونے کا سوال ہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ رپورٹوں کا تبادلہ کیا جاسکتا ہے۔ وائس چانسلر نے یہی فیصلہ کر دیا۔ ہاشمی صاحب نے مزید فرمایا کہ اس کے چند ہی منٹ کے بعد رغیب صاحب نے کہا کہ کیا چائے نہیں آئے گی؟ کیونکہ اسی وقت میٹنگ شروع ہوئی تھی اس لیے وائس چانسلر نے انھیں تیز نظروں سے دیکھا اور ڈپٹی رجسٹرار سے چائے منگوانے کو کہہ کر کام میں مشغول ہوگئے۔ اس کے بعد ہاشمی صاحب نے یہ عبرت انگیز واقعہ بیان کیا کہ جب دوسرے کیس پر گفتگو ہو رہی تھی تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کے شانے پر کچھ بوجھ آ گیا۔ جب پلٹ کر انھوں نے دیکھا تو انھیں اپنے شانے پر رغیب صاحب کا سر نظر آیا۔ انھوں نے وائس چانسلر

کو متوجہ کیا۔ رغیب صاحب کو جب سیدھا کیا گیا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ اختتام تھا اس بے اعتمادی کی داستان کا جس میں ایک بے بنیاد خوف اور ایک ایسی پوسٹ کے حصول کی خاطر جو وجود ہی میں نہ آئی تھی کسی شخص کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں خود اپنی جان دے دی گئی تھی۔ خدا مسبب الاسباب ہے، وہ انصاف کرتا ہے لیکن شاید اتنی جلد نہیں جتنا اس واقعہ میں ہوا۔ میرے لیے زندگی میں اس سے زیادہ عبرت انگیز واقعہ کبھی پیش نہ آیا۔ مجھ پر خوف طاری ہو گیا تھا کہ کیا خدائی انصاف ایسا بھی ہوتا ہے۔ دوسرے روز بحیثیت سینئر لکچرار مجھے ڈپارٹمنٹ کا چارج دلا دیا گیا۔

یونیورسٹی میں میری لکچرارشپ کا وقفہ ۲۶ رنومبر ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۵ء تک رہا۔ اس میں جب تک اُردو فارسی ایک ڈپارٹمنٹ تھا، اس میں ویسی ہی کھلی فضا اور دوستانہ ماحول تھا جس کا سرکاری ملازمت میں مَیں عادی تھا۔ تین بجے تک سب کلاس ختم ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد ڈپارٹمنٹ کے تمام ٹیچر اسٹاف کلب چلے جاتے تھے۔ وہاں ایک پیالی چائے پی جاتی تھی، چائنیز چکر کھیلا جاتا تھا، کچھ ہنسی مذاق اور گپ شپ ہوتی تھی اور اس کے بعد ہم لوگ گھروں کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ لیکن فارسی ڈپارٹمنٹ کے علاحدہ ہونے کے بعد چند سال مجھے اسی تنگ نظری اور کم ظرفی کا مقابلہ کرنا پڑا جس سے مجھے تین سال تک Economics & Statistics Deptt. میں سامنا کرنا پڑا تھا۔ میرے ساتھ جو سلوک تھا وہ تو تھا ہی۔ ڈپارٹمنٹ میں جو تماشے ہوتے تھے وہ بھی کافی تکلیف دہ ہوتے۔ ڈین کے دفتر کے کلرک تک کے احترام کیے جانے کا یہ عالم تھا کہ ان کی آمد پر صدر شعبہ اپنی کرسی تک چھوڑ دیتے تھے۔ میرے سامنے یہ واقعہ پیش آیا کہ کلرک، سرکار، ڈپارٹمنٹ میں آئے۔ ہیڈ صاحب کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے کہ یہ ''سرکار'' کے لیے ہے۔ رجسٹرار کے دفتر اور ڈین آفس کے کلرکوں کی خاطر

مدارات صرف اس لیے ہوتی تھی کہ جو آرڈر وغیرہ آنے والے ہوتے ان کی ایک روز یا چند گھنٹے پہلے خبر ہو جائے اور اپنی ہمہ دانی کا ڈنکا پیٹا جائے۔ اس بچپن کی کچھ انتہا بھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سیہ بختی میں سایہ تک ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اس کا بھی کچھ تجربہ ہوا۔ عزیز مکرم نیر مسعود صاحب سب تماشے دیکھتے تھے لیکن وہ بھی محتاط رویہ رکھنے کے لیے مجبور تھے۔ خان عاطف بے چارے تو بالکل عارضی لکچرر تھے، ان کی ملازمت کا انحصار ہی صدر شعبہ صاحب کی خوشنودی پر تھا۔ وہ بے چارے مجھ سے دور دور رہنے کی کوشش کرتے تھے کہ کہیں صدر صاحب انھیں میرے قریب نہ دیکھ لیں۔ جب استادوں کا یہ حال تھا تو شاگردوں کا کیا پوچھنا۔ سلمان عباسی مرحوم کو میں نے ایم۔ اے کرایا اور میں ہی نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مرحوم ہمیشہ میرے قریب رہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب ان کا رویہ بھی تکلیف دہ ہوا۔ وہ میری رہنمائی میں ڈاکٹریٹ (ڈی۔ لٹ) کر رہے تھے اور یو۔جی سی کے اسکالرشپ کی ماہانہ قسط ملنے کے لیے سپروائزر کا سرٹیفکٹ ضروری ہوتا تھا۔ سلمان مرحوم نے اسکالرشپ ہی کو پیشہ بنا لیا تھا۔ وہ بار بار اُلٹ پھیر کر کے وہی کام دکھاتے تھے جو میں مہینوں پہلے دیکھ چکا ہوتا تھا۔ میں نے اس بات پر انھیں ٹوکا۔ انھوں نے جھنجھلا کر کاغذات میرے سامنے سے گھسیٹ لیے کہ میں ہیڈ صاحب سے سرٹیفکٹ لے لوں گا۔ یہ رویہ اس وجہ سے ہوا کہ چند دوسرے حضرات (مثلاً نیاز احمد خاں) کے ساتھ انھیں بھی لکچرر بنانے کے سبز باغ دکھائے جا رہے تھے جس کا مقصد انھیں مجھ سے دور کرنا تھا، ورنہ لکچرر کی کوئی پوسٹ تھی ہی نہیں۔ ایک صاحبزادے قادری (پورا نام یاد نہیں) تھے۔ بی۔ اے میں جب اُردو فارسی ایک ڈپارٹمنٹ تھا ہر وقت میرا قرب حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ جب ایم۔ اے میں پہنچے تو مجھے پہچاننا بھی بھول گئے۔ یونیورسٹی میں آنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ ایم۔ اے میں فرسٹ کلاس (بغیر پڑھے) حاصل کرنے کے لیے رغیب صاحب کی

گھر پر خدمت اور مصاحبت کو کافی سمجھتے تھے۔ رؤف جعفری صاحب جو گپتا جی کی وزارت میں ڈپٹی منسٹر تھے، وہ اور مظفر حسین صاحب جو گپتا جی کے خاص ساتھیوں میں تھے اور ان کی وزارت میں منسٹر تھے، ایک ساتھ رہتے تھے۔ میری اہلیہ کے ان دونوں حضرات کے خاندانوں سے گہرے مراسم تھے جن کے نتیجہ میں آئندہ مظفر صاحب کی بیگم کے توسط سے میرے بیٹے کی شادی رؤف جعفری صاحب کے بھتیجے اطہر کلیم صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ مظفر صاحب کے بہت ہی قریبی رشتے دار نور العین اشرف جو انھیں قریبی تعلقات کی وجہ سے میری بیوی کو ہاجرہ باجی کہا کرتے تھے، فارسی سے نابلد تھے لیکن ایم۔اے امتحان میں مَیں نے انھیں شامل ہوتے دیکھا اور غالباً فرسٹ کلاس بھی پا گئے۔ (ایسا بہت لوگوں کے ساتھ ہوا جن میں میرے بزرگ دوست امین سلونوی صاحب کے بیٹے عزیزم حسین امین بھی شامل ہیں جن کی فارسی دانی کے متعلق خود انھیں سے معلوم کیا جا سکتا ہے)۔ ان حضرت (نور العین اشرف) کا یہ عالم تھا کہ رغیب صاحب کے انتقال کے بعد میری موجودگی میں فرمایا تھا کہ اب تو بیگم رغیب ہیڈ ہوں گی ،جن کا لکھنؤ یونیورسٹی سے نہ تو کوئی تعلق تھا اور نہ فارسی کی معمولی استعداد رکھتی تھیں۔ ایک اور صاحبزادے تھے۔ نیاز احمد خاں۔ دبیر کامل کر کے بی۔اے کیا تھا اور ایم اے کر رہے تھے۔ انھیں بھی لکچرر کا سبز باغ دکھایا جا رہا تھا۔ موصوف نے ایک روز مجھ سے ذکر کیا کہ ان کے والد نے انھیں ممبئی سے بلایا ہے تا کہ ان کے کاروبار میں مدد کریں اور اس معاملے میں میری رائے پوچھی۔ میں نے کہا کہ والد کی مرضی کا احترام ضروری ہوتا ہے۔ بات رغیب صاحب تک پہنچ گئی اور ڈھنڈورا پیٹا جانے لگا کہ ولی الحق تو ڈپارٹمنٹ سے طلبا کو بھگاتے ہیں۔ رغیب صاحب کے انتقال کے بعد پوری فضا بدل گئی۔ رغیب صاحب کا جنازہ گھر میں رکھا تھا۔ میں بھی باہر موجود تھا۔ یکا یک خان عاطف صاحب میرے گلے سے لپٹ گئے کہ ڈاکٹر صاحب اب آپ ہی کا

سہارا ہے۔ میں نے انھیں تسلی دی کہ میں آپ کی مجبوری سمجھتا تھا۔ مجھے آپ کی طرف سے کوئی ملال نہیں ہے۔ میں آپ کی مدد کروں گا۔ اپنے دیے ہوئے اس قول کو میں نے ہمیشہ نباہا اور دو مرتبہ رَد ہونے کے بعد بھی میں نے انھیں ڈپارٹمنٹ سے باہر نہیں جانے دیا۔ ریڈر اور بعد کو پروفیسر کے تقرر کے وقت بھی میں نے ان کی کچھ نہ کچھ مدد کی۔ ممکن ہے کہ پروفیسر خان محمد عاطف اس کی تصدیق فرمائیں۔ نیاز احمد خان نہ یونیورسٹی میں لکچرر ہو سکے اور نہ ممبئ گئے۔ آج کل بھی مولوی گنج میں قیام پذیر ہیں اور نیاز بھارتی کے نام سے کبھی کبھی شعری نشستوں میں مجھ کو نظر آتے ہیں۔ مجھے استاد سمجھتے ہوئے احترام کرتے ہیں۔ یہ ان کی بڑائی ہے۔ قادری صاحب بھی میرے پاس تشریف لائے۔ ان کا ایم۔اے کا آخری سال تھا۔ پرانی نیازمندی کا اظہار کیا اور یہ خواہش کی کہ اگر آپ مظفر سلطان ترابی کو ٹاپ کرانا چاہتے ہیں تو مجھے اعتراض نہیں لیکن میرا فرسٹ ڈویژن برقرار رکھیے گا۔ مجھے تکلیف بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں پہلے سے کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ جو جیسا کرے گا ویسا ہی اس کا نتیجہ ہوگا۔ ایم۔اے سال اوّل میں ان کو اتنے زیادہ نمبر دیے جا چکے تھے کہ فرسٹ کلاس پاس ہونے میں انھیں دقّت نہ ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایم۔اے سال دوم میں انھیں کتنے نمبر ملے۔ رغیب صاحب کے ناوقت انتقال سے سب سے زیادہ خراب پوزیشن ڈاکٹر انوار صاحب کی ہوگئی۔ وہ مولانا جامؔی پر رغیب صاحب کی رہنمائی میں ڈی۔لٹ کے لیے کام کر رہے تھے۔ سنا کرتا تھا کہ رغیب صاحب کو مجھ سے بدگمان رکھنے میں مرحوم کا کافی دخل تھا۔ انھیں تقریباً یقین دلایا گیا تھا کہ جب رغیب صاحب پروفیسر ہوں گے تو انھیں ریڈر بنا دیا جائے گا۔ (یہی سبز باغ نیر مسعود صاحب کو بھی دکھایا جاتا تھا)۔ رغیب صاحب کے انتقال کے چند ہی روز کے بعد انوار صاحب میرے غریب خانے پر بحیثیت ایک مخلص کے تشریف لائے۔ اس وقت بھی رغیب صاحب کے

عبرتناک انجام سے میں لرز رہا تھا۔ موصوف نے مجھے تسلی دی اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔
غالبًا وہ سمجھتے تھے کہ میرے خلاف جو کچھ ہوتا رہا تھا اس میں ان کا اور کے بہنوئی نورانی صاحب کا
کتنا ہاتھ تھا، اس سے میں ناواقف تھا۔ وہ رغیب صاحب کی نگرانی میں ڈی۔ لٹ کرنا چاہتے تھے
۔لیکن میرے صدر ہونے کے بعد مجھ سے ایسا کرنے کی خواہش کا اظہار نہ کر سکے۔ ڈاکٹر رفیع
الدین صاحب کے پاس ناگ پور گئے اور ان کے تحت ناگپور یونیورسٹی میں تھیسس جمع کرنے کی
خواہش کی لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ ولی الحق صاحب سے کہئے کہ وہ لکھنؤ یونیورسٹی سے
آپ کو ڈی۔ لٹ دلادیں۔ مجبوراً اپنی تھیسس لے کر میرے پاس تشریف لائے۔ جامؔی، جسے
براؤن نے ایران کا آخری بڑا شاعر لکھا ہے، پر ایم۔اے کے ڈسرٹیشن سے بھی معمولی مقالہ لکھا
گیا تھا۔ میں نے واپس کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب کچھ تو اس پر نظر ثانی کیجئے۔ یہاں یہ بھی تحریر
کر دوں کہ ایم۔اے فارسی میں جب وہ بحیثیت استاد بیٹھے تھے تو ایک پرچہ میرے پاس بھی تھا۔
اس وقت ایک طالب علم اشفاق علی بھی تھے جن کی کاپی انوار صاحب سے بہتر تھی لیکن میں ایک
ٹیچر کو ایک طالب علم سے کم نمبر نہ دینا چاہتا تھا اور باوجود تمام حالات سے آگاہ ہونے کے
میں نے انھیں اور اشفاق علی کو برابر نمبر دیے تھے۔ (اشفاق علی غالبًا اب بھی شیعہ کالج میں پڑھا
رہے ہیں)۔ چند مہینے کے بعد پھر انوار صاحب تشریف لائے۔ اس عرصے میں وہ پھر رفیع
الدین صاحب سے ملے تھے لیکن انھوں نے پھر واپس کر دیا تھا۔ انوار صاحب کا غالبًا خیال تھا
کہ میں انتقامی کارروائی کی حیثیت سے ان کی تھیسس جمع نہیں کروانا چاہتا۔ ایسا خیال رغیب
صاحب کے سبھی حاشیہ نشینوں کا تھا اور قادری نے مجھ سے خود اقرار کیا تھا کہ بیگم شبیر فاطمہ نے
انھیں یقین دلا دیا تھا کہ میری ہیڈ شپ میں فرسٹ کلاس تو الگ، وہ پاس بھی نہیں ہو سکتے۔
احساس کمتری کے شکار لوگوں سے اس کے سوا امید بھی کیا رکھی جاسکتی ہے۔ بہر حال میں نے ان

سے پوچھا کہ کیا آپ نے تھیسس پر نظر ثانی کر لی؟ جواب انکار میں ملا۔ میں نے کہا خیر، میں اسی کو جمع کروادوں گا۔ میں نے یہی کیا اور نبی ہادی صاحب اور عابدی صاحب کو ممتحن مقرر کروادیا۔ رپورٹیں حق میں مل گئیں لیکن نبی ہادی صاحب نے شکایت ضرور کی کہ ولی الحق صاحب آپ سے ایسے مقالہ پر ڈی۔لٹ کی سفارش کرنے کی امید نہ تھی۔ عابدی صاحب نے اپنے قول کے مطابق کہ تھیسس ملنے کے پہلے ہی رپورٹ لکھ دیتے ہیں فوراً رپورٹ بھیج دی تھی۔ میں نے انھیں کووایوا کے لیے بلوالیا۔ وایوا ہوا اور عابدی صاحب نے انوار صاحب سے دعوت کا تقاضہ کیا۔ انوار صاحب کی اس دعوت میں پورا رجسٹرار آفس بھی شامل تھا۔ میں گزشتہ سب کچھ بھلا چکا تھا۔ راجستھان یونیورسٹی میں Professor in Sufism کی جگہ مشتہر ہوئی جس کے لیے کم از کوالی فیکیشن فارسی ایم۔اے تھی۔ میں نے انوار صاحب سے اس پوسٹ کے لیے درخواست دلوائی۔ اتفاق سے انٹرویو کمیٹی میں مَیں خود اکسپرٹ ممبر کی حیثیت سے بلایا گیا۔ اس وقت ہماری یونیورسٹی کے ڈاکٹر آر۔ پی۔ اگروال راجستھان یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ میں ایک روز پہلے ہی پہنچ گیا۔ انٹرویو کے وقت جب میں وائس چانسلر کے کمرے میں جانے لگا تو باہر پروفیسر عابدی نظر آئے۔ پروفیسر سید حسن صاحب کے انتقال کے بعد ہندوستان بھر کی تمام یونیورسٹیوں میں میرے دو سینئر تھے یعنی پروفیسر عابدی اور پروفیسر نذیر احمد اور میں نے یہ اصول بنا لیا تھا کہ کسی سلکشن کمیٹی میں ان میں سے اگر کوئی بھی ہوگا تو اس کے فیصلے کی مخالفت نہ کروں گا۔ اس انٹرویو میں بھی یہی معاملہ تھا۔ میں عابدی صاحب کی مخالفت نہ کرنا چاہتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ عابدی صاحب کیونکہ انوار صاحب کے ڈی۔لٹ میں ممتحن رہ چکے ہیں اس لیے وہ انھیں کے نام کی سفارش کریں گے۔ اسی وقت میری نظر نثار احمد فاروقی مرحوم پر پڑی۔ میرا خیال بھی نہیں تھا کہ وہ بھی امیدوار ہوں گے اس لیے کہ فارسی میں ان کے پاس کوئی ڈگری ہی نہ تھی۔ پتا چلا کہ

انھوں نے درخواست بھی نہ دی تھی لیکن عابدی صاحب ان کو اپنے ساتھ لائے تھے اور جے پور یونیورسٹی آ کر کسی طرح ان کو انٹرویو لیٹر دلوا دیا تھا۔ انٹرویو شروع ہونے کے پہلے عابدی صاحب بار بار میری ران کو دبا کر یہ کہتے رہتے تھے کہ دیکھو نثار فاروقی کا تقرر کرانا ہے۔ انٹرویو شروع ہوا۔ عابدی صاحب ہر امیدوار میں کوئی نہ کوئی کمی بتا کر اسے رَد کرتے جاتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک متنازعہ لیکن دلچسپ شخصیت شمسی تہرانی، جن کا وطن بھی راجستھان تھا، انٹرویو دینے آئے تھے۔ انتہائی غیر سنجیدہ نظر آنے کے باوجود انھوں نے ہر سوال کا جواب بالکل درست دیا۔ لیکن عابدی صاحب نے انھیں اس لیے رَد کر دیا کہ ان کے پاس پڑھانے کا تجربہ نہ تھا۔ انوار صاحب کا نمبر آیا۔ ڈین نے کہا کہ وہ سب سے زیادہ کوالی فائڈ امیدوار ہیں۔ عابدی صاحب نے فرمایا کہ میں ان کا ممتحن رہ چکا ہوں اور ان کی صلاحیت سے واقف ہوں اور یہ کہ وہ اس جگہ کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ عابدی صاحب کا مقصد کیا تھا لیکن میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ نثار احمد فاروقی کو کس طرح کوالی فائڈ ثابت کریں گے۔ نثار صاحب کا نام پکارا گیا۔ موصوف نے اس انداز میں گفتگو شروع کی کہ گویا وہ پوری سلکشن کمیٹی کا انٹرویو لے رہے ہیں۔ فرمانے لگے کہ میں تو صرف یہاں ڈپارٹمنٹ بنانے آنا چاہتا ہوں۔ اس وقت موصوف دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں محض ریڈر رتھے۔ ڈین نے کوالی فیکیشن پڑھ کر بتایا کہ فارسی میں کوئی ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوالی فائڈ ہی نہیں ہیں۔ عابدی صاحب نے اختلاف کیا۔ ڈین نے پوچھا کیسے۔ عابدی صاحب نے فرمایا کہ نثار صاحب کے پاس پنجاب یونیورسٹی کا فلاں فارسی کا ڈپلوما ہے جو بی۔ اے آنرس کے برابر ہے اور بی۔ اے آنرز ایم۔ اے کے برابر سمجھا جاتا ہے، اس لیے امیدوار کوالی فائڈ ہے۔ انھوں نے نثار صاحب کو سب سے بہتر امیدوار قرار دیا۔ البتہ میرے اور ڈین کے زور دینے پر وہ انوار الحسن صاحب کو دوسرے نمبر پر رکھنے کو تیار ہو گئے۔ میں خاموش ہو گیا اس لیے کہ مجھے یقین

تھا یونیورسٹی کی اکزیکیوٹیو کونسل نثار فاروقی کو کوالی فائڈ ہرگز نہ مانے گی اور نمبر دو پر انوارالحسن صاحب منتخب ہو جائیں گے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ امید کے مطابق نثار فاروقی کے تقرر کو قبول نہ کیا گیا لیکن شمسی تہرانی کے کسی احتجاجی خط کی بنیاد پر سلکشن کمیٹی کی پوری کارروائی کو ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد کبھی اس پوسٹ کے لیے انٹرویو نہ ہوا اور اسے ختم ہی کر دیا گیا۔ یہ نتیجہ ہوا عابدی صاحب کی دھاندلی کا۔ اور مجھے بھی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑی کہ ان دو بزرگوں کی کبھی مخالفت نہ کروں گا۔ انوار صاحب کی زندگی کا آخری دور کافی تکلیف دہ گزرا۔ ان کے مرض الموت میں جب میں عیادت کو گیا تو انھوں نے اپنی کردہ مخالفتوں کا اقرار کیا۔ یہ بھی اقرار کیا کہ رغیب صاحب کے انتقال کے بعد ان کی بیگم صاحبہ میرے خلاف مہم چلا رہی تھیں تو، جیسا میں پہلے سن چکا تھا، اس کا مرکز انھیں کا مکان تھا۔ وہ مجھ سے معذرت خواہ ہوئے لیکن میں تو مدّتوں پہلے انھیں معاف کر چکا تھا۔ انوار صاحب مرحوم انتشارِ طبع کا شکار تھے۔ ان سے کم استعداد کے لوگ پروفیسر ہو چکے تھے اور وہ شعبۂ علوم مشرقیہ میں جس جگہ پر تھے وہ لکچرر کے برابر بھی نہ تھی۔ بہر حال بعد کو سخت مخالفتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شعبۂ علوم مشرقیہ کے اساتذہ کو یونیورسٹی کے اساتذہ کے ہم مرتبہ قرار دلوانے میں وہ کامیاب ہو گئے لیکن خود زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکے اور بحیثیت ریڈر رٹائر ہو گئے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچررشپ کے دور کا ایک اہم واقعہ کھیل کود کے میدان میں واپسی ہے۔ اس وقت Mathematics ڈپارٹمنٹ کے ریڈر اور میرے عزیز دوست جن کی میں اب تک بڑے بھائی کی طرح عزت کرتا ہوں، جے۔ پی جیسوال صاحب یونیورسٹی کی ایتھلیٹک ایسوسی ایشن کے چیرمین تھے۔ یونیورسٹی Rowing & Swimming Club جس کا کبھی میں کیپٹن رہ چکا تھا، کی حالت بہت خراب تھی اور کچھ صاحبزادگان کی وہاں موجودگی کی وجہ سے کوئی صاحب بھی اس کے پریسیڈنٹ بننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک روز ڈاکٹر جیسوال میرے پاس

آئے اور اس کلب کی خراب حالت، جس کا ذمہ دار انھوں نے دو طالب علموں ڈپٹی شرما اور اسامہ طلحہ کو بتایا اور ان کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا کہ کیا تم ان لڑکوں کو کنٹرول کر کے کلب کی حالت درست کر سکتے ہو۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور اس کلب کا پریسیڈنٹ بن گیا اور ڈپٹی شرما اور اسامہ کا انتظار کرنے لگا۔ حسبِ توقع وہ دنوں مجھ سے ملنے آئے کچھ شکوے شکایتیں ہوئیں کچھ دوستانہ اشارات ہوئے اور میں نے سمجھ لیا کہ اچھے خاصے لڑکے تو ہیں جن کو محبت اور دوستی سے قابو میں کرنا کچھ مشکل نہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ خود اگر آپ کی نیت میں فتور نہیں ہے اور آپ کسی ذاتی مصلحت کے تحت کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہیں تو خراب سے خراب طالب علم بدتمیزی کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ ڈپٹی شرما اور اسامہ طلحہ دونوں اچھے خاندانوں کے نوجوان تھے۔ ڈپٹی کے بڑے بھائی آئی۔ ڈی۔ شرما کانکیج کالج میں لکچرر تھے۔ اسامہ کے والد شہر کے معروف وکیل تھے اور ان کی بیٹی پروین اسی سال آئی۔ اے۔ ایس۔ ہوگئی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان دونوں کی شرارتیں جنھیں بدتمیزیوں کی حد میں شمار کیا جاتا تھا محض نوجوانی کی امنگوں کی کچھ کج روی تھی۔ یہ دونوں کئی سال میرے ساتھ رہے۔ میرے اکثر فیصلے ان کی مرضی کے خلاف ہوئے لیکن سوائے کچھ عرصہ منھ پھولے رہنے کے اور کوئی ردِ عمل نہ ہوا۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد بھی ان کے احترام میں کمی نہ آئی۔ آج دُنیا میں دونوں میں سے کوئی نہیں ہے لیکن اسامہ کی یاد میں ان کی بہن پروین آئی۔ اے۔ ایس اور بیوی کلثوم طلحہ جو جلسے کیا کرتی ہیں ان میں اب بھی میں بلایا جاتا ہوں اور شریک ہوتا ہوں۔ بحیثیت پریسیڈنٹ کے یونیورسٹی کی کشتی رانی کی ٹیم کے ساتھ مجھے پہلی مرتبہ مدراس جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں **Inter'Varsity Regetta** جس کلب میں ہوا وہ سمندر سے ملنے والے ایک نالے نما قطعۂ آب پر واقع تھا جس کی گندگی کا یہ عالم تھا کہ پانی میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ کلکتہ اور پونے وغیرہ میں انتظامات درست تھے۔ پیرا کی کے

Inter'Varsity اور انٹر ڈسٹرکٹ کے دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ انٹر ورسٹی سوئمنگ مقابلہ جے پور میں راجستھان یونیورسٹی کے تحت ہوا تھا۔ انتہائی شائستہ لڑکے دیکھنے کو ملے تھے۔ انٹر ڈسٹرکٹ مقابلہ اس زمانہ میں ہوا تھا جب میں لکھنؤ ڈسٹرکٹ کی سوئمنگ باڈی (Lucknow Aquatic Association) کا اور رام کشن اوستھی U.P. Aquatic Association کے سکریٹری تھے۔ مقابلہ علی گڑھ یونیورسٹی کے سوئمنگ پول میں تھا۔ اس میں ضلعوں اور یونیورسٹیوں دونوں کی ٹیمیں حصّہ لے رہی تھیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا سوئمنگ پول Competitive Swimming کے لیے بنا ہی نہ تھا، اس لیے اس میں دوڑیں عموماً کناروں پر ختم نہ ہوتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ جو حضرات منتظم تھے انھیں پیراکی کے مقابلوں کا قطعاً علم نہ تھا۔ یاور حسین صاحب یونیورسٹی کے فزیکل ڈائرکٹر تھے لیکن منہنی سی شخصیت کے مالک تھے۔ دوسرے حسین علی مرحوم تھے جو میرے لکھنؤ کے ایم۔ وائی۔ اے کلب کے دوستوں میں تھے اور ہاکی کے اچھے پلیر تھے لیکن پیراکی سے ان کا بھی تعلق نہ تھا۔ رام کشن اوستھی کی طرح بہت گرم مزاج تھے۔ مقابلے سے پہلے ٹیموں کے ممبروں کا طبّی معائنہ ہوا۔ میری ٹیم کے دو ممبر یعنی ایٹکنس اور گومز جنھیں کرال (Crawl) کے مقابلوں کے لیے میں لے گیا تھا Unfit قرار دے دیے گئے۔ ان کے ہاتھوں میں فنگس بتایا گیا۔ میں اس فیصلے سے غیر مطمئن تھا۔ اسی وقت میں سول سرجن، علی گڑھ کے یہاں گیا اور ان دونوں کا معائنہ کرایا۔ دنوں فٹ پائے گئے۔ میں سول سرجن کے سرٹیفکیٹ لے کر یونیورسٹی کے ذمہ داروں کے پاس گیا اور وہ بدقّت انھیں حصّہ لینے کے لیے راضی ہوئے۔ رات کو اوستھی کا ٹیلی فون آیا۔ میں نے انھیں پوری بات بتا کر کہہ دیا کہ سب معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے لیکن وہ دوسرے دن مقابلوں سے پہلے ہی علی گڑھ یونیورسٹی پہنچ گئے اور مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ انھوں نے غلط طریقے سے اعتراض کرنا شروع

کر دیے۔ ان میں اور حسین علی میں کافی تکرار بھی ہوئی۔ بہر حال بغیر کسی سبب کے اچھے خاصے مقابلے خراب ہو کر رہ گئے۔ گومتی کے کنارے باندھ بننے کے سلسلے میں یونیورسٹی روئنگ کلب کی زمین لے لی گئی اور اس کے بدلے میں کوئی دوسری زمین نہ دیے جانے کی وجہ سے روئنگ کلب کو بند کرنا پڑا اور اس کے ساتھ ہی اسپورٹس سے میرا رشتہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔ اب تو یہ بھی نہیں یاد ہے کہ ٹیبل ٹینس کے سو دلنگ اور کاربیلین ٹورنامنٹس میں پلیروں کا ارینج منٹ کیسے ہوتا ہے اور سوئمنگ کے موجودہ رکارڈ کیا کیا ہیں۔

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا وآلی جب جواں تھا

بارہواں باب

یونیورسٹی کا دورِ صدارت

مقبول و سر بلند رہے ہم جہاں رہے
اب تک تو جس زمیں پہ رہے آسماں رہے

کن حالات میں لکھنؤ یونیورسٹی کی شعبۂ فارسی کی صدارت مجھے تفویض ہوئی، اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ دستور یہ تھا کہ جن ڈپارٹمنٹوں میں صرف لکچرر ہوتے تھے ان میں ڈین صدر کے فرائض انجام دیتا تھا لیکن نجانے کیوں اس وقت ایسا نہ ہوااور فوراً بحیثیت لکچرر کے مجھے صدارت تفویض کردی گئی اور اس کے بجائے تھوڑے ہی عرصے کے بعد مجھے عارضی طور سے ریڈر بنا دیا گیا۔ اس وقت مجھے مختلف محاذوں پر مقابلہ کرنا تھا۔ ڈین کے دفتر کے کلرک مجھ سے بھی وہی سب چاہتے تھے جو اُن کو میرے پیش رو سے ملا کرتا تھا۔ میں نہ ان کی ضیافتیں کر سکتا تھا اور نہ ان کے احترام میں انھیں کرسی پیش کر سکتا تھا۔ مجھے جو کچھ کہنا ہوتا تھا سیدھا ڈین سے کہتا تھا۔ میرے پاس نوٹس آنا شروع ہوئے کہ فلاں الماری رغیب صاحب کو عارضی طور سے دی گئی تھی، اسے واپس کیجیے۔ ہیٹر رغیب صاحب کو ذاتی طور سے دیا گیا تھا واپس کیجیے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے کلرکوں کی اس ریشہ دوانیوں سے زیادہ بے چارے ڈین پر افسوس ہوتا تھا کہ بابو جو کچھ لکھ کر

دیتے وہ دستخط کر دیتے۔ ڈین کے دفتر سے ایسے خطوط آتے رہے اور میں انھیں کوڑے دان میں پھینکتا گیا۔ میرا کہنا تھا کہ پہلے آفیشل الماری کے قفل کی کنجیاں دلوائی جائیں تاکہ میں رکارڈ دیکھ سکوں کہ کیا کیا آفیشلی ڈپارٹمنٹ کو الاٹ ہے۔ اس کے بعد ہی میں فیصلہ کر سکوں گا کہ کیا واپس کرنا ہے کیا نہیں۔ ڈاکٹر انوار صاحب نے بھی ان حالات سے فائدہ اٹھانا چاہا، ڈین آفس کو چائے پلانے والوں میں وہ بھی شامل تھے۔ جس روز ڈین نہ آتے تھے اور سینئر پروفیسر مسلدان صاحب ڈین کے فرائض انجام دیتے تھے، میرے پاس ایک نوٹس آجاتا تھا کہ ڈپارٹمنٹ کے کمرے خالی کیجیے اس لیے کہ وہ شعبۂ علومِ مشرقیہ کو الاٹ ہیں۔ ایسے نوٹسوں کا بھی میرے پاس یہی جواب تھا کہ پہلے الماری کی کنجی دیجیے تاکہ میں رکارڈ دیکھوں، تب کچھ فیصلہ کروں گا۔ مسلدان صاحب کے بڑے بھائی گورنمنٹ سروس کے وقت کے میرے دوستوں میں تھے۔ خالص لکھنوی تھے۔ سوائے پیجامہ، شیروانی اور کشتی دار ٹوپی کے کبھی دوسرا لباس اختیار نہ کیا تھا۔ مسلدان صاحب بھی، جیسا ایک لکھنوی کو ہونا چاہیے، شائستہ اور مہذب انسان تھے لیکن سخت ڈین سمجھے جاتے تھے۔ ان کے کچھ خطوط کا لہجہ مجھے برا معلوم ہوا۔ میں نے ان کے شعبۂ پولیٹیکل سائنس جا کر احتجاج کیا۔ انھوں نے فرمایا ارے بھائی جب وہ کمرے انوار صاحب کے شعبۂ علومِ مشرقیہ کو الاٹ ہیں تو آپ خالی کر کے انھیں کیوں نہیں دے دیتے۔ میرا جواب تھا کہ اپنے دفتر سے کہیے مجھے الاٹمنٹ آرڈر دکھائے ورنہ میری الماری کھولے جانے تک انتظار کرے۔ ڈپارٹمنٹ کی کنجیاں بیگم رغیب حسین کے پاس تھیں اور ڈین کا دفتر جان بوجھ کر انھیں حاصل نہیں کر رہا تھا۔ میں نے وائس چانسلر سے مداخلت کرنے کو کہا تب جا کر بیگم رغیب صاحبہ سے کنجیاں حاصل کی گئیں۔ ڈین پروفیسر مصرا صاحب نے مجھے مطلع کیا کہ وہ الماری کی کنجیاں مجھے دینے اور انونٹری بنوانے آ رہے ہیں۔ مصرا صاحب جوبلی کالج کے تعلیمی دور سے میرے شناسا تھے۔

انتہائی شریف اور دوستانہ مزاج کے انسان تھے۔ مصرا صاحب مع اپنے ہیڈ کلرک، سرکار، کے تشریف لائے۔ میری ان کی گفتگو ہونے لگی۔ سرکار نے دخل دینا چاہا۔ میں نے مصرا صاحب سے کہہ دیا کہ اپنے کلرک کو دخل اندازی سے روکیے۔ اپنے ہیڈ کلرک کے خلاف میرے سخت رویہ سے ڈاکٹر مصرا حیران رہ گئے۔ انھیں خاموش کر دیا گیا۔ یہ وہی حضرت تھے جن کی آمد پر اُن کے احترام میں سابق صدر صاحب کھڑے ہوکر کرسی صدارت پیش کر کے فرمایا کرتے تھے کہ "سرکار" تشریف رکھیں۔ میرے لیے ان کو حد میں رکھنے کے لیے ایسا جھٹکا دینا ضروری تھا۔ الماری کھولی گئی اور انونٹری تیار کی گئی تو اس میں وہ الاٹمنٹ آرڈر نکل آیا جس میں کمرے فارسی ڈپارٹمنٹ کو الاٹ ہوئے تھے نہ کہ شعبۂ علومِ مشرقیہ کو اور اس آرڈر پر خود مسلدان صاحب کے دستخط تھے۔ دوسرے روز میں وہ آرڈر لے کر ان کے پاس گیا۔ سخت شرمندہ ہوئے اور معذرت کے طور پر کہنے لگے کہ کیا کرتا سرکار جیسا بتاتے تھے اسی کے مطابق کرتا تھا۔ جہاں تک خود سرکار کا تعلق ہے، وہ اس زمانے میں ڈین آفس میں کلرک مقرر ہو چکے تھے جب میں طالبعلم تھا۔ میں ان کا احترام کرتا تھا لیکن کچھ ٹیچروں ہی نے جن میں مرحومین رغیب حسین اور انوارالحسن پیش پیش تھے ان کا دماغ خراب کر دیا تھا اور وہ مجھ سے بھی وہی عبدیت چاہتے تھے جو ناممکن تھا۔ اسی لیے جب تک میری پوزیشن مضبوط نہ ہوئی وہ مجھے پریشان کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے بعد میں نے کبھی انھیں منھ نہ چڑھایا۔ بے چارے نے رٹائرمنٹ کے بعد یونیورسٹی کے ایک شعبہ میں عارضی ملازمت کر لی تھی۔ مجھ سے انکساری کے ساتھ ملنے لگے۔ میں نے بھی ان کا گذشتہ رویہ بھلا دیا اور ان کا ویسا ہی احترام کرنے لگا جیسا اس وقت کرتا تھا جب میں طالب علم تھا اور وہ ڈین آفس کے نوجوان کلرک۔

ڈین آفس سے مقابلے سے زیادہ سخت ایک دوسرا مرحلہ تھا۔ رغیب صاحب کی بیگم

شبیر فاطمہ صاحبہ اوران کے حواریوں نے باقاعدہ مہم چلا رکھی تھی کہ میں مستقل ریڈر نہ ہو پاؤں۔ پہلے تو بیگم صاحبہ ہی کی ڈپارٹمنٹ میں بحیثیت ریڈر آمد آمد کی خبر چلی۔ پھر شاید اس گروپ کو اندازہ ہوا کہ ان کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ تب ہندوستان بھر میں میرے خلاف امیدوار ڈھونڈھے جانے لگے جن میں دو حضرات میرا مقابلہ کرنے کے لیے راضی ہوئے۔ ایک الٰہ آباد یونیورسٹی کے حافظ غلام مرتضیٰ اور دوسرے علی گڑھ یونیورسٹی کے وارث کرمانی۔ غلام مرتضیٰ صاحب کے بایوڈاٹا میں ہائی اسکول سے ایم۔ اے تک صرف فرسٹ کلاس تھے (وہ پی۔ ایچ۔ ڈی نہ تھے) لیکن ان کے رقیب، الہندی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کے اصل سرٹیفکٹ ضرور طلب کروا لیجیے گا اس لیے کہ حقیقت وہ نہیں ہے جو درخواست میں دیے بایوڈاٹا میں ظاہر کی گئی ہے۔ اس وقت کی الٰہ آباد یونیورسٹی کا عربی و فارسی شعبہ خوب تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے کے خلاف تھا اور اس کی کمزوریوں کا پتا لگائے رکھتا تھا۔ پروفیسر محمد احمد نے ڈاکٹر رفیق کو کبھی ریڈر تک نہ ہونے دیا۔ رفیق صاحب جب صدر مقرر ہوئے تو انھوں نے محمد احمد صاحب کے بیٹوں سے انتقام لیا اور ان کے حواریوں کو پریشان کرنے لگے جن میں حافظ غلام مرتضیٰ اور شبیر فاطمہ شامل تھیں۔ رفیق صاحب کے ساتھ الہندی صاحب ہو گئے تھے لیکن یہ دوستیاں بھی منافقانہ تھیں۔ یہی حافظ غلام مرتضیٰ صاحب جنھوں نے شبیر فاطمہ کی درخواست پر میرے خلاف درخواست بھیجی، وہی تھے جنھوں نے شبیر فاطمہ کے شوہر رغیب حسین صاحب کا کچا چٹھا خلیل صاحب کو فراہم کیا تھا جو انھوں نے مجھے دے دیا تھا۔ غلام مرتضیٰ صاحب نے بہر حال انٹرویو سے پہلے ہی خلیل صاحب کے ذریعہ مجھے مطلع کر دیا تھا کہ درخواست انھوں نے شبیر فاطمہ کے دباؤ کی وجہ سے دے دی تھی ورنہ ان کا انٹرویو کے لیے آنے کا کوئی ارادہ نہیں اور ہوا بھی ایسا ہی۔ بیگم شبیر فاطمہ امیدوار کی تلاش میں علی گڑھ پہنچیں۔ وہاں بے چاری کا رکشہ اُلٹ گیا اور

ٹانگ میں سخت چوٹ آئی لیکن وارث کرمانی کی شکل میں انھیں میرا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسرا امیدوار مل گیا۔ عارضی ریڈر ہونے کے بعد اپنی خالی کردہ جگہ پر میں نے ڈاکٹر آصفہ زمانی کو بحیثیت عارضی لکچرار رکھوالیا تھا۔ موصوفہ کے پاس ایم۔اے سکنڈ ڈویژن ڈگری تھی اور انھیں کے ہم درس ابرار احمد صاحب فرسٹ ڈویژن تھے لیکن آصفہ صاحبہ کی سفارشیں بہت مضبوط تھیں۔ خود میرے محترم عزیز مولانا ناصر میاں فرنگی محلی نے ان کی سفارش کی تھی لیکن دلچسپ سفارش آل انڈیا ریڈیو کے جی۔ایم شاہ صاحب کی تھی۔ موصوف چھڑی ٹیکتے ہوئے میرے غریب خانے پر تشریف لائے تھے اور مجھ سے فرمایا تھا کہ ارے بھائی ڈاکٹر صاحب، وہ بے چاری لڑکی بھی انھیں حضرت کی ماری ہوئی ہے جن کے ستائے ہوئے آپ تھے۔ مجھے رغیب صاحب مرحوم پر یہ بہتان اچھا نہ لگا۔ رغیب صاحب کی مرضی کے مطابق آصفہ صاحبہ نے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کے لیے خلیل صاحب کا نام بدلوا کر رغیب صاحب کا نام طے کروایا تھا۔اس کے علاوہ بھی رغیب صاحب اور آصفہ زمانی صاحبہ کے خاندان میں اچھے تعلقات تھے۔ جی۔ایم۔شاہ صاحب نے سفارش کا جو رخ اختیار کیا تھا وہ انتہائی بچکانہ تھا۔ میرے ریڈرشپ کے انٹرویو کے ساتھ لکچرار کی اس جگہ کا بھی انتخاب ہونا تھا جس پر خان عاطف صاحب بحیثیت لکچرار کام کررہے تھے۔ اس لکچرر کی جگہ کے سلسلے میں ڈاکٹر نریندر بہادر سریواستو بھی امیدوار تھے۔انھوں نے بھی ڈاکٹر رغیب صاحب کی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کیا تھا۔ انھوں نے گورنر کو درخواست دی تھی کہ مسلمان اکسپرٹس کی موجودگی میں انھیں انصاف کی امید نہیں۔ چنانچہ انٹرویو کے وقت جب اکسپرٹس کا علم ہوا تو معلوم ہوا کہ نذیر احمد صاحب کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی، امرتسر کے سردار پریتم سنگھ اور پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے سردار گلونت سنگھ بحیثیت اکسپرٹ تشریف لائے ہیں۔ ریڈر کی جگہ کا پہلے انٹرویو تھا جس کی سلکشن کمیٹی میں یہ تینوں حضرات شامل تھے۔

میرے مقابلے میں انٹرویو دینے کے لیے صرف وارث کرمانی صاحب تشریف لائے تھے جن سے میرے اچھے تعلقات تھے۔ میرے علم میں آچکا تھا کہ نذیر صاحب وارث صاحب سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ اس کے علاوہ نیر مسعود صاحب بھی ان کے علم میں لاچکے تھے کہ لکھنؤ یونیورسٹی سے میرے علاوہ کوئی امیدوار نہیں تھا۔ گلونت سنگھ اور پریتم سنگھ صاحبان سے سوائے ایک امیدوار آصفہ صاحبہ کے کوئی واقف نہ تھا۔ انٹرویو گیارہ بجے شروع ہونے والا تھا۔ دس بجے وارث کرمانی صاحب میرے غریب خانہ ''دارالامان'' تشریف لائے اور معذرت کے انداز میں فرمایا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ کئی امیدوار ہوں گے لیکن نیر مسعود صاحب سے معلوم ہوا کہ ہم ہی دونوں امیدوار ہیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ دیوے میں اپنی جائداد کی وجہ سے وہ لکھنؤ آرہے ہیں ورنہ ان کے ہیڈ ہونے کے بعد بھی ڈپارٹمنٹ میں اسی طرح چلاتا رہوں گا جیسے اس وقت چلا رہا تھا۔ یہ محض میری تسلی کے لیے کہا گیا تھا۔ انھیں بیگم رغیب صاحبہ نے پورے طور سے یقین دلا دیا تھا کہ ان کے منتخب ہونے کا پورا انتظام کر دیا گیا ہے۔ میں نے وارث صاحب سے کہا کہ چھوڑیے ان باتوں کو، سلکشن کمیٹی جس کو چاہے گی منتخب کرلے گی۔ آپ کو منفعل ہونے کی ضرورت نہیں، جس طرح مجھے امیدوار بننے کا حق تھا ویسا ہی آپ کو بھی تھا۔ انٹرویو کا وقت آگیا ہے۔ آیئے چلیں۔ میں نے اسکوٹر نکالا۔ وارث صاحب کو پیچھے بٹھالیا اور ہم یونیورسٹی پہنچ گئے۔ انٹرویو ہوا۔ وائس چانسلر کے پی۔ اے ہاشمی صاحب نے اپنی سیٹ ہی سے مجھے سلام کیا جس کا مطلب مجھے مبارکباد دینا تھا۔ اس کے بعد ڈین، ہندی کے پروفیسر شکلا صاحب کمرے سے باہر آئے اور باقاعدہ مجھے مبارکباد دی۔ ہندی کے یہ پروفیسر ہمیشہ شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ پہنتے تھے اور انتہائی شائستہ انسان تھے۔ انھوں نے مجھے اکسپرٹس سے ملنے کا موقع بھی نہیں دیا اور سیدھے اسٹاف کلب لے گئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ تین بجے سے لکچرر کی جگہ کے لیے انٹرویو میں آپ کو

بحیثیت صدر بیٹھنا ہے۔ اس لیے پہلے کھانا کھا لیجیے اور اس کے بعد کچھ دیر آرام کر لیجیے۔ میں نے ان کے اس مشفقانہ مشورے پر عمل کیا اور شام کی مہم کے لیے تیار ہو گیا۔ لکچرر کی جگہ وہی تھی جس پر عاطف صاحب رغیب صاحب کے عہد سے کام کر رہے تھے۔ وہ تو اس جگہ کے خاص امیدوار تھے ہی۔ ڈاکٹر آصفہ زمانی جنھیں مَیں ڈپارٹمنٹ میں لایا تھا، انھوں نے بھی اس جگہ کے لیے درخواست دی تھی۔ وہ تینوں اکسپرٹس سے رابطہ قائم کر چکی تھیں اگرچہ وہ جانتی تھیں کہ صرف دو ہی اکسپرٹس کمیٹی میں بیٹھیں گے۔ نذیر صاحب سے انھوں نے یہ رشتہ نکال لیا تھا کہ تعلیم گاہ نسواں میں نذیر صاحب کی صاحبزادی اور وہ ہمدرس تھیں۔ مجھ سے تو یہ رشتہ تھا ہی کہ وہ تعلیم گاہ نسواں میں میری اہلیہ کی شاگرد تھیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ انٹرویو کی صبح کو تشریف لائیں اور فرمایا کہ اگر آپ اجازت دیں تو انٹرویو کے لیے جاؤں۔ میں نے کہا کہ میں پہلے سے کوئی فیصلہ نہیں کرتا جو بہتر انٹرویو دے گا اسی کا انتخاب ہوگا۔ تیسرے اہم امیدوار ڈاکٹر اختر مہدی تھے جنھوں نے غالباً اسی سال الہٰ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی۔ وہ میرے ایک عزیز دوست بریگیڈیر رضوی مرحوم کے عزیز تھے اور پروفیسر رفیق صاحب مجھ سے ملانے کے لیے انھیں لے کر خود تشریف لائے تھے۔ خان عاطف صاحب کا مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ خلاصہ **(Precis)** تیار کرتے وقت پتا چلا کہ ایم۔ اے میں ان کے کل ترپن فیصدی نمبر تھے۔ پریسی مَیں اور ڈین پروفیسر شکلا صاحب بنا رہے تھے۔ وہ فرمانے لگے جب وہ کوالی فائڈ ہی نہیں ہیں تو انٹرویو میں بلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات تب دیکھنا چاہیے تھی جب انھیں عارضی طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ بہر حال وہ ان کے نام انٹرویو لیٹر اشو کرانے کے لیے تیار ہو گئے اور اس کے نتیجہ میں سب ہی سترہ امیدوار بلا لیے گئے جنھوں نے درخواست دی تھی۔ انٹرویو میں عاطف صاحب کسی سوال کا جواب ہی نہ دے سکے۔ اسی وقت اندازہ ہوا کہ دونوں اکسپرٹس یعنی نذیر صاحب

اور پروفیسر گلونت سنگھ صاحب ڈاکٹر آصفہ کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وائس چانسلر کے اشارے پر امیدواروں سے مَیں کچھ فارسی زبان میں سوال کر رہا تھا جس کے نتیجے میں ڈاکٹر نریندر کا یہ تبصرہ میرے کانوں تک پہنچا کہ ایران کیا ہو آئے اُردو ہی بھول گئے۔ ڈاکٹر آصفہ زمانی کا انتخاب ہو گیا۔ انھوں نے اس جگہ کا چارج لے لیا جس پر ڈاکٹر عاطف کام کر رہے تھے۔ عاطف صاحب تعلیم کے سلسلے میں ایران میں رہ چکے تھے۔ انٹرویو بورڈ کے سامنے ان کی کارکردگی سے مجھے سخت افسوس ہوا۔ پھر بھی میں نے انھیں ڈپارٹمنٹ سے نکلنے نہ دیا اور اس جگہ پر رکھ لیا جو آصفہ زمانی صاحبہ نے خالی کی تھی۔ یہ بات کچھ لوگوں کی ناراضگی کا باعث بھی بنی۔ اس موقع پر تو میں نے کسی نہ کسی طرح انھیں انٹرویو کے لیے بلوا لیا لیکن جانتا تھا کہ ان کے **Unqualified** ہونے کا سوال آئندہ بھی اٹھے گا۔ مجھے اپنے اس قول کا لحاظ تھا جو میں نے رغیب صاحب کے انتقال کے وقت بطور دلاسہ انھیں دیا تھا کہ میں انھیں ڈپارٹمنٹ سے نکلنے نہ دوں گا۔ میں نے وہ کیا جو اصولاً صحیح نہیں تھا۔ میں نے ایم۔ اے اسپشل کے پرچے بنوا کر ان سے ایم۔ اے اسپشل میں پرائیوٹ طور پر بیٹھنے کو کہا حالانکہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے بعد ایم۔ اے میں بیٹھنا مضحکہ خیز تھا۔ قاعدہ بھی یہ تھا کہ جب تک ریگولر طالب علم نہ ہو کسی کلاس کا امتحان نہ ہو گا۔ میرے اس فیصلہ سے اس قاعدہ کی بھی خلاف ورزی ہوئی۔ بہر حال خان صاحب امتحان میں بیٹھ کر فرسٹ ڈویژن کامیاب ہو گئے۔ سال بھر کے بعد اس پوسٹ کا انٹرویو ہوا جس پر اس وقت عاطف صاحب کام کر رہے تھے۔ اکسپرٹ پھر نذیر صاحب تھے۔ میں نے خان صاحب کی مدد کرنے کے لیے ان سے دریافت کیا تھا کہ ان سے کیا سوال کروں۔ انھوں نے جواب دیا تھا کہ نظام الملک پر پوچھ لیجیے گا۔ میں نے سیاست نامہ کے متعلق سوال کیا۔ خان صاحب نے جواب نہ دیا۔ وہ پھر رد کر دیے گئے۔ بہر حال فیصلہ یہ کیا گیا کہ کوئی امیدوار مناسب نہ پایا گیا اور پھر جگہ

مشتہر کی جائے اور انٹرویو ہو۔ ایسا ہی ہوا۔ اس مرتبہ عابدی صاحب اور رفیع الدین اکسپرٹ ہو کر آئے۔ عابدی صاحب کے دل میں عاطف صاحب کے لیے نرم گوشہ تھا۔ انھوں نے رفیع الدین صاحب سے کہا تھا کہ بھائی کوئی بے تکا سوال نہ پوچھ لینا۔ بہرحال خان صاحب سے جو بات میں نے کہی تھی وہ پوری ہوگئی۔ اس کے بعد ریڈر اور پروفیسر ہونے کے وقت کیا کیا ہوا، عاطف صاحب ہی بتائیں تو مناسب ہے۔

مستقل ریڈر ہونے کے بعد مجھے سازشوں سے بڑی حد تک چھٹکارا مل گیا۔ وہی حضرات جن کی ریشہ دوانیوں کا میں شکار رہتا تھا بظاہر میرے بہی خواہ بن گئے تھے۔ میں نے ڈیپارٹمنٹ میں وہی دوستانہ ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جو ہاشمی صاحب کے دورِ صدارت میں تھا۔ ہر فیصلہ میں اپنے ہمکاروں کے مشوروں اور مرضی کے مطابق کرتا تھا۔ میرے شعبہ میں کوئی بات مخفی (Confidential) نہ تھی اور نہ کسی الماری یا ڈرار میں قفل لگتا تھا۔

یکا یک صدر شعبہ ہو جانے اور اس کے بعد کے مسائل کے بیان میں یہ بتانا بھول ہی گیا کہ میرے اس تحقیقی مقالہ کا کیا حشر ہوا جو اس تمام المیہ کا باعث تھا۔ عرض کیا جا چکا ہے کہ رپورٹوں کے بدلاؤ (Exchange) کا فیصلہ ہوا تھا۔ اسی کے مطابق ایرانیوں کی رپورٹیں قاضی عبدالودود صاحب کے پاس، اور ان کی رپورٹ کی نقلیں پروفیسر ستودہ صاحب اور پروفیسر بحرالعلومی صاحب کو بھیجی گئیں۔ صدر شعبہ ہونے کے بعد یہ رپورٹیں مجھ سے پوشیدہ نہ رہیں۔ امید تھی کہ اشعار کی معنویت پر اعتراضات ہوں گے لیکن ایسا نہ تھا۔ ظاہر پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔ مثلاً کلیات کی اسپیلنگ کیا ہے، غزل میں کتنے اشعار ہوتے ہیں، قطعہ میں مطلع ہوتا ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ مجھے یہ اندازہ ہوا کہ قاضی صاحب سے اکثر جگہ تسامح ہوا ہے۔ میں نے انھیں خط لکھا کہ آپ کے اعتراضات پر بات کرنے کے لیے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ چار

جملوں کا جواب آیا'' آپ کا خط ملا۔ آپ جب چاہیں آسکتے ہیں۔ ایرانیوں کی رائے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں اپنی رائے بدلتا نہیں ہوں''۔ اس جواب سے اندازہ ہوگیا کہ قاضی صاحب اپنے اعتراضوں پر قائم رہ کر میرے حق میں فیصلہ نہ کریں گے۔ میں نے ان کے ہر اعتراض کے خلاف سندیں تلاش کرنا شروع کیں اور کتابوں کا ایک پشتارہ لے کر پٹنہ پہنچ گیا۔ پروفیسر سید حسن صاحب کے یہاں حسبِ معمول قیام کیا۔ دوسرے روز دس بجے سے بحث کا آغاز ہوا۔ قاضی صاحب نے پہلا اعتراض ''کلّیات'' کی انگریزی اسپیلنگ پر کیا تھا۔ میں نے ''Kulliyat-i-Urfi'' لکھا تھا۔ انھوں نے فرمایا ''Kullyyat'' ہونا چاہیے۔ میں نے کہا کہ میں نے صحیح اسپیلنگ لکھی ہے۔ قاضی صاحب نے سند مانگی۔ میں نے اسٹرنگاز کی لغت کا حوالہ دیا۔ قاضی صاحب نے فرمایا میں اسٹرنگاز کو نہیں مانتا۔ میں نے پوچھا آپ جو اسپیلنگ بتا رہے ہیں اس کی کیا سند ہے؟ فرمایا ''فرہنگ معین''۔ میں نے کہا میں معین کو نہیں مانتا۔ فرمایا کیوں؟ میں نے کہا کہ فارسی لفظ ہوتا تو معین سند ہوتے، انگریزی لفظ کی سند نہیں ہوسکتے۔ قاضی صاحب خاموش ہوگئے۔ اسی طرح ایک ایک اعتراض پر گفتگو ہوتی گئی۔ جہاں میری غلطی ہوتی تھی میں قبول کر کے درست کر لیتا تھا۔ جہاں ان کا اعتراض غلط ہوتا تھا، وہ اسے واپس لیتے تھے۔ ان کا خود کا یہ قول غلط ثابت ہو رہا تھا کہ میں اپنے فیصلہ نہیں بدلتا۔ اس بحث سے جو تین دن جاری رہی مجھے قاضی صاحب کی عظمت کا اندازہ ہوگیا۔ ایک سچّے اسکالر کی طرح وہ اپنی غلطی قبول کرنے میں ہچکچاتے نہیں تھے۔ البتہ سند اور ثبوت ضرور طلب کرتے تھے۔ مثلاً میں نے کلیات میں ایک حصّہ متفرق نظموں کے عنوان سے قائم کیا تھا جس میں حضرت علیؓ سے متعلق ایک نظم تھی جس میں مطلع بھی شامل تھا۔ قاضی صاحب کا اعتراض تھا کہ وہ قطعہ ہے اور اسے قطعات کے سکشن میں جانا چاہیے۔ میں نے کہا قطعہ میں مطلع نہیں ہوتا۔ فرمانے لگے ''ہوتا

ہے۔ ''میں نے قیسِ رازی کی ''المعجم'' پیش کر دی جس میں قطعہ کی تعریف میں اس نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ قطعہ میں مطلع نہیں ہوتا۔ قاضی صاحب فرمانے لگے کہ میں نے المعجم پڑھی ہے۔ میں نے کہا کتاب آپ کے سامنے ہے۔ میں انتہائی بیباکی سے بحث کر رہا تھا اس لیے کہ یقین تھا کہ قاضی صاحب رائے نہ بدلیں گے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگِ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

لیکن تیسرے دن وہ ہوا جس کی توقع نہ تھی۔ اعتراضات پر بحث ہوتے ہوتے قاضی صاحب نے یکا یک فرمایا'' کاغذ لائیے، رپورٹ لکھ دوں۔'' میں حیران تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ قاضی صاحب نے رائے کیسے بدل دی۔ میں نے کاغذ پیش کر دیا۔ انھوں نے اُسے موڑا اور آدھے حصّہ پر اُردو میں لکھ دیا کہ میں نے اعتراضوں پر امیدوار سے بحث کر لی۔ انھیں ڈی۔ لٹ کی ڈگری دی جا سکتی ہے۔ میں نے کہا قاضی صاحب جسے رپورٹ بھیجنا ہے اسے خط تو لکھ دیجئے۔ انھوں نے کاغذ کے باقی آدھے حصّہ پر رجسٹرار کو تین سطروں پر مشتمل خط لکھ دیا کہ انھیں ان کے اعتراضوں کے جواب مل گئے۔ وہ مطمئن ہو گئے اور رپورٹ منسلک ہے۔ میں سید حسن صاحب کے پاس واپس آیا وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ پہلا معاملہ تھا کہ قاضی عبدالودود صاحب نے کسی مقالہ کو (وہ بھی ڈی۔ لٹ کا) ڈگری دیے جانے کے لیے منظور کیا تھا اور بعد کو یہی آخری مقالہ ثابت ہوا۔ قاضی صاحب سے میرے تعلقات استوار ہوتے گئے۔ اس سے قبل میری ان سے پروفیسر نورالحسن ہاشمی صاحب کی معیّت میں صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ ڈی۔ لٹ کی ڈگری ریڈر شپ کے سلکشن کمیٹی سے صرف چند روز پہلے مل پائی۔

ڈی۔ لٹ کی اس تھیس کے سلسلے میں میں سوچتا ہوں کہ شاید اسے میں نے کسی نحس

ساعت میں شروع کیا تھا۔اس کی منظوری کے سلسلے میں جس ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا اسے تحریر کر چکا ہوں اور ویسی ہی پریشانیوں کا سامنا اس کی طباعت واشاعت کے سلسلے میں بھی کرنا پڑا۔ اس کی بھی ایک داستان ہے جسے مختصر الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ اپنے کلکتے کے قیام کے دوران میں ایشیاٹک سوسائٹی کے کتاب خانے میں جایا کرتا تھا۔ وہاں کے سکریٹری ڈاکٹر چندن رائے چودھری تھے۔ فارسی مخطوطات کے سلسلے میں انھوں نے مجھ سے کچھ مدد چاہی تھی اور میں نے خندہ پیشانی کے ساتھ ان کا کام کر دیا تھا۔ اظہار ممنونیت کے طور پر انھوں نے میرے سامنے تجویز رکھی کہ میں اپنی کوئی کتاب ایشیاٹک سوسائٹی کو طباعت واشاعت کے لیے دے دوں۔ اس وقت کلکتے میں اس مقالے کا ایک حصّہ یعنی کلیات عرفی کی پہلی جلد میرے پاس تھی۔ وہی میں نے ان کے حوالے کر دی۔ ان کے اکسپرٹ نے اسے چھاپے جانے کی منظوری دے دی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر اخلاق الرحمان قدوائی بہار کے گورنر تھے۔ وہ میرے داماد احمد شکیل ہاشمی کے رشتے کے ماموں ہیں۔ شکیل میاں نے مجھ سے کہا کہ ایشیاٹک سوسائٹی کے بجائے میں اپنی کتاب خدا بخش لائبریری سے چھپواؤں جس کے بحیثیت گورنر کے اخلاق الرحمان قدوائی صاحب چیرمین تھے۔ میں نے ان کی تجویز مان لی اور چندن رائے چودھری سے معذرت کر لی۔ میں پورے مقالے کو یعنی کلیات عرفی کی تینوں جلدوں کو لے کر پٹنہ گیا۔ اخلاق میاں ہی کے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس میں قیام کیا اور کلیات عرفی کی تینوں جلدیں ان کے حوالے کر دیں۔ انھوں نے فرمایا کہ کسی کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں لائبریری کے اکسپرٹس کی رائے لینا پڑتی ہے۔ میں خود صرف پروفیسر ہی نہ تھا بلکہ پورے ہندوستان کے سینئر موسٹ پروفیسروں میں سے ایک تھا۔ پھر بھی میں نے ان کی بات مان لی۔ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کن حضرات کی رائے طلب کی جائے۔ کیونکہ صرف پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر امیر حسن عابدی

صاحبان ہی مجھ سے سینئر اور عمر میں بڑے تھے، میں نے ان کے نام بتا دیے اور میرا ترتیب دیا ہوا کلیات عرفی رائے کے لیے ان حضرات کو بھیج دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک سیمینار کے سلسلے میں مَیں علی گڑھ گیا اور حسبِ دستور نذیر صاحب کی ملاقات کے لیے ان کے دولت کدے پر حاضری دی۔ گفتگو کے دوران میرے مقالے کا ذکر آ گیا۔ موصوف نے فرمایا کہ وہ انھیں مل گیا ہے لیکن انھوں نے اس کی ضخامت کی وجہ سے اس کی طباعت کے سلسلے میں شک ظاہر کیا۔ میں نے ان سے کلیات کی جلدیں منگوائیں اور بتایا کہ موٹا کاغذ استعمال ہوا ہے اور ورق کے صرف ایک طرف لکھا گیا ہے اس لیے چھپنے پر وہ اتنا ضخیم نہ رہے گا۔ ساتھ ہی میں نے کہا کہ خطوط کے سکشن میں کیونکہ اختلافاتِ نُسخ بہت زیادہ ہیں اس لیے فٹ نوٹ زیادہ ہو گئے ہیں لیکن وہ سب ضروری ہیں، ان پر اعتراض نہ کیجیے گا۔ بات ختم ہو گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد پٹنہ سے معلوم ہوا کہ نذیر صاحب نے یہی دو اعتراضات فرما دیے اور رائے دی کہ فٹ نوٹ کم کر دیے جائیں اور مقالے کا تہائی حصّہ شائع کیا جائے۔ نذیر صاحب اور میں ایک ہی یونیورسٹی کے طالب علم اور اساتذہ کے ایک ہی گروہ کے شاگرد تھے۔ اس حیثیت سے میں انھیں بڑے بھائی کی طرح مانتا تھا اور احترام کرتا تھا۔ اگر وہ میرے کام پر جسے قاضی عبدالودود صاحب تک کی منظوری مل چکی تھی اعتراض کرتے یا اس میں غلطیاں نکالتے تو مجھے تکلیف نہ ہوتی لیکن انھوں نے وہ اعتراض کیے جن کا جواب میں پہلے ہی انھیں دے چکا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ بالکل ویسی ہی رپورٹ اور اس میں وہی دونوں اعتراض امیر حسن عابدی صاحب نے بھی لکھ کر خدا بخش لائبریری بھیج دیے۔ کچھ اپنے دوستوں کی رشتہ داری کی وجہ سے میں موصوف کا بھی بہت احترام کرتا تھا۔ میں منافقت کا قائل نہیں۔ ایک دوسرے موقع پر علی گڑھ گیا اور کئی روز وہاں قیام رہا۔ ایک روز لائبریری میں نذیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ فرمانے لگے کہ سنا ہے کہ

کئی روز سے آپ علی گڑھ میں ہیں لیکن تشریف نہیں لائے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میرا دل آپ کی طرف سے صاف نہیں ہے اس لیے آنے کا سوال نہیں۔ موصوف کے اصرار پر میں اسی شام کو انکے یہاں چلا گیا لیکن میں نے پوچھا کہ جن باتوں کی طرف میں نے خود آپ کی توجہ دلائی تھی انھیں کو آپ نے کیوں اعتراضات کا موضوع بنایا۔ فرمایا میرا مقصد یہ نہ تھا۔ میں نے کہا کہ خدا بخش لائبریری میں یہی مقصد سمجھا گیا اور کوئی دوسرا مقصد ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ ایک دوسرے موقع پر عابدی صاحب ملے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے تھیسس کا بنڈل کھولے بغیر رائے دی ہے۔ موصوف نے کوئی جواب نہ دیا اور صرف یہ کہا کہ میں دوسری رپورٹ بھیج دوں گا۔ ایک دوسرے موقع پر پھر عابدی صاحب سے ملاقات ہوئی اور یہی ذکر چھڑا۔ فرمانے لگے کیا کرتا جو نذیر صاحب نے کہا وہی لکھ دیا۔ اگر ان کا یہ بیان صحیح تھا تو اپنے ان ''برادرِ نامہربان'' کے متعلق کیا کہوں۔ ایک دوسرے موقع کے اوپر نذیر صاحب کے ایک مرغ دست آموز نے عابدی صاحب کے اس بیان کو غلط قرار دیا، لیکن ۷/مارچ ۲۰۰۷ء کو علی گڑھ کے ایک سیمنار کے دوران جب عابدی صاحب اور ڈاکٹر انوار احمد گیسٹ ہاؤس کے کمرہ نمبر ۶ میں مقیم تھے پھر یہی ذکر چھیڑا اور پھر عابدی صاحب نے اپنی رپورٹ کی یہی وجہ بیان کی۔ خدا جو کچھ کرتا ہے وہی ٹھیک ہوتا ہے۔ تھیسس کی تینوں جلدیں ادنیٰ سے تغیر کے بغیر تہران یونیورسٹی سے شائع ہوگئیں اور ایک موقع پر اس کے نسخے ایران کلچرل ہاؤس سے انھیں دونوں حضرات کو پیش بھی کر دیے گئے۔ میں نے یہ تہران ایڈیشن بعد کو اخلاق میاں کو بھی دکھایا اور انھوں نے جو تبصرہ کیا اس کا لب لباب غالبؔ کے الفاظ میں یہ تھا۔

حسد سزای کمالِ سخن ہے کیا کیجیے
ستم بہای متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

جن کو اپنا سمجھا جائے ان کی منافقت کا میرے شاگرد پروفیسر شاہ عبدالسلام کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ اس سے زیادہ سبق آموز ہے لیکن اسے انھیں کی زبان سے سننا زیادہ مناسب ہے۔

پروفیسر سید حسن صاحب میرے مخلص ترین بزرگوں میں سے تھے۔ ان کی میری پہلی ملاقات بنارس میں میرے ہم درس ڈاکٹر بدرالحسن عابدی صاحب کے دولت کدے پر ہوئی تھی۔ میں اس زمانے میں گزیٹرز ڈیپارٹمنٹ میں کمپائیلیشن آفیسر تھا اور بنارس کے گزیٹرز کے ابواب لکھنے کے لیے مواد جمع کرنے کے سلسلے میں بنارس گیا ہوا تھا اور بھائی بدرل کے یہاں دریائے گنگا کے کنارے شب باش ہوا تھا۔ پروفیسر سید حسن صاحب یونیورسٹی کے کام کے سلسلے میں بنارس آئے ہوئے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں انھوں نے فرمایا کہ ان کے پاس ایک نادر تذکرہ مدائح الشعراء ہے، اس میں میرے مطلب کا مواد مل سکتا ہے۔ لکھنؤ واپسی پر میں نے مسز جوشی سے پٹنہ جانے کی اجازت لی اور پٹنہ پہنچ گیا۔ اس وقت سید حسن صاحب کا قیام رمنا باغ میں تھا۔ انھیں کے ساتھ قیام پذیر ہوا۔ مدائح الشعراء دیکھا۔ کوئی خاص تذکرہ نہ تھا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ یہ محض آپ کو پٹنہ بلانے کا بہانہ تھا۔ مستقل ریڈر اور صدر شعبہ ہونے کے بعد سید صاحب جو پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ فارسی تھے مجھے کسی نہ کسی بہانے پٹنہ بلاتے رہے۔ اس زمانے میں سال میں کم از کم دو تین مرتبہ پٹنہ جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ان سفروں میں اہلِ پٹنہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ سبھی اچھے لوگ تھے۔ ڈاکٹر اقبال حسین صاحب اور عطا کاکوی صاحب کو رغیب صاحب کی سلکشن کمیٹی کے سلسلے میں دیکھا تو ضرور تھا لیکن باقاعدہ ملاقات نہ تھی۔ پٹنہ میں دونوں سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ انتہائی مخلص، بزرگ ثابت ہوئے۔ اقبال صاحب کے رشتہ دار لکھنؤ میں تھے اور میرے شناسا تھے۔ اس چیز نے تعلقات کو اور گہرا کر دیا۔ موصوف ایک بڑے عالم

اور شگفتہ مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ منھ پھٹ بھی تھے۔ فیاض الدین حیدر صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو اس زمانے میں عربی اور فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے۔ لکھنوی شرافت و تہذیب کا نمونہ پٹنہ میں نظر آیا۔ انھیں کے انسٹی ٹیوٹ میں اطہر شیر صاحب سے ملاقات ہوئی جو ان کی تمام زندگی تک قائم رہی۔ اسی انسٹی ٹیوٹ میں علی حیدر نیّر صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ قاضی صاحب کی نگرانی میں میر سوز پر تحقیقی کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر کلیم الدین صاحب کی خدمت میں ان کے ایک شاگرد ڈاکٹر ممتاز احمد کی معیت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ وہ انتہائی کم سخن تھے۔ ہم دونوں کچھ دیر بیٹھے رہے، چائے پی اور چلے آئے۔ ممتاز صاحب اس زمانے میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریڈر تھے اور بعد کو پروفیسر اور صدر شعبہ ہو گئے تھے۔ عرصہ ہوا انتقال فرما گئے۔ مذکورہ ملاقاتوں کے بعد میرے مخلص ترین بزرگوں میں قاضی عبدالودود صاحب کا بھی اضافہ ہو گیا۔ کیفیت یہ تھی کہ پٹنہ اسٹیشن پر ٹرین سے اترنے کے بعد مجھے یہ سوچنا پڑتا تھا کہ کس کے ساتھ قیام پذیر ہوں، اس لیے کہ دوسروں کو شکایت ہو جاتی تھی۔ چنانچہ کبھی اکزیبیشن روڈ پر ڈاکٹر اقبال صاحب کے یہاں قیام پذیر ہو جاتا، کبھی جوار پوکھر پر برلا مندر کے قریب قاضی عبدالودود صاحب کے ساتھ ٹھہر جاتا اور کبھی سید حسن صاحب کے ساتھ۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے الگ ہونے اور میرے اور رغیب صاحب کے کشیدہ تعلقات کا سید حسن صاحب کو علم تھا اور مجھ سے زیادہ ان پر ذہنی دباؤ رہتا تھا۔ قاضی صاحب کے پاس میرا تحقیقی مقالہ پہنچنے سے مجھ سے زیادہ وہ پریشان تھے لیکن قریبی تعلقات ہونے کے باوجود قاضی صاحب کی فطرت کو دیکھتے ہوئے وہ بھی تھیسس کے متعلق ان سے بات نہ کر سکتے تھے۔ قاضی صاحب کا قول تھا کہ دوستی اور تعلقات الگ چیز ہیں اور علمی معاملات الگ چیز۔ اسی پر ان کا عمل بھی تھا۔ قاضی صاحب سے میری جتنی ملاقاتیں ہوتی گئیں میں اتنا ہی

زیادہ ان سے متاثر ہوتا گیا۔ محقق کی حیثیت سے مجھے دو ہی حضرات متاثر کر سکے، ایک محمود شیرانی اور دوسرے قاضی عبدالودود۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ قاضی صاحب کے پاس طرزِ نگارش نہ تھا۔ وہ تحقیق کے معاملے میں انشاء پردازی کے قائل بھی نہ تھے۔ ایک منطقی کے انداز میں وہ دو اور دو چار کے علاوہ کچھ نہ لکھنا چاہتے تھے۔ تنقید کے معاملے میں وہ انتہائی سخت تھے۔ سنا ہے کہ مالک رام صاحب نے کہیں لکھ دیا تھا کہ غالبؔ فلاں سنہ میں پیدا ہوئے۔ قاضی صاحب نے فرمایا یہ غلط ہے۔ یوں لکھا جانا چاہیے تھا کہ فلاں سنہ میں ایک بچہ پیدا ہوا جو بعد کو غالبؔ کے تخلص سے مشہور ہوا۔ ان کی تنقید کا انداز تخریبی تھا۔ ان کی خاص علمی گفتگو بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا جھوٹا کون تھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ فرمایا میرے شہر کا تھا۔ ان کا اشارہ شادؔ عظیم آبادی کی طرف تھا۔ بہار کے رہنے والے اور علی گڑھ یونیوسٹی کے سابق صدر شعبۂ عربی، پروفیسر مختارالدین آرزو، پٹنہ میں قاضی صاحب کے ساتھ ہی ٹھہرتے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی موقع پر کہہ دیا کہ قاضی صاحب کا شعری ذوق ٹھیک نہ تھا اور نہ انھیں اشعار سے دلچسپی تھی۔ یہ بات قاضی صاحب کے علم میں آگئی۔ سخت ناراض ہوئے۔ فرمایا کہ آجائیں تو انھیں سناؤں گا کہ مجھے کتنے شعر یاد ہیں۔ مظفر پور کے ڈاکٹر حمیدی جو قاضی صاحب سے عمر میں کافی چھوٹے تھے، ان کے خاص دوستوں میں تھے اور کسی زمانے میں ان کے ہم مسلک یعنی لامذہب رہ چکے تھے۔ ایک موقع پر ہم دونوں قاضی صاحب کے یہاں موجود تھے۔ حمیدی صاحب اپنے شعر سنا رہے رہے تھے اور قاضی صاحب بت بنے بیٹھے تھے۔ قاضی صاحب حافظ قرآن رہ چکے تھے۔ وہ خود کو ملحد اور لامذہب کہتے تھے لیکن ان کے مہمان خانے میں قرآن مجید کا نسخہ اور جانماز رکھی رہتی تھی۔ وہ قرآن مجید کے حوالے دیتے تھے لیکن خود کو ناپاک سمجھتے ہوئے اسے ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ قاضی صاحب

نہایت کھرّے مزاج کے انسان مشہور تھے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ ہر صاحب صلاحیت نوجوان طالب علم کی ہر طرح مدد کرتے تھے۔ ان کے گھر میں کوئی بچہ نہ تھا۔ ایک مرتبہ میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ گیا اور ان کے یہاں قیام پذیر ہوا۔ میری بیٹی دُرِّ ثمین سات آٹھ سال کی تھی۔ قاضی صاحب مستقل اس کے ساتھ رہتے تھے، اپنے ہاتھ سے ریفریجریٹر سے آم نکال کر اسے کھلاتے تھے اور اسے بہلائے رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کے ہر خط میں دُرِّ ثمین کا ذکر ضرور ہوتا تھا۔ ایسے مشفق بزرگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان کی یادگار آخری ملاقات میں ان کا دیا ہوا فوٹو اب تک میرے پاس موجود ہے۔ جب آخری مرتبہ میں ان کی عیادت کو گیا تو انھوں نے اپنے بیٹے برادرم مسعود صاحب سے اپنا فوٹو منگوایا، اس پر میرا نام لکھتے وقت مجھ سے دریافت کیا کہ آپ نے ڈاکٹریٹ تو کر لی ہے؟ میں سمجھ گیا کہ اب ان کا دماغ بھی فیل ہو رہا ہے جس کا مطلب موت ہے۔ اس کے چند ہی روز کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ سید حسن صاحب، اقبال حسین صاحبؒ اور قاضی عبدالودود صاحب پٹنہ میں میرے سب سے مخلص بزرگ تھے لیکن میرا خیال رکھنے میں مرحوم عطا کاکوی صاحب اور مرحوم پروفیسر محمد صدیق صاحب بھی ان سے کم نہ تھے۔ عطا صاحب اردو شاعر اور شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ جب کبھی بھی موقع ملتا تھا مجھے عظیم آباد کی شعری نشستوں میں لے جاتے تھے۔ ایسی نشستوں میں ایک بات جو میں نے محسوس کی وہ اہلِ لکھنؤ پر طنز تھا۔ میں نے عطا صاحب کی توجہ ادھر مبذول کروائی تھی کہ وہ اس ذہنیت کو اہلِ پٹنہ کے دماغوں سے نکالیں۔ بہار میں جو بھی اچھا شاعر ہوا اہلِ لکھنؤ نے اس کی شاعری کا اعتراف کیا لیکن جو تذکیر و تانیث تک کی معمولی غلطیاں کرتے ہوں انھیں اہلِ ادب کیسے شمار کیا جائے۔ ڈاکٹر حسن عسکری صاحب بھی پٹنہ کی آبرو سمجھے جاتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک مکمل اِسکالر تھے۔ پراسٹریٹ کے مریض تھے اور اس

سلسلہ میں معمولی آپریشن کے بعد پیشاب کے لیے بوتل لگادی گئی تھی۔اس عالم میں بھی وہ خدا بخش لائبریری جانا نہ چھوڑتے تھے۔گھر سے پیدل لائبریری آتے تھےلیکن سائیکل ساتھ رہتی تھی اس طرح کہ ایک ہاتھ میں سائیکل کا ہینڈل اور دوسرے میں پیشاب کی بوتل ہوتی تھی۔ان کے سلسلے میں ایک مرتبہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ڈاکٹر اقبال حسین صاحب سے غالباً ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔جس سال عسکری صاحب کو فارسی میں پریسیڈنٹ اوارڈ ملا، میں پٹنہ گیا ہوا تھا اور اقبال صاحب کے یہاں قیام پذیر تھا۔اثنائے گفتگو، پریسیڈنٹ اوارڈ ملنے کے سلسلے میں میں نے کہا کہ اس سال بھی صحیح اسکالر کو اوارڈ ملا۔اقبال صاحب نے چیں بجبیں ہوکر پوچھا کہ کیا آپ عسکری صاحب کو فارسی کا اسکالر سمجھتے ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔وہ اٹھے اور الماری سے بہار سرکار کی شائع کردہ ایک کتاب **"Bihar Through The Ages"** نکال کر لائے اور سراج الدولہ سے متعلق عسکری صاحب کا مضمون کھولا اور مجھ سے پڑھنے کو کہا۔ مضمون پڑھتا ہوا سراج الدولہ کی موت سے متعلق سطور تک پہنچا۔وہاں ان کی موت کی خبر سن کر راجہ رام نراین موزوںؔ کا درجِ ذیل شعر نقل کیا گیا تھا:

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پر کیا گزری

شعر کے نیچے جو ترجمہ دیا گیا تھا اس کا اقتباس یہ ہے **"Oh Ghazal Writers!You Know About The Death Of Majnoon..."** میں حیران رہ گیا کہ اتنے بڑے عالم نے لفظ غزالاں کا ترجمہ **Ghazal Writers** کیسے کر دیا تھا لیکن کتاب میرے سامنے تھی۔اقبال صاحب نے مسکرا کر پوچھا کہئے اب کیا رائے ہے؟ میرا جواب خاموشی تھا۔ میں حیران تھا کہ عسکری صاحب سے ایسی غلطی کیسے ہوگئی۔البتہ اس سے میں نے یہ سبق لیا کہ کسی

بھی مضمون یا کتاب کو شائع کرنے سے پہلے اس کو خوب اچھی طرح پڑھ لینا چاہئے تا کہ غلطی باقی نہ رہ جائے ورنہ اس کے چھپ جانے کے بعد جب تک کتاب باقی رہے گی گرفت ہوتی رہے گی۔ اطہر شیر صاحب کا کچھ ذکر کر چکا ہوں۔ سید حسن صاحب کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور اسی حیثیت سے سید حسن صاحب کے دولت کدہ پر مجھ سے ملے تھے۔ انتہائی خوش مزاج لیکن جذباتی انسان تھے۔ افسوس ہے کہ زیادہ عمر نہ پا سکے۔ ان حضرات کے علاوہ جن سے پٹنہ کے ابتدائی سفروں میں میری ملاقات اور دوستی ہوئی، کچھ اور حضرات بھی تھے جن کا آئندہ صفحات پر ذکر کیا جائے گا۔

ریڈر ہونے کے بعد پروفیسر ہونے میں مجھے زیادہ عرصہ نہ لگا ۱۹۷۷ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے فارسی ڈیپارٹمنٹ میں پروفیسر کی جگہ آ گئی۔ میرا مدِّ مقابل کوئی امیدوار نہ تھا۔ امیر حسن عابدی صاحب، پروفیسر سید حسن صاحب اور ڈاکٹر رفیع الدین صاحب اکسپرٹ تھے۔ پروفیسر سید حسن صاحب نے میرے لیے کچھ ایڈوانس انکریمنٹ تجویز کیے لیکن عابدی صاحب نے اس کی مخالفت کی۔ بہر حال انتہائی آسانی سے پروفیسر ہو گیا۔ وہ دور میری اقبال مندی کا زمانہ تھا۔ سری نگر سے حیدر آباد اور مدراس، گوہاٹی اور شانتی نکیتن سے بڑودہ تک جس جس یونیورسٹی میں فارسی پڑھائی جاتی تھی وہاں سے میرا کسی نہ کسی طرح سے تعلق تھا۔ یونین پبلک سروس کمیشن سے مختلف ریاستوں کے پبلک سروس کمیشنوں تک سب سے میں متعلق رہا اور ان سب اداروں کے ایم۔ اے سے لے کر ڈی۔ لٹ تک اور آئی۔ اے۔ ایس سے لے کر پی۔ سی۔ ایس تک کے مختلف امتحانوں میں مسلسل ممتحن ہوتا رہا۔ وہ زمانہ ایک ایسا وقت تھا کہ جب میں شمالی ہندوستان کی سبھی یونیورسٹیوں کے سینئر اساتذہ کی سلکشن کمیٹیوں کا ممبر تھا۔ شانتی نکیتن کے موجودہ صدر نیاز احمد خاں میرے گذشتہ شاگرد ہیں، کلکتہ یونیورسٹی کے سینئر پروفیسر

اور گذشتہ صدر منال شاہ قادری کے پی۔ایچ۔ڈی۔کا میں ممتحن تھا اور ان کی پروفیسر شپ کی سلکشن کمیٹی کا میں ممبر بھی رہ چکا ہوں اور موجودہ صدر پروفیسر احسان کریم میرے دوست پروفیسر عطا کریم برقؔ کے بیٹے ہیں۔ان کی پی۔ایچ۔ڈی۔تھیس کا بھی میں ممتحن تھا۔بھاگل پور یونیورسٹی کے گذشتہ صدر عبدالغفار انصاری کی پی۔ایچ۔ڈی۔کے مقالہ کا میں ممتحن تھا اور بعد کو پروفیسر شپ کے لیے سلکشن کمیٹی کا ممبر بھی۔مظفر پور یونیوسٹی کے گذشتہ دو صدور ڈاکٹر متین احمد اور ڈاکٹر مجتبیٰ انصاری میری سفارش پر پروفیسر ہوئے۔ان کے علاوہ اسی یونیوسٹی میں پروفیسر عید محمد کی پی۔ایچ۔ڈی۔کا بھی میں ممتحن رہ چکا ہوں۔دربھنگا یونیوسٹی کے صدر ولی اللہ سلفی کے تحقیقی مقالے کا میں ممتحن بھی تھا اور ان کی پروفیسر شپ کی سلکشن کمیٹی کا ممبر بھی۔پٹنہ یونیورسٹی کے انوار احمد صاحب جو آج خود باز نشستہ استادوں میں کافی سینئر ہیں، ان کی سلکشن کمیٹی کا بھی میں ممبر تھا اور پی۔ایچ۔ڈی۔کا ممتحن بھی۔یہی حال گیا یونیورسٹی کے پروفیسر ابدالی اور برقؔ صاحبان کا بھی ہے۔بنارس یونیورسٹی کی گذشتہ صدر پروفیسر شمیم اختر کی ریڈر شپ اور پروفیسر شپ دونوں کی سلکشن کمیٹیوں کا میں ممبر تھا۔موجودہ صدر ڈاکٹر عمر کمال الدین میرے شاگرد ہیں اور میری سفارش پر بنارس یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہوا تھا۔الٰہ آباد یونیورسٹی کی کسی سلکشن کمیٹی میں بھی میں شامل تھا لیکن یہ یاد نہیں کہ وہ کس کے تقرر کے لیے تھی۔لکھنؤ یونیورسٹی کے فارسی کے تمام اساتذہ میرے منتخب کیے ہوئے تھے جن میں ڈاکٹر احسن الظفر میرے تمام شاگردوں میں ممتاز رہے ہیں۔(یہ سبھی اساتذہ اِس سال ریٹائر ہو رہے ہیں) اور ڈاکٹر عارف ایوبی جو گذشتہ سال ریڈر مقرر ہوئے ہیں خود میرے اور میرے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔اسی طرح شعبۂ علومِ مشرقیہ کے موجودہ صدر ڈاکٹر تقی علی عابدی بھی میرے شاگرد اور عارف ایوبی کے ہم درس تھے۔علی گڑھ یونیورسٹی کے موجودہ دونوں پروفیسر ڈاکٹر ماریہ بلقیس اور ڈاکٹر آزرمی

دخت میری سفارش پر پروفیسر ہوئی تھیں اور یہی حال دو سال قبل ریٹائر ہونے والے پروفیسر طارق حسن کا تھا جنھیں میں نے بہت عرصہ پہلے کشمیر یونیورسٹی میں ریڈر کی پوسٹ کے لیے بھی منتخب کیا تھا لیکن وہ وہاں نہ جا سکے تھے۔ان کے پیش رو دونوں پروفیسروں یعنی سمیع الدین اور وارث کرمانی صاحبان کی سلکشن کمیٹی میں اگرچہ میں نہ تھا لیکن ان کی مدد ضرور کی تھی۔گذشتہ ۲۹ر جون ۲۰۰۶ء کو ڈاکٹر آصف نعیم بھی میری سفارش پر علی گڑھ یونیورسٹی میں تیسرے پروفیسر بنے۔موصوف کے بہت عرصہ پہلے کشمیر یونیورسٹی میں انتخاب کے وقت بھی میں ان کی سلکشن کمیٹی کا ممبر تھا۔دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر شریف حسین قاسمی کی ریڈر اور پروفیسر کی دونوں کمیٹیوں کا میں ممبر تھا۔وہ ۱۹۷۶ء کے سفر ایران میں میرے ساتھ تھے اور اِس وقت غالباً وہ سب سے سینئر کارگذار پروفیسر ہیں۔ان کے پیشرو مرحومین ڈاکٹر اسلم خاں اور ڈاکٹر نورالحسن کی ریڈر شپ اور پروفیسر شپ کی سلکشن کمیٹیوں کا میں ممبر تھا۔جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمود عالم کے ریڈر شپ کے دشوار مرحلے کو میں نے طے کیا تھا اور اسی یونیورسٹی کی ڈاکٹر صبر ہوے والا کی مشکل کو میں نے ان حالات میں آسان کیا تھا جب ان کے صدران کے ریڈر اور پروفیسر بنائے جانے کے سخت خلاف تھے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر ڈاکٹر شعیب اعظمی بھی ۱۹۷۶ء کے سفر ایران میں میرے ساتھ تھے۔ان کی پروفیسر شپ کی سلکشن کمیٹی کا ایک ایکسپرٹ ممبر ہونے کا مجھے بھی شرف حاصل تھا۔پٹیالہ یونیورسٹی کے ریٹائرڈ صدر سردار گلونت سنگھ میرے دوست اور ریڈر شپ کے سلسلے میں میرے ایکسپرٹ بھی تھے۔ان کے جانشین ڈاکٹر ذاکر حسین میرے ساتھی ڈاکٹر شکیل احمد مرحوم کے بریلی اسلامیہ کالج کے شاگرد تھے۔گلونت سنگھ صاحب کی جگہ پر ان کا تقرر میری سفارش پر ہوا تھا۔افسوس ہے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔کشمیر کے دونوں موجودہ پروفیسر یعنی ڈاکٹر محمد صدیق نیاز مند اور ڈاکٹر منوّر مسعودی کو ڈاکٹریٹ میری

سفارش پر ملی اور نیاز مند صاحب کے انتخاب میں مَیں ایکسپرٹ تھا۔ منوّر مسعودی صاحب ۱۹۷۶ء میں بحیثیت طالب علم میرے ساتھ ایران گئے تھے۔ گجرات کی یونیورسٹی کی کسی سلکشن کمیٹی کا میں ممبر نہ تھا لیکن ڈاکٹر احمد حسین قریشی کے دورِ صدارت میں متعدد بار یونیورسٹی کے کاموں کے سلسلے میں احمد آباد گیا۔ ان کے جانشین ڈاکٹر زبیر قریشی کے تحقیقی مقالہ کا میں ممتحن ضرور رہا۔ بڑودہ یونیورسٹی (وڈودرا) کے پروفیسر و صدر محمود حسین صدیقی صاحب بھی ۱۹۷۶ء کے سفرِ ایران میں میرے نوجواں ساتھیوں میں تھے اور یہی حال پٹنہ کے ڈاکٹر شرف عالم صاحب کا بھی تھا جو اب ماشاء اللہ عربی اور فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ بھوپال یونیوسٹی کے صدر شعبۂ فارسی ڈاکٹر فدا عباس ۱۹۴۸ء کے میرے شاگرد اور ہم وطن ہیں۔ ان کی پروفیسر شپ کی سلکشن کمیٹی کا میں ممبر تھا لیکن بھوپال کے گیس المیہ کے سبب مجھے جھانسی سے واپس آ جانا پڑا۔ ان کی جانشین ڈاکٹر مسز طاہرہ عباسی میری سفارش پر ریڈر ہوئی تھیں۔ بمبئی یونیورسٹی کے ڈاکٹر نور السعید اختر کا میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے مقالہ کا ممتحن تھا۔ کچھ حالات کی بنیاد پر وہ صدر شعبہ نہ بن سکے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر منّان، ڈاکٹر رضیہ اکبر، ڈاکٹر شریف النساء سب میرے ساتھی اور عزیز دوست تھے اگرچہ ان میں آپس میں شدید اختلافات رہے۔ ناگپور یونیورسٹی میں ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر عبد الرحیم اور ڈاکٹر عبد الرب عرفان میرے عزیز دوستوں میں تھے۔ ڈاکٹر عبد الرب عرفان کی اہلیہ امراوتی یونیورسٹی میں استاد تھیں جہاں ڈاکٹر نعیم الدین صاحب بھی اورنگ آباد سے ریٹائر ہو کر آ گئے تھے۔ وہ بھی میرے مخلص دوستوں میں سے تھے اور ان سے میری آخری ملاقات امراوتی یونیورسٹی میں ایک میٹنگ کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رفیع الدین اور ڈاکٹر نعیم الدین صاحبان دونوں بہت شریف لوگ تھے پھر بھی دونوں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔ مدراس یونیورسٹی میں ڈاکٹر وحید اشرف صاحب بحیثیت ریڈر

صدر تھے۔ اسپورٹس اور مشاعروں کے سلسلے میں تو مدراس جانا ہی ہوا لیکن وحید اشرف صاحب کی دعوت پر علمی معاملات میں گفتگو کے سلسلے میں متعدد بار مدراس جانے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر وحید اشرف صاحب ریٹائرڈ ہونے کے بعد بڑودہ میں قیام پذیر ہیں۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے علاوہ کراچی یونیورسٹی میں بھی پروفیسر کے انتخاب کے سلسلے میں میری رائے طلب کی گئی تھی۔ دو امیدوار تھے ایک کا تعلق ہریانہ سے تھا اور دوسری لکھنؤ کے کسی مہاجر خاندان کی فرد تھیں۔ میں نے ایک کے نام کی ریگولر پوسٹ کے لیے اور دوسرے کے لیے پرموشن کی سفارش کی تھی۔ ان میں ہریانہ کے امیدوار کی ایک موقع پر تہران میں ملاقات بھی ہوئی تھی۔ آئی۔ اے۔ ایس کے پرچوں کے بنانے اور کاپیوں کے جانچنے کا سلسلہ میرے سلی گوڑی جانے تک یعنی ۲۰۰۱ء تک چلتا رہا۔ لیکن اس سال سلی گوڑی میں کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے پرچہ نہ بنا سکا اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہی حال پی۔ سی۔ ایس۔ کے پرچوں کا بھی ہوا۔ ۲۰۰۱ء کے بعد میں یہ پرچہ بھی نہ بنا سکا۔ لکھنؤ چھوڑنے کے بعد ایک لحاظ سے تمام تعلیمی اداروں سے میرا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا یہاں تک کہ لوگوں کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ میں بنگال میں ہوں یا آسام میں۔ یونین پبلک سروس کمیشن کے تحت ہونے والے انٹرویو میں ایک کافی دلچسپ تھا۔ سرکارِ ہند کے تحت اردو بورڈ کے ڈائرکٹر کی پوسٹ کے لیے انتخاب ہونا تھا۔ میں اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب ایکسپرٹ تھے۔ احبابِ دہلی، دہلی کے ایک امیدوار کے حق میں تھے جن کا اسی سال ڈپٹی ڈائرکٹر کی جگہ پر انتخاب ہوا تھا۔ میرے چچا کے دوست علی عباس حسینی صاحب کی صاحبزادی اور میری اہلیہ کی شاگرد اور میرے ایک عزیز دوست اور کلاس فیلو مہدی عباس کی بہن گیتی آرا بھی امیدوار تھیں۔ نارنگ صاحب کا رجحان غالباً گیتی آرا کی طرف تھا۔ اس لیے کہ انٹرویو کے وقت انھوں نے بتایا کہ جو صاحبہ انٹرویو دینے آ رہی ہیں وہ حسینی صاحب کی صاحبزادی ہیں لیکن اندازہ ہوا کہ

سرکاری حضرات بنگلور کی ڈاکٹر فہمیدہ کے حق میں تھے جن کی زبان میرے خیال میں درست نہ تھی اور نہ انھوں نے کوئی خاص اچھا انٹرویو دیا تھا۔ ایکسپرٹس کی رائے پر سرکاری نمائندہ خاتون اور دوسرے ممبران کی رائے بھاری پڑی اور ڈاکٹر فہمیدہ کامیاب قرار دی گئیں۔

یونیورسٹی کی ملازمت شروع ہونے کے بعد ہی سیمیناروں اور کانفرنسوں کے مواقع ملتے رہے تھے لیکن صدر شعبہ ہونے کے بعد یہ سلسلہ بہت بڑھ گیا۔ اس وقت تک فارسی اساتذہ کی کوئی انجمن وجود میں نہ آئی تھی۔ میرے ہیڈ ہونے کے بعد بہار یونیورسٹی، مظفرپور، کا ایک گروہ ڈاکٹر زبیر احمد صاحب کی سرکردگی میں لکھنؤ آیا اور دورانِ گفتگو یہ بات چھڑی کہ اگر فارسی اساتذہ کی انجمن تشکیل پا جائے تو اچھا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اس کے ہیڈکواٹر کے لیے دلّی سے مناسب کوئی جگہ نہیں۔ بعد کو یہی بات اساتذۂ دلّی تک پہنچی اور آخرکار انجمن استادانِ فارسی وجود میں آ گئی جسے یو۔ جی۔ سی۔ نے بھی منظور کر لیا اور خانۂ فرہنگِ ایران نے بھی۔ لیکن ایک افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ اساتذۂ دہلی نے اس پر اپنا تسلط قائم کر لیا اور دوسری یونیورسٹی میں ہونے والی کانفرنسوں میں بے جا دخل اندازی کرنے لگے۔ جہاں تک ذہن کام کرتا ہے، پہلی دو کانفرنسیں دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ میں ہوئیں اور تیسری علی گڑھ یونیورسٹی میں، جس میں حضرات دہلی کی بے جا دخل اندازی کی وجہ سے پروفیسر نبی ہادی اور اراکین انجمن میں کافی کشیدگی رہی۔ چوتھی کانفرنس لکھنؤ یونیورسٹی میں ہوئی۔ نبی ہادی صاحب کی طرح مجھے بھی تلخ تجربہ ہوا۔ روزِ اوّل سے لے کر آج تک انجمن کے تمام عہدیدار حضراتِ دہلی ہوتے رہے جن کی انجمن کے اصولوں کا خیال نہ کرتے ہوئے اقتصادیات کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ چنانچہ پہلے تو یہ ہوا کہ اساتذہ کے علاوہ طلباء کو بھی انجمن کی سالانہ کانفرنسوں میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہاں تک غنیمت تھا۔ بعد کو یہ ہوا کہ جو بھی Capitation Fee دے دے، خواہ

اسے مقالہ پڑھنا ہو یا نہ ہو، وہ کانفرنس میں شریک ہوسکتا تھا۔ اس طرح تھوڑی رقم میں کھانے اور قیام کی آسانیاں فراہم ہونے کی وجہ سے وہ حضرات بھی کانفرنسوں میں آنے لگے جن کا فارسی تو الگ، تعلیم سے بھی دور کا تعلق نہ تھا۔ لوگ اپنے ساتھ اپنے پورے خاندانوں کو تفریح کروانے کے لیے لے جانے لگے۔ اس میں گجرات سب سے آگے تھا۔ ڈاکٹر احمد حسین قریشی کے ساتھ جمیعۃ القریش کے بہت کافی حضرات بھی کانفرنسوں میں شامل ہونے کے بہانے سے تفریح کے لیے آنے لگے۔ اس سے انجمن کو کچھ زیادہ آمدنی تو ہونے لگی لیکن لوکل سکریٹری کے لیے ایک مصیبت پیدا ہوگئی جسے ڈیلی گیٹوں کے قیام وطعام دونوں کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔ اس کا تکلیف دہ اور بدنما مظاہرہ کشمیر یونیورسٹی میں ہوا۔ میری ایک ہمکار خاتون اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سری نگر پہنچ گئیں۔ کشمیر یونیورسٹی شہر سے بہت فاصلے پر حضرت بل کے علاقے میں ہے۔ ہم لوگ رات کو تقریباً دس بجے یونیورسٹی پہنچے۔ لوکل سکریٹری پروفیسر شمس الدین نے ٹیچر ممبر کے علاوہ اس کے کسی خاندانی فرد کے لیے قیام کا انتظام کرنے سے انکار کردیا۔ میں نے تجویز کیا کہ میں دوسری جگہ ٹھہر جاؤں گا۔ میرے لیے جو کمرہ ہو وہ دے دیا جائے لیکن شمس الدین صاحب راضی نہ ہوئے۔ یونیورسٹی سے شہر سری نگر واپس جا کر کسی ہوٹل میں ٹھہرنا بھی ناممکن تھا اس لیے کہ سواری کا کوئی بندوبست نہ ہوسکتا تھا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خود وہ خاندان تو الگ، میں خود کس مخمصہ میں پھنس گیا تھا۔ بہر حال مجھے اپنے ایک کشمیری شاگرد ڈاکٹر محمد شفیع بچھ یاد آئے جن کا مکان یونیورسٹی سے قریب ہی تھا۔ گیارہ بجے رات کو میں اس خاندان کو لے کر شفیع صاحب کے یہاں پہنچا اور ان لوگوں کو ان کے یہاں ٹھہرا دیا۔ بیچارے نے اپنے مکان کا پورا ایک ہال خالی کردیا تھا۔ میں کانفرنس ختم ہونے سے پہلے ہی واپس چلا آیا تھا۔ لکھنؤ آکر معلوم ہوا کہ کچھ اور بدنما واقعات رونما ہوئے۔ کانفرنس کے خاتمے پر نگین کلب میں پارٹی دی گئی تھی۔ موصوفہ وہاں

بھی معہ خاندان کے پہنچیں لیکن ایک ریسرچ اسکالر نے جو اب ریڈر ہیں ان کے خاندان کے افراد کو پارٹی میں جانے سے روک دیا۔ اس قسم کے واقعات محض اس وجہ سے وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ کانفرنس کو ایک علمی مجلس کے بجائے ایک تفریح کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے۔ کچھ بدعنوانیوں کے الزامات کی وجہ سے انجمن استادانِ فارسی اب دو حصّوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔

بات کر رہا تھا میں خود اپنے کانفرنسوں میں حصّہ لینے کی اور ذکر چھیڑ دیا پرشین ٹیچرس ایسوسی ایشن اور اس کی کانفرنسوں کا۔ مجھے سو سے زیادہ سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے مواقع ملے جن میں سے بعض یہ ہیں: امیر خسرؔو پر بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ نئی دلّی۔ اس کا اہتمام نواب علی یاور جنگ، سابق وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی نے کیا تھا۔ اس کانفرنس میں مقالہ پیش کرنے کے علاوہ کچھ بہت اہم ایرانی شخصیتوں سے ملاقات کا بھی موقع ملا تھا جن میں مشہور ایرانی محقق ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا بھی شامل تھے۔ دوسری اہم انٹرنیشنل کانفرنس بوعلی سینا پر دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں بھی دنیا بھر سے اسکالر آئے تھے۔ اس موقع پر جن اہم ترین شخصیتوں سے میری ملاقات ہوئی ان میں تقی جعفری صاحب بھی تھے۔ وہ شاہی دور تھا اور جعفری صاحب جو ایک زبردست عالم اور فلسفی تھے کسمپرسی کے عالم میں تہران کے بازارِ بزرگ کی ایک مسجد میں مثنویِ معنوی پر درس دیا کرتے تھے۔ انقلاب کے بعد ان کے حالات سدھرے اور دوسری مرتبہ تہران میں میری ان سے ملاقات ان کے ایک شاندار مکان میں ہوئی اور ان کا نہایت شاندار کتاب خانہ دیکھنے کا موقع ملا جس میں دنیا بھر میں مثنویِ معنوی پر تصنیف اور طبع ہونے والی شاید ہی کوئی کتاب ہو جو موجود نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ رات میں وہ قطعاً نہیں سوتے تھے اور پورا وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ ایوان غالبؔ کے انٹرنیشنل سیمناروں میں بھی شرکت کے مواقع ملے جس میں سب سے اہم مرزا غالبؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ پر ہونے والے سیمنار تھے۔ مرزا

غالبؔ کے سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالے پر میں نظر ثانی کرنا چاہتا تھا اور اس لیے میں نے اسے وقتی طور پر واپس لے لیا۔ بدقسمتی سے وہ میرے پاس سے ضائع ہوگیا اور میں اسے واپس نہ بھیج سکا۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے سیمینار میں پڑھا جانے والا میرا مقالہ صحیح طریقے سے شائع نہ ہوا اور اس میں بے حد طباعت کی غلطیاں رہ گئیں۔ غالبؔ اکیڈمی میں منعقد ہونے والے سیمینار ابتدا میں بنگلہ دیش کے کلیم سہسرامی کی آمد کی وجہ سے انٹرنیشنل بن جایا کرتے تھے لیکن بعد کو کچھ پاکستانی حضرات بھی ان میں شریک ہونے لگے۔ پرشین ٹیچر کانفرنسیں بھی اولاً تمام تر ہندوستانی اسکالروں پر مشتمل ہوتی تھیں لیکن انقلاب کے بعد ان میں ایرانیوں کی شرکت بھی ہونے لگی اور بعد کو افغانستان اور کچھ دوسرے ممالک کے نمایندے بھی آنے لگے۔ پرشین ٹیچرس کانفرنسوں کے علاوہ کچھ دوسرے انٹرنیشنل سیمیناروں میں بھی شرکت کے مواقع ملتے رہے جن میں ممبئی میں خواجہ حافظؔ پر اُردو اکیڈمی اور ایران کلچول ہاؤس کا مشترکہ سیمینار ہندوستان میں منعقد ہونے ادبی جلسوں میں ایک اہم سیمینار تھا جس میں مَیں نے ''دیوانِ حافظؔ بخط عرفیؔ شیرازی'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا۔ حالیہ برسوں میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں علی حزیں پر انٹرنیشنل سیمینار کے علاوہ جامعہ ملیہ میں بیدلؔ عظیم آبادی اور امیر خسروؔ دہلوی پر ہونے والے انتہائی اہم سیمینار تھے جن میں دنیا بھر کے اسکالروں نے حصّہ لیا تھا لیکن یہ تمام سیمینار اس زمانے میں ہوئے جب میں آنکھوں سے تقریباً معذور ہو چکا تھا۔ (میرا آخری مقالہ ۷/مارچ ۲۰۰۷ء کو Persian Research Institute Aligrah کے انٹرنیشنل سیمینار میں پڑھا گیا)۔ بہرحال مقالوں کے بجائے میں نے جس شاعر کی یاد میں سیمینار ہوا اس کے اشعار کی زمینوں میں شعر کہہ کر پیش کیے۔ تخلیق کی طرف جس پر تحقیق اور تنقید کی بنیاد رکھی جاتی ہے اہلِ ہند کا رجحان ختم ہو چکا ہے اس لیے اگر تخلیقی ادب پیش کر رہا ہوں تو اسے تحقیقی اور تنقیدی ادب

سے کم اہم نہ سمجھا جانا چاہیے۔ ہندوستان میں انٹرنیشنل سیمیناروں کے علاوہ مجھے ایران میں منعقد ہونے والے کچھ بین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت کا موقع ملا۔ ان میں پہلا سیمینار جس میں ۱۹۷۶ء میں میں نے شرکت کی داستان کوتاہ پر تھا۔ اس کے بعد خواجہ حافظؔ، خواجو کرمانیؔ اور فردوسیؔ وغیرہ پر منعقد ہونے والے سیمیناروں میں شرکت کی اور ان میں پڑھے جانے والے میرے مقالے ایران سے شائع ہوئے۔ ان سیمیناروں کے علاوہ ایران میں ایک فارسی اسکالروں کا بین الاقوامی اجتماع بھی ہوا تھا جس میں مجھے دعوت دی گئی تھی۔ اس اجتماع میں دنیا کے کونے کونے سے اسکالر جمع ہوئے تھے حتی کہ چین اور جاپان تک کے نمائندے موجود تھے۔ اس موقع پر تاجکستان سے آئی ہوئیں ایک شاعرہ گل رخسار سے ملاقات ہوئی۔ ان کا شمار تاجکستان کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے لیکن مجھے ان کے کلام میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ بیچاری فارسی رسم الخط سے تقریباً ناآشنا ہیں۔ بین الاقوامی سیمیناروں کے علاوہ ہندوستان کے سبھی سیمیناروں میں میں شریک ہوا کرتا تھا جن میں ایران سوسائٹی کلکتہ کا ابوالفضلؔ اور فیضیؔ اور پٹنہ میں بیدلؔ عظیم آبادی پر اہلِ علم کے اجتماع تھے۔ فیضیؔ کے سلسلے میں میں نے سبکِ ہندی پر مقالہ پڑھا تھا جس کا بانی میں نے فیضیؔ کو قرار دیا تھا۔ یہ مقالہ Indo Iranica میں شائع ہوا تھا۔ سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مقالوں کے علاوہ میرے پچاسوں مقالے مجلّوں میں شائع ہوئے۔ ''شعر العجم'' اور ذکر عرفی شیرازی'' پاکستان کے سہ ماہی ''اردو'' کے علاوہ لکھنؤ سے نکلنے والے ''کتاب'' میں بھی شائع ہوا تھا۔ **Persian Translation Of Fesana-i-Ajaib** کے عنوان سے میرا مقالہ پرشین ٹیچرس ایس اوسی ایشن کے مجلّہ ''بیاض'' میں شائع ہوا۔ ''اتر پردیش کے چند ادبی مراکز'' کے عنوان سے چند طویل مقالے علی گڑھ کے ''فکر ونظر'' اور اعظم گڑھ کے ''معارف'' میں شائع ہوئے۔ عرفی شیرازی کی حیات اور شاعری پر کئی قسطوں پر

مشتمل مضمون مجلّہ ''برہان'' میں شائع ہوا۔عرفی شیرازی سے منسوب لطیفوں پر ایک جامع مضمون ''فروغِ اُردو'' لکھنؤ میں شائع ہوا۔فرنگی محل پر میرا مقالہ ''انسائیکلو پیڈیا ایرانیکا'' میں شائع ہوا اور ویسا ہی ایک دوسرا مقالہ اُردو میں ''نیا دور'' لکھنؤ میں شائع ہوا۔اور اسی مجلّہ میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی پر بھی میرا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔قاضی عبدالودود صاحب، چودھری سبط محمد نقوی اور اپنے ایک بچپن کے ساتھی مہدی علی خاں کی وفات پر تاثراتی مضامین روزنامہ ''قومی آواز'' اور ''صحافت'' میں شائع ہوئے تھے۔صحافت میں گذشتہ تین چار سال پہلے ہندوستان کے شمال و مشرقی خطّہ سے متعلق بھی میرا ایک طویل مضمون کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا۔آنند نرائن ملاّ صاحب کے سلسلے میں ایوانِ غالب سے شائع ہونے والے کتابچہ میں ''لکھنؤ بعہدِ ملاّ'' کے عنوان سے میرا مضمون شامل تھا۔ان چند شائع شدہ مقالات کے علاوہ اور بھی بہت سے مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ان شائع شدہ مضامین کے علاوہ بہت سے وہ مقالے بھی تھے جو سیمیناروں میں پڑھے جانے کے بعد وہیں شائع ہونے کے لیے دے دئے گئے لیکن میرے علم کے مطابق ایسے سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مقالے کبھی شائع ہی نہ ہوئے۔ ان میں چند کے نام یاد آرہے ہیں مثلاً ''فارسی ادب بعہدِ شاہجہاں'' پر علی گڑھ یونیورسٹی میں مَیں نے ملاّ شاہ بدخشی اور ان کی مثنویوں پر مقالہ پڑھا تھا جو کبھی شائع نہ ہوا۔دہلی یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں ہندوستان میں فارسی نظم کے ارتقا پر میں نے مضمون اور نظم دونوں پڑھے تھے جو شائع نہ ہوئے۔بڑودہ یونیورسٹی میں بھی ایک طویل مقالہ پڑھا تھا جس کا عنوان تک اب یاد نہیں۔مدراس یونیورسٹی میں ہندو ادیبوں پر پڑھا جانے والا مقالہ بھی شاید وہاں سے کبھی شائع نہ ہوا۔ایسے تمام مضامین کی کاپیاں تک میں نے محفوظ نہ رکھیں جس کی ذمہ دار میری لاابالی طبیعت ہے۔پھر بھی پندرہ بیس مضامین کی نقلیں میرے پاس تھیں جنھیں میں نے ایک فائل میں محفوظ کر لیا تھا لیکن

میرے سلی گوڑی کے قیام کے دوران میری کتابوں کی جو بربادی ہوئی اُس کا شکار وہ فائل بھی ہوگئی اور آج تک مجھے نہ مل پائی۔ اس بربادی میں سفینۂ خوشگو جلد دوم کا درست شدہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ بھی تھا اور خطوطِ عالمگیری کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں جمع کیا ہوا مواد بھی تھا۔ تہران یونیورسٹی سے شائع ہونے والی کلیاتِ عرفؔی کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں سات رجسٹروں پر مشتمل لکھنؤ یونیورسٹی میں محفوظ کلیات عرفؔی کی وہ نقل بھی تھی جس میں دوسرے نسخوں میں پائے جانے والے اختلافات نُسخ درج تھے اور وہ رجسٹر بھی تھے جن میں میری اہلیہ نے دیوانِ سوداؔ نقل کیا تھا اور اختلافِ نسخ نوٹ کیے تھے۔ سلی گوڑی سے لکھنؤ آکر مجھے یہ کچھ نہ ملا۔ علی شریعتی کی تمام کتابیں میرے پاس تھیں جو سب غائب تھیں۔ دو الماریاں دیمک کی نذر ہوگئی تھیں جن میں میرے دو اُردو شعری مجموعوں ''گلزار'' اور ''شاہدانِ معنی'' اور ایک فارسی مجموعہ ''خرمن گل'' کے تمام نسخوں کے علاوہ دوسرے ایرانی مطبوعات تھے جن میں شاہنامے کے نادر نسخے بھی تھے جو تہران میں فردوسؔی پر منعقد ہونے والے سیمینار کے موقع پر میں ایران سے لایا تھا۔

۳۰ جون ۱۹۸۷ء کو میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ریٹائر ہوگیا۔ اس سے قبل ۱۵/اگست ۱۹۸۴ء میں مجھے سرکارِ ہند کی طرف سے صدر جمہوریہ کے ہاتھوں ملنے والا **Certificate of Honour to Eminent Scholars** مل چکا تھا۔ اس وقت تک ایسے سرٹیفیکٹ کی بنیاد پر انٹرمیڈیٹ کلاسز پڑھانے والوں کو دو سال کی ملازمت میں توسیع ملتی تھی۔ اسی کی بنیاد پر میں نے بھی توسیع کا مطالبہ کیا۔ سبط رضی صاحب ایجوکیشن منسٹر تھے۔ مجھے ایک سال کی توسیع دی گئی۔ عام طور سے ان ریٹائرڈ ٹیچروں کو جنھیں **Re.emeployment** دیا جاتا ہے صدر شعبہ نہیں رہنے دیا جاتا لیکن میرے ساتھ ایسا نہ ہوا اور اس ایک سال کی توسیع ہونے کے زمانے میں بھی میں صدارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ دوسرے سال توسیع کے لیے میرا نام پھر وائس

چانسلر کی طرف سے سرکار کو بھیجا گیا۔ اس وقت ایک لوکل کالج کی پرنسپل مسز بخشی وزیرِ تعلیم ہو چکی تھیں۔ محترمہ سال بھر تک کوئی فیصلہ نہ کر سکیں اور میں نے ۳۰ رجون ۱۹۸۸ء میں ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی چھوڑ دی۔ میرے اس کیس کے سلسلے میں بہت بعد یہ فیصلہ ہوا کہ قومی سطح پر اعزازات پانے والوں کو یونیورسٹی خود دو سال کا Re.emeployment دے سکتی ہے۔ اس کا خوب فائدہ اٹھایا گیا۔ مرحوم مقبول احمد لاری صاحب نے آل انڈیا میر اکیڈمی قائم کی تھی اور اس کے جلسوں میں اُردو کے ادیبوں کو مختلف سرٹیفکیٹ دیا کرتے تھے۔ ایگزیکیوٹو کاؤنسل کے ایک ممبر کی تجویز پر ایسے سرٹیفکیٹوں کو نیشنل ایوارڈ مان کر کئی حضرات کو جن کا اُردو سے کوئی تعلق نہ تھا اور جنھوں نے اُردو میں ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا وہ بھی ملازمت میں دو سال کی توسیع پا گئے۔ عالم یہ ہو گیا کہ جس نے جو سرٹیفکیٹ داخل کر دیا اسے دو سال کی توسیع مل گئی۔ ایسے سرٹیفکیٹوں میں اتر پردیش اُردو اکیڈمی کے وہ سرٹیفکیٹ بھی شامل تھے جو اردو اکیڈمی سے مصنّفوں کو انعام کے ساتھ دیے جاتے تھے، وہ خطوط بھی تھے جن میں کسی مضمون پر کسی غیر ملک سے انعام ملنے کی اطلاع ہوتی تھی اور وہ سرٹیفکیٹ بھی تھے جو کسی غیر ملک میں کسی سیمینار میں شرکت کے وقت دیے جاتے تھے۔ بہر حال مجھے اس سے کیا مطلب کہ کون کیسے توسیع پا رہا ہے لیکن اس کا افسوس ضرور ہے کہ نیر مسعود صاحب کو صدر جمہوریہ ہند کا سرٹیفکیٹ آف آنر ملنے کے بعد بھی توسیع نہ ملنے پائی محض اس وجہ سے کہ یہ سرٹیفکیٹ ریٹائر ہونے کے کچھ دن بعد ملا اور بقول ان کے ان کی ایک ہمکارہ کی مخالفت اس کا باعث ہوئی۔

تیرہواں باب

پس از باز نشستگی

''شوریدگیِ طبع نے چھوڑا نہ میرا ساتھ''

ریٹائرمنٹ کے ساتھ ہی خوش حالی اور سکون کا وہ دور ختم ہوگیا جس کی ابتدا میرے ریڈر ہونے سے ہوئی تھی۔ لااُبالی فطرت کی وجہ سے ملازمت کے دوران کچھ پس انداز نہ کرسکا تھا۔ پندرہ سالہ سرکاری ملازمت کے دوران جو پراویڈنٹ فنڈ جمع ہوا ہوگا اس کا نمبر بھی میرے پاس نہ تھا تو اس کے حصول کا کیا سوال۔ یونیورسٹی میں مستقل ہونے سے پہلے ہی میں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا جس کی وجہ سے تقریباً پندرہ سال کا عرصہ مالی اعتبار سے بیکار ہی گیا۔ یونیورسٹی میں اس وقت لکچرر کا اسکیل بہت ہی کم یعنی تین سو سے آٹھ سو تک تھا۔ لہٰذا ریٹائر ہونے کے وقت یونیورسٹی سے پراویڈنٹ فنڈ بہت ہی کم یعنی تقریباً ستّر ہزار روپیہ ملا۔ ۱۹۸۶ء میں یونیورسٹی کے اساتذہ کے لیے پنشن منظور ہوگئی لیکن ملازمت میں ریٹائرمنٹ کی عمر ساٹھ سال سے گھٹا کر اٹھّاون سال کر دی گئی اور جو پرانے ٹیچر ساٹھ سال تک سروس کرنے پر مصر تھے انھیں گریچوٹی سے محروم کر دیا گیا جن میں میں بھی شامل تھا۔ یہ تمام باتیں صرف تین چار سال تک رہیں۔ اس کے بعد ریٹائرمنٹ کی عمر پھر ساٹھ سال کر دی گئی اور اب چند سال سے وہ

بڑھا کر باسٹھ سال کردی گئی ہے جس کے ساتھ پنشن اور گریچوٹی بھی ملے گی۔ چند سال قبل ایک اخباری خبر اگر درست ہے تو باسٹھ سال کے بعد بھی تین سال تک مزید ملازمت کرنے کی گنجائش نکل آئی ہے۔ میں بحیثیت پروفیسر ایک ہزار پانچ سو روپیے سے دو ہزار پانچ سو کے اسکیل میں تنخواہ پاتا تھا اور انکریمنٹ اتنا کم تھا کہ دس سال پروفیسر رہ کر بھی دو ہزار پانچ سو روپیے تک نہ پہنچ سکا۔ آج خدا کے فضل سے پروفیسر تقریباً چالیس ہزار روپیے ماہانہ تنخواہ پاتا ہے۔ چھوٹے اسکیل میں تنخواہ پانے کی وجہ سے پنشن بھی بہت کم ہوئی۔ اس میں اور کمی اس وجہ سے ہونا تھی کہ ملازمت کی مدت کم تھی۔ اس کم مدت میں بھی ڈھائی سال کی وہ مدت شامل نہ ہوئی جس میں میں نے بحیثیت عارضی لکچرر کے کام کیا تھا۔ اصولاً اس کو پنشن ملنے والے عرصے میں شامل ہونا تھا لیکن الٰہ آباد میں رشوت نہ دینے کی وجہ سے پانچ سال تک میرے کیس میں کوئی فیصلہ ہی نہ ہوا۔ یونیورسٹی نے بھی ریمائنڈر بھیجنا بند کردیا اور میں نے جو تھوڑی سی پنشن منظور ہوئی تھی اسی پر قناعت کرلی اور اس تھوڑی سی پنشن ملنے میں بھی پانچ سال لگ گئے۔ جس کے نتیجے میں میں پنشن کا کچھ حصہ **Commute** بھی نہ کرا سکا جواب بیس سال کے بعد مجھے پوری ملنے لگتی۔ سرکاری ملازمت چھوڑ کر یونیورسٹی آنے میں مالی حیثیت سے مجھے صرف نقصان اٹھانا پڑا۔ گورنمنٹ سروس میں میرے تمام ساتھی ڈپٹی سکریٹری یا جوائنٹ سکریٹری کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ مجھے یونیورسٹی جوائنٹ کرنے میں، جیسا لکھ چکا ہوں، ڈیڑھ سو روپئے ماہانہ کا نقصان ہوا تھا۔ پنشن پانے کے وقت یہ نقصان اس سے بہت زیادہ تھا۔ گریچوٹی نہ ملنا اس پر اضافہ تھا۔ پھر بھی مجھے کوئی افسوس نہ تھا۔ میری قناعت پسند طبیعت جو کچھ بھی مل رہا ہے اس پر قانع ہے۔ سرکاری ملازمت میں پیسہ تو ضرور زیادہ ملتا لیکن وہ یکسوئی اور دماغی سکون نہ ملتا جو یونیورسٹی سروس میں ملا۔ سرکاری ملازمت کے میرے ساتھی ریٹائر ہوکر گوشہ گمنامی میں دفن ہوگئے لیکن

میں آج بھی ہندوستان سے لے کر بیرونی ممالک تک زندہ ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی متعدد مرتبہ بیرون ملک بلایا جاچکا ہوں، متعدد اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہوں جس میں ہندوستان کا سب سے بڑا اعزاز صدرِ جمہوریہ کا سارٹیفیکٹ اور حکومتِ ایران کا بڑا اعزاز جائزۂ سعدیؔ بھی شامل ہیں۔ متعدد کتابوں کا مصنّف بن چکا ہوں جن میں کچھ بیرونِ ملک شائع ہوئی ہیں۔ نئی نسل کے پروفیسروں کے تقرر میں (جن میں ان کی ابتدائی تنخواہ میری آخری تنخواہ سے کئی گنی زیادہ ہے) میری سفارش کام آتی ہے۔ سرکاری ملازمت میں ڈپٹی سکریٹری تک ہونے کے باوجود مجھے آئی۔اے۔ایس۔ افسروں کے تحت کام کرنا ہوتا لیکن دوران ملازمت اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مدتوں میں آئی۔اے۔ایس۔ کے امتحان کا ممتحن رہا اور شاید اب بھی رہتا اگر پانچ سال تک سلی گوڑی میں سنیاس نہ لیا ہوتا۔ میرے بیٹے نے جب ایم۔بی۔اے۔ پاس کیا تو انھیں علی گڑھ یونیورسٹی میں لکچرر کی جگہ پیش کی گئی جسے قبول کرنے سے انھوں نے انکار کردیا اور میرے پوچھنے پر یہ جواب دیا کہ ابّو آپ ہی کو کیا ملا کہ جو میں بھی یونیورسٹی میں سروس کرتا۔ یقیناً وہ اس وقت ماشاء اللہ اتنی تنخواہ پا رہے ہیں جس کا میں تصوّر بھی نہ کرسکتا تھا۔ پھر بھی مقابلہ کرتا ہوں تو خود کو بہتر پوزیشن میں پاتا ہوں۔ صرف قناعت شرط ہے ورنہ ہوس کی تو انتہا ہی نہیں ہے۔ پھر بھی میں نئی نسل کو موجودہ مہنگائی کے دور میں پیسہ کے پیچھے دوڑنے کو جائز ہی نہیں ضروری سمجھتا ہوں۔ میں ابتدائی درجوں میں تین چار روپے فیس دے کر تعلیم حاصل کرتا تھا اور آج ہزاروں روپے ڈونیشن دے کر داخلہ حاصل کرنے کے علاوہ بالکل ابتدائی درجہ کی فیس ڈیڑھ ہزار روپیے سے زیادہ ہے۔ یہی حال علاج کا ہے۔ میرے عنفوانِ شباب میں میڈیکل کالج کے اسپتال میں داخل ہونے کے بعد دوائیں تو الگ، کھانا تک مفت بھی ملتا تھا اور اسپتال میں داخل نہ ہونے والے مریضوں کی دوا کے لیے اسپتال میں ڈسپنسری تھی جس سے مفت دوا ملتی

تھی اور آج ؟ میرے ایک عزیز کا چار روز تک اسپتال میں رہ کر انتقال ہوگیا اور چالیس ہزار روپیے کا بل مل گیا۔ اگر زیادہ آمدنی کی طرف توجہ نہ دی جائے تو یہ تمام خرچ کیسے پورے ہوں۔ پنشن نہ ملنے کے پانچ سال میری سخت پریشانی کا دور تھا جس چیز کا زندگی بھر مخالف رہا وہ خود کرنا پڑا یعنی دوسروں کے کاموں کو اجرت کی بنیاد پر کرنا۔ ایسے کاموں میں امیر خسرؔو کے رسائل اعجاز میں سے ایک رسالہ کا انگریزی میں ترجمہ کرنا بھی شامل تھا۔ کسی نہ کسی طرح یہ دور گزر گیا لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ یک مشت پنشن کی رقم ملنے سے مجھے اپنی بیٹی کی شادی میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ میرے بیٹے سروس میں آچکے تھے، میری اہلیہ کو بھی ان کے ریٹائرمنٹ کے پانچ سال بعد پنشن ملنے لگی تھی اور ایک بار پھر میرا خاندان پرسکون زندگی بسر کرنے لگا۔ اس دور میں میرا زیادہ وقت فلاحی کاموں میں گزرتا تھا۔ لکھنؤ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم انجمن اصلاح المسلمین ہے جس کا میں صدر تھا۔ اس انجمن کے تحت ایک یتیم خانہ، ہائی اسکول سے لے کر ڈگری کالج تک مختلف تعلیمی ادارے اور مسجدوں اور قبرستانوں کا انتظام ہے۔ میرے شاگرد رشید ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ کی سکریٹری شپ میں یہ ادارہ ہندوستان کے اہم ترین اسلامی اداروں میں شامل ہونے کے لائق بن گیا۔ اس دور میں بھی لکھنؤ اُردو دانوں اور اہلِ ادب سے بالکل خالی نہ ہوا تھا۔ شہر کی سب سے بڑی انجمن بزمِ شعراء تقریباً ختم ہوگئی تھی پھر بھی شعر وسخن کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اُردو اکیڈمی اور فخرالدین علی احمد کمیٹی کا وہ حال نہ تھا جیسا اب ہے۔ اس وقت تک ان میں شمولیت ایک اعزاز تھا اور آج باعثِ ننگ، اور سوائے خوش آمدیوں کے کوئی بھی خوددار شخص ان کا ممبر بننا پسند نہیں کرتا اور علماء کے بجائے سیاسی جوڑ توڑ کرنے والے اس کے اربابِ حل وعقد بن گئے ہیں۔ ۳۰/جون ۱۹۸۸ء کو ریٹائر ہوا تھا اور دوسرے روز حج بیت اللہ کو روانہ ہوگیا۔ اسی عرصے میں متعدد سفر ایران کے بھی کئے اور کچھ وقت ہندوستان میں

سیاحت میں گزارا۔ میری بیٹی اور داماد کلکتہ سے بنگلور آ چکے تھے۔ اس شہر کی بہت تعریف سنا کرتا تھا اس وجہ سے اسے دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا چنانچہ خدا نے اس کا ذریعہ پیدا کر دیا۔ بنگلور میں رہ کر جنوبی ہندوستان کے دوسرے تاریخی مقامات جن میں میسور، سری رنگا پٹن، بیجاپور وغیرہ شامل ہیں ان کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ بنگلور کے قیام کے دوران وہاں کی چند اہم شخصیتوں سے ملاقات ہوئی جن میں مقصود علی خاں خاص تھے۔ وہ بیدر کے رہنے والے تھے اور صوبہ کرناٹک سے ممبر آف پارلیمنٹ رہ چکے تھے۔ وہ بنگلور کے سب سے اہم اخبار ''پاسبان'' کے اڈیٹر تھے اور مسلمانوں کے فلاحی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ انھوں نے بنگلور کے تمام مسلم ادارے مجھے دکھائے جن میں الامین کالج اور اسی سے متعلق دوسرے ادارے بھی شامل تھے۔ انھیں میں وہ بینک بھی تھا جس کے ڈائرکٹر رحمٰن خان آج پارلیمنٹ کے ایوان بالا کے ڈپٹی اسپیکر ہیں۔ مقصود علی خاں صاحب ہی کی معیت میں مجھے ایک ایسے سیمینار میں شرکت کرنے کا موقع ملا جسے صوبۂ کرناٹک کے مسلمان آئی۔ اے۔ ایس۔ اور پی۔ سی۔ ایس۔ افسروں نے منعقد کیا تھا۔ ہر آفیسر حاضرین کو ان تمام کاموں سے باخبر کرتا تھا جو اس نے مسلمانوں کے لیے کیے تھے اور ساتھ ہی ان پروجکٹوں سے بھی مطلع کرتا تھا جو اس نے مسلمانوں کی بہبودی کے لیے بنائے تھے۔ یہ چیز اتر پردیش میں قطعاً ممکن نہیں۔ بنگلور کا دوسرا بڑا اخبار ''سالار'' تھا۔ جس کے اڈیٹر بدر الدین صاحب تھے۔ بنگلور میں ایک اور مخلص شخصیت عثمان اسد صاحب کی تھی جن کے اخبار ''نشیمن'' نے پہلی مرتبہ اہلِ لکھنؤ کو واقف کرایا تھا کہ کرناٹک کے دور افتادہ صوبہ میں بھی اردو اتر پردیش سے زیادہ مقبول ہے۔ یہ بات بنگلہ دیش بننے کے وقت کی ہے۔ اس زمانے میں ''نشیمن'' لکھنؤ آنا شروع ہوا اور پتہ چلا کہ کنٹر زبان کے علاقے میں بھی مسلمان اپنی مادری زبان اُردو سمجھتے ہیں اگر چہ یہ زبان حیدر آباد کی دکنی اُردو سے زیادہ قریب ہے۔ عثمان اسد

صاحب کا ''نشیمن''ایک زمانے میں سرکولیشن کے لحاظ سے اُردو رسائل میں سب سے زیادہ ممتاز تھا۔اسد صاحب خود ایک شریف انسان تھے اور مسلمانوں کا درد دل میں رکھتے تھے۔مقصود علی صاحب اب دُنیا میں نہیں ہیں اور عثمان اسد صاحب کینسر کا شکار ہو کر چل بسے اور بدرالدین صاحب بھی ایک حادثے کی نذر ہو گئے۔میرے اچھے شناساؤں میں بنگلور میں ایک چوتھی شخصیت محمود ایاز صاحب کی تھی۔وہ خود اُردو کے ادیب تھے اور ہر وقت کرناٹک میں اُردو کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے تھے۔موصوف بھی لبّے کے کینسر میں مبتلا ہو کر وفات پا چکے۔گذشتہ سال جب میں بنگلور میں قیام پذیر تھا تو ان تمام حضرات کی یاد بے چین کرتی تھی۔

بنگلور آکے اب کی ان یاروں کو نہ پایا
کچھ ہو گئے شتابی کچھ ہم بھی دیر آئے

(میرؔ سے معذرت کے ساتھ)

الامین کے اداروں کے علاوہ اور بھی ۴ ایسے تعلیم ادارے بنگلور میں ہیں جنھیں مسلمان چلا رہے ہیں۔بنگلور کی جامع مسجد خود ایک اہم ادارہ ہے۔ساخت کے اعتبار سے وہ ہندوستان کی خوبصورت ترین جدید مسجدوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔اس کے تحت ایک لڑکیوں کا اسکول اور دوسرے ادارے چلتے ہیں۔انتظامیہ کمیٹی میں بنگلور کے عمائدین شامل ہیں جن میں شیعہ حضرات بھی موجود ہیں۔کرناٹک میں کچھ عرصے پہلے تک مذہبی اور مسلکی مناقشات کا نام و نشان نہ تھا لیکن آر۔ایس۔ایس۔کو یہ بات پسند نہ آئی۔ہبلی کی عیدگاہ کے نام پر فساد کرانے کی کوشش کی گئی لیکن وہاں کے مسلمانوں کی دور اندیشی نے اس سازش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔اس کے بعد فضا کو خراب کرنے کے لیے آر۔ایس۔ایس۔نے خود بنگلور میں اپنے اجلاس کرنا شروع کر دیے اور اس میں کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئے۔بنگلور کے قیام کے دوران مجھے یہ

اندازہ ہوا کہ کرناٹک کے مسلمان ہمارے بہ نسبت زیادہ سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان سازشوں کے مقابلے کے لیے چند سال قبل ایک زبردست سیمینار کیا جس میں معروف اخبار نویسوں (بشمول کلدیپ نیّر) اور دوسرے ہندوستان کے اہم سیاسی حضرات نے شرکت کی تھی۔ بہر حال اس کے بعد کسی قسم کی کشیدگی کی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ بنگلور میں شیعہ حضرات کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کا امام باڑہ اور مسجد رچمنڈ ٹاؤن میں نئی تعمیر ہوئی ہے۔ مشہور کرکٹ کھلاڑی سید کرمانی کا بھی اسی فرقے سے تعلق ہے۔ بنگلور میں کسی قسم کا شیعہ سنی تفرقہ نہیں ہے اور جیسا لکھا جا چکا ہے، جامعہ مسجد کی انتظامیہ کمیٹی میں بھی شیعہ ممبر موجود ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میں بنگلور میں مہینوں قیام پذیر رہا لیکن کبھی بھی بنگلور یونیورسٹی نہ جا سکا جو شہر سے بہت دور ہے۔ یہاں کے لال باغ اور کبّن پارک خوبصورت تفریح گاہیں ہیں۔ سڑکوں کے کنارے عام طور سے بہت گھنے خوبصورت سائے دار درخت ملتے ہیں لیکن اب آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ شہر اپنا حسن کھوتا جا رہا ہے۔ زبان کے سلسلے میں یہ ذکر کرنا بھول گیا کہ اردو اکیڈمی کے علاوہ کرناٹک میں اردو میڈیم اسکول کافی تعداد میں ملتے ہیں جن کا اردو کے گڑھ لکھنؤ میں تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک مسلمانوں کی اقتصادی حالت کا تعلق ہے، وہ قابلِ رشک ہے۔ شہر کا سب سے بڑا بازار کامرشیل اسٹریٹ تقریباً پورا مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ دوسرا سب سے بڑا بازار مہاتما گاندھی روڈ پر بھی مسلمان چھائے ہوئے ہیں ایک تیسرا بازار بریگیڈ روڈ ہے یہاں بھی زیادہ تر تجارت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ پرانے شہر کے قریب جامع مسجد سے ملحقہ بازار بھی مسلمانوں کا ہے۔ شیواجی نگر بھی مسلمانوں کا ایک بڑا رہائشی علاقہ اور بازار ہے۔

فلاحی کاموں میں دلچسپی کے علاوہ ریٹائرمنٹ کے بعد میرا کافی وقت پڑھنے لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ یہ پرسکون زندگی کا دور ۱۹۹۸ء میں ختم ہو گیا جب میری اہلیہ دماغی کینسر میں مبتلا

ہوگئیں۔ جولائی ۱۹۹۹ء سے ان کی یادداشت ختم ہونا شروع ہوئی اور تمام علاجوں کے باوجود مرض بڑھتا رہا اور ۱۸/اپریل ۲۰۰۰ء کو ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئیں۔ اسی دوران مجھے اپنی بینائی میں بھی کچھ کمی محسوس ہوئی۔ عزیز گرامی ڈاکٹر طاہر زیدی (جو میرے عزیز دوست کاظم رضا مرحوم کے صاحبزادے ہیں) سے رجوع کیا۔ انھیں گلوکوما کا شبہ ہوا اور سنجے میموریل اسپتال میں فیلڈ ٹسٹ کے بعد انھوں نے اس کی تصدیق کردی۔ اسی دوران میرے ایک شناسا نے ایک دوسرے ڈاکٹر خورشید صاحب کو مجھے دکھایا جو ٹینشن کے نارمل ہونے کی وجہ سے طاہر میاں سے متفق نہ ہو سکے لیکن طاہر سلمہ نے بتایا کہ معاملہ **Low Tension Glocoma** کا ہے جس میں آپریشن بھی علاج نہیں ہے۔ اہلیہ کی علالت کے زمانے میں مستقل علاج نہ کرسکا جس کی وجہ سے مرض اور بڑھ گیا لیکن اس کے بعد سے چھ سال سے علاج مستقل ہو رہا ہے۔ دونوں آنکھوں کے کٹریٹ کا آپریشن ہو چکا ہے لیکن بینائی گھٹتی جارہی ہے اور اس وقت حال یہ ہے کہ داہنی آنکھ کی روشنی تقریباً ختم ہو چکی ہے اور بائیں آنکھ سے اس وقت جو لکھ رہا ہوں اسے بھی مشکل سے پڑھ سکتا ہوں۔ میری اہلیہ کے انتقال کے تھوڑے عرصے کے بعد میرے بیٹے سلیم انوارالحق نے ٹاٹا کی ملازمت چھوڑ کر ریلائنس ٹیلی کام جوائن کرلی اور مغربی بنگال میں سلی گوڑی میں بحیثیت ریجنل ہیڈ اُن کا تقرر ہوگیا۔ بہت عرصے پہلے گوہاٹی سے واپس ہوتے ہوئے چند گھنٹے سلی گوڑی میں رکتے ہوئے میں دارجیلنگ چلا گیا تھا لیکن اب وہ سفر ذہن سے بالکل نکل چکا۔ سلی گوڑی ایک ایسی جگہ ہے جس کا نام تک اتر پردیش میں لوگوں نے نہ سنا ہوگا اور جنھوں نے سنا وہ اسے آسام کا کوئی حصہ سمجھتے ہیں۔ میں سلیم کے سلی گوڑی جانے کے وقت بنگلور میں تھا۔ انھوں نے مجھے سلی گوڑی میں اپنے ساتھ رہنے کے لیے مجبور کردیا چنانچہ لکھنؤ آکر چند روز قیام کرکے مکان کو بیٹے کے ڈرائیور عتیق اللہ کے حوالے کرکے سلی گوڑی چلا گیا۔ سلی گوڑی اور

اور انھیں سے مجھے انصاریانِ پانی پت کا شجرہ ملا تھا۔ شہر امراوتی میں کوئی خاص چیز دیکھنے کی نہیں ہے۔ کسی زمانے میں یہ برار کی حکومت کا حصہ تھا اور اس کا دارالحکومت امراوتی سے قریب ہی تھا لیکن مجھے وہاں جانے کا موقع نہ مل سکا۔ سنا ہے کہ وہاں کی جامع مسجد میں اکبر نے گھوڑے بندھوانے کا حکم دیا تھا۔

وسطی ہند کا آخری شہر بھوپال ہے جہاں مجھے متعدد مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ حیدرآباد کی طرح یہ ان چند شہروں میں ہے جہاں شمالی ہند کے پریشان حال لوگوں، خصوصاً مسلمانوں کو، پناہ ملا کرتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہاں مقامی آبادی سے زیادہ باہر سے آ کر آباد ہونے والوں کی تعداد ہے۔ نوابی عہد کے پہلے اس جگہ کی کوئی اہمیت نہ تھی اور نوابی عہد میں بھی اس شہر کی اہمیت بیگموں کے دورِ حکومت میں زیادہ ہوگئی۔ یہ بیگمیں علم کی سرپرست تھیں اور اکثر ملک کے مشہور علماء کی سرپرستی کیا کرتی تھیں چنانچہ صدیق حسن خان صاحب ایک معمولی حیثیت کے انسان سے نواب اور ایک نیم آزاد حکومت کی حکمراں کے شوہر بن گئے۔ ان کے اور ان کی اخلاف کی علمی خدمتوں سے شاید ہی کوئی اہلِ علم واقف نہ ہو۔ ان بیگموں کے عہد میں شاندار عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں جن کی ایک مثال تاج المساجد ہے جو غالباً دہلی کے جامع مسجد سے وسعت میں کم نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ان علم دوست حکمرانوں کی اولاد کا علم و فضل سے کوئی علاقہ نہ رہا۔ پہلے وہ کرکیٹیر بنے اور اب فلم ایکٹر۔ یہ بات کچھ حکمراں خاندان کے اخلاف تک محدود نہیں ہے۔ بھوپال سے کبھی ڈاکٹر اقبال کا بھی تعلق تھا لیکن آج بی۔ جے۔ پی حکومت بننے کے بعد بھوپال کے ابن الوقت شاعر بھی اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں جس کی مثالیں بشیر بدر اور منظر بھوپالی ہیں۔

''ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا''

موجودہ بھوپال ایک بلند و پست جگہوں پر بسا ہوا ایک جدید، خوبصورت، اور صاف ستھرا شہر ہے جہاں برکت اللہ یونیورسٹی بھی ہے اور انجینئرنگ کے ادارے بھی اور تجارتی مراکز بھی۔ انھیں تجارتی کمپنیوں کے مراکز میں ایک وہ بھی تھی جہاں گیس لیک ہوجانے سے سیکڑوں افراد ختم ہوگئے اور ہزاروں موت سے بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر مجھے بھی بھوپال بلایا گیا تھا۔ جس دن بقیہ گیس خالی کی جانے والی تھی اسی روز بھوپال یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر کا انتخاب ہونا تھا۔ میں سری نگر سے دہلی ہوکر بھوپال آ رہا تھا۔ دہلی اسٹیشن پر گاڑی روانہ ہونے کے وقت صبح کا اخبار آیا جس میں گیس خالی ہونے کی خبر تھی۔ لوگ فوراً اترنا شروع ہوگئے اور یہ سلسلہ گاڑی چلنے کے وقت تک جاری رہا۔ میں بہرحال چلتی گاڑی سے نہ اترا۔ پہلا جائے توقف (Stopage) جھانسی تھا۔ بقیہ مسافر جھانسی میں اترنے لگے میں نے ان حالات میں بھوپال جانا مناسب نہ سمجھا اور جھانسی سے اتر کر لکھنؤ واپس چلا آیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ دوسرے اکسپرٹ پروفیسر محمد صدیق صاحب مرحوم کسی نہ کسی طرح بھوپال پہنچ گئے لیکن انھیں یونیورسٹی تک پہنچنا مشکل ہوگیا۔ اس لیے کہ اسٹیشن پر کوئی سواری ہی نہ تھی۔ بہرحال سلکشن کمیٹی ہوئی اور عزیزم فدا عباس پروفیسر ہوگئے۔ بھوپال ایک خوبصورت جگہ ہے اور وہاں کی زندگی وہ عظیم تالاب ہے جس کے گرد ایک مرتبہ مجھے بھی گھومنے کا موقع ملا۔ عمارتیں میدانی علاقوں اور پہاڑی بلندیوں پر واقع ہیں۔ ہریالی کی بھی کمی نہیں ہے۔ مدھیہ پردیش کا دارالحکومت بننے کے بعد شہر کی رونق دوبالا ہوگئی ہے۔ بھوپال یونیورسٹی کے فارسی شعبہ کی موجودہ صدر طاہرہ عباسی ہیں جن کے ریڈرشپ کی میٹنگ میں ایک اکسپرٹ میں بھی تھا۔

موجودہ مہاراشٹر جس میں ۱۹۶۰ء کے بعد ریاست حیدرآباد کا کافی حصہ شامل کرلیا گیا اس کے صرف چند علاقوں کو مجھے دیکھنے کے مواقع ملے۔ ممبئی ہندوستان کا اقتصادی دارالحکومت

ہے، وہاں ممبئ یونیورسٹی اور یو۔جی۔سی۔کے کاموں کے علاوہ بھی مجھے اکثر جانے کی ضرورت پیش آئی اور ایک مرتبہ کرُلا میں تقریباً ایک مہینہ قیام کیا۔ممبئ کا میرا آخری سفر ممبئ اردو اکاڈمی اور ایران کلچرل ہاؤس کے مشترکہ جشنِ حافظ میں شرکت کے لیے ہوا تھا اور دوست محترم مجروحؔ سلطانپوری مرحوم کے ساتھ قیام تھا۔اس وقت مجروحؔ صاحب کے حالات کچھ ٹھیک نہ تھے اور انھیں اپنا ایک فلیٹ بیچ دینا پڑا تھا۔مجروحؔ صاحب نے علی رضا صاحب اور ان کی بیگم فلم اسٹار نمّی اور میوزک ڈائرکٹر نوشاد کے علاوہ اپنے کچھ دوسرے دوستوں کو بھی مجھ سے ملوانے کے لیے بلوایا تھا۔شعر و شاعری کی محفل بھی جمی جس میں نوشاد مرحوم نے بھی اپنے کچھ شعر سنائے تھے۔دن کو جشنِ حافظؔ کے موقع پر سردار جعفری سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ان سے پہلے لکھنؤ میں اور ایک مرتبہ اپنے ہم زلف اویس صاحب کے یہاں علی گڑھ میں بھی ملاقات ہوئی تھی۔علی سردار صاحب کو اویس بھائی کی ہمشیرہ منسوب تھیں۔ایک دوسرے موقع پر ممبئ یونیورسٹی سے متعلقہ کالج کے استاد ڈاکٹر نورالسعید اختر کے ساتھ بھی ایک روز قیام رہا۔اختر صاحب کا میں پی۔ایچ۔ڈی تھیس کا ممتحن تھا۔ممبئ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر محی الدین مومن کا ۱۹۷۶ء میں کچھ مہینوں تک ایران میں میرا ساتھ رہا تھا۔اس یونیوسٹی کے ایک کالج سے متعلق ڈاکٹر گوریکر انجمن استادانِ فارسی کے سالانہ جلسوں میں مستقل شرکت کرنے والوں میں تھے اور ان سے میری ملاقات بہت اچھی تھی۔ان حضرات سے بھی ان سفروں میں میری ملاقات رہی۔گوریکر صاحب دادر کے رہنے والے تھے۔ایک سفر کے دوران جب میں اہل و عیال کے ساتھ ممبئ گیا تھا تو گوریکر صاحب کی قیامگاہ پر بھی ایک دن گزارا تھا۔ممبئ ہندوستان کا مشہور شہر ہے۔اس کے شہری علاقے اور سمندری کنارے سب میرے دیکھے ہوئے ہیں لیکن وہ اتنے معروف ہیں کہ انھیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔الیفینٹا کے تراشیدہ غار (Elephanta Caves) جو سمندر کے ایک

جزیرے میں ہیں، میں نہ دیکھ سکا جس کا ہمیشہ افسوس رہا۔ ممبئ فلم انڈسٹری کا مرکز ہے اور عموماً لوگوں کی خواہش اسٹیڈیو اور فلم شوٹنگ دیکھنے کی رہتی ہے۔ میری اس میں دلچسپی نہ تھی نہ ہے۔

اپنے ایک سفر کے دوران جس میں میری اہلیہ بیگم ہاجرہ ولی اور بیٹی دُرِ ثمین ساتھ تھیں مجھے ممبئ سے پونے جانے کا اتفاق ہوا۔ ممبئ سے پونے کا پہاڑوں کے درمیان سے راستہ کشمیر کے راستے کی یاد دلاتا ہے۔ پونے ایک صاف ستھرا اور بڑا شہر ہے۔ اس زمانے میں وہ بین الاقوامی شہرت والے آچاریہ رجنیش کی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور ان کا آشرم اہلِ یورپ وامریکہ کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے تھا۔ پونے میں ہمارا قیام کرنل مظفّر کے یہاں ہوا۔ وہ لکھنؤ کی مشہور فرم اصغر علی محمد علی، تاجر عطر کے مالکان میں سے اکبر علی خان صاحب مرحوم کی چھوٹی بیٹی رضیہ کے شوہر ہیں۔ اس خاندان سے میری بیوی کے گھر سے انتہائی گہرے تعلقات تھے۔ پونے میں ایک روز قیام کے بعد میں احمد نگر چلا گیا جسے دیکھنے کی مجھے مدّت سے تمنّا تھی۔ یہ شہر نظام شاہی حکومت کا دارالحکومت رہ چکا تھا۔ بہمنی سلطنت کے آخری دنوں میں محمود بہمنی کے وزیر قاسم برید کے اقتدار کے خلاف بغاوت کر کے ۱۴۹۴ء میں ملک احمد نظام شاہ نے قدیم قصبے بھنگر (Bhingar) کی جگہ اپنے نام سے نئے شہر احمد نگر کی بنیاد ڈالی اور نظام شاہی سلطنت قائم کی جو مغلوں کی توسیع پسندی کا ابتدائی نشانہ بنی۔ برہان نظام شاہ کے بعد اکبر نے اسے فتح کرنا چاہا تھا لیکن وہاں کے شاہی خاندان کی ایک بیٹی چاند سلطانہ جو بیجاپور کے شاہی خاندان کی بہو تھیں، اپنے پوتے کی مدد کو آگئیں اور ملک عنبر کے ساتھ مل کر احمد نگر کا دفاع کرتی رہیں۔ بعد کو ۱۶۳۶ء میں شاہجہاں نے اسے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس سلسلے میں لکھنے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ شمال میں مغلیہ سلطنت ہونے کی وجہ سے افغانستان سے پٹھان سپاہیوں کی بھرتی دشوار ہو گئی تھی۔ ملِک عنبر نے مقامی لوگوں کو فنِّ سپہ گری سکھا کر ان کی فوج تیار کی۔ اس طرح مرہٹواڑہ

کے رہنے والے جن کا پیشہ کاشتکاری تھا، کسان سے سپاہی بن گئے اور ہندوستان کی آئندہ تاریخ میں انھوں نے نمایاں کارنامے انجام دئے۔ احمد نگر میں میرا ایک روزہ قیام پروفیسر عبدالکریم صاحب کے یہاں رہا۔ عبدالکریم صاحب باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے اور میری ان کی شناسائی انجمن استادانِ فارسی کے جلسوں سے ہوئی اور رفتہ رفتہ دوستی میں بدل گئی۔ عبدالکریم صاحب کے ساتھ قیام مجھے مہنگا پڑا۔ ان کے خلوص اور خاطر داری نے مجھے ان کے گھر سے نکلنے نہ دیا اور میں شہر احمد نگر کو جس طرح دیکھنا چاہتا تھا نہ دیکھ سکا۔ صرف احمد نگر کے قلعہ کے دُور سے درشن کر لیے۔ یہ وہی قلعہ ہے جس میں آزادی ہند سے پہلے مولانا آزاد کو نظر بند رکھا گیا تھا۔ تیرا میل دور بلندی پر چاند سلطانہ کا مزار بھی احمد نگر سے مجھے دکھا دیا گیا۔ شری ڈی جس کے سائیں بابا عالمی شہرت کے مالک ہیں اور جن کے مندر ہندوستان میں جا بجا بنے ہوئے ہیں احمد نگر سے قریب ہی ہے۔ عبدالکریم صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مسلمان درویش تھے جو ایک مسجد کے حجرے میں پڑے رہتے تھے۔ سنا ہے کہ وہ مسجد انھیں کے مندر میں تبدیل ہوگئی۔ احمد نگر سے پونے آ کر اہلیہ اور بیٹی کو کرنل مظفر کے یہاں سے لے کر ممبئی ہوتا ہوا لکھنؤ واپس ہوا تھا۔

مہاراشٹر میں میری تیسری اہم زیارت گاہ اورنگ آباد تھا جو کبھی ریاست حیدر آباد کا دوسرا اہم ترین شہر تھا۔ وہاں میں نربدا کے اِس پار دکن میں اپنے پہلے سفر کے دوران ۱۹۵۱ء میں گیا تھا۔ یہ شہر وہ ہے جہاں میرے چھوٹے چچا ظہور الحق صاحب مرحوم ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان کا انتقال مئی ۱۹۴۶ء میں ہوگیا تھا۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں مجھے بیدر میں مقیم اپنے منجھلے چچا وحید الحق صاحب کی شدید علالت کی اطلاع ملی تھی اور میں انھیں لکھنؤ واپس لانے کے لیے بیدر گیا تھا۔ وہ سفر بھی عجیب و غریب تھا۔ مجھے بیدر کا راستہ نہیں معلوم تھا۔ لوگوں کے بتانے پر پرلی، پربھنی، ناندیڑ کے راستے سے جانا چاہا لیکن جب نہ پہنچ سکا تو اسی راستے سے سیدھا حیدر آباد چلا

گیا اور وہاں سے Shutlle سے بیدر پہنچا۔ اورنگ آباد کے ذکر سے پہلے مناسب ہے کہ بیدر کا کچھ ذکر کردیا جائے۔ سرخ مٹی پر آباد یہ چھوٹا سا شہر جو پہلے نظام حیدرآباد کی مملکت میں تھا اور اب کرناٹک کا حصّہ ہے، عہدِ وسطیٰ میں عظیم بہمنی سلطنت کا دوسرا دارالحکومت تھا۔ بہمنی سلطنت کے بانی علاء الدین حسن بہمن علاء الدین خلجی کے مشہور جنرل ظفر خان کا بھتیجا تھا۔ بحیثیت بادشاہ اس کی تاجپوشی دولت آباد میں قطب الدین مبارک کی مسجد میں ۳؍اگست ۱۳۴۷ء میں ہوئی۔ اس نے گلبرگہ کو دارالحکومت بنایا۔ اسی خاندان کا نواں بادشاہ احمد شاہ اول حضرت بندہ نواز گیسودراز کے انتقال کے بعد گلبرگہ سے منتقل ہوکر بیدر چلا آیا۔ بہمنی سلاطین کے بعد وہ برید شاہوں کا دارالحکومت بنا۔ اس چھوٹے سے شہر میں ایک نشیبی وادی میں آج بھی بہمنی بادشاہوں کے مقبرے موجود ہیں۔ ان میں ایک مقبرہ احمد شاہ بہمنی اوّل (۱۴۳۶-۱۴۲۲ء) کا ہے جو اپنی نیکی کی وجہ سے احمد شاہ ولی کہلاتا ہے۔ اس کے مزار کا متولی ایک ہندو ہے جو سال میں ایک بار مقبرے کو کھولتا ہے اور وہاں فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ ایک دوسرا مقبرہ وہ ہے جس کا گنبد بیچ سے شق ہوگیا تھا۔ اس پر بجلی گری تھی اور وہ دونیم ہوگیا تھا اور صرف آدھا باقی ہے۔ یہ مقبرہ ایک ظالم بادشاہ ہمایوں علاء الدین (۶۱-۱۴۵۸ء) کا ہے اور کہا جاتا ہے قہرِ الٰہی کے طور پر اس کے مقبرے پر بجلی گری تھی۔ بیدر میں بہمنی خاندان کے آخری صاحب سطوت بادشاہ محمود شاہ کے وزیر اور علم و فن کے سرپرست محمود گاواں کا مدرسہ آج بھی موجود ہے۔ محمود گاواں ایرانی تھا اور ہندوستانی امرا اسے برداشت نہ کرسکے اور اس کے خلاف محمود شاہ کے کان بھرتے رہے یہاں تک کہ محمود شاہ نے اسے قتل کروادیا اور یہ واقعہ بہمنی سلطنت کے زوال کا پیش خیمہ بنا۔ برید شاہی دور کی بھی کچھ عمارتیں اب تک بیدر میں موجود ہیں۔ لیکن آج پچپن سال کے بعد ان کی یاد کے نقوش دل سے مٹ چکے ہیں۔ بیدر اپنی بیدری کام کی صنعت کے لیے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔

سیاہ پالش کیئے ہوئے لوہے پر چاندی اور سونے کے تاروں سے نقاشی کی جاتی ہے۔ شیروانی کے بٹن، گلدان اور دوسرے برتن دُنیا بھر میں بھیجے جاتے ہیں لیکن فائدہ اٹھانے والے بیچ کے لوگ ہوتے ہیں۔ اصل کاریگر تو کوٹھریوں میں رہتے ہیں اور وہی ان کے چھوٹے چھوٹے کارخانے ہیں۔ بنگلور کے قیام کے دوران اخبار پاسبان کے ایڈیٹر، سابق ایم۔ پی۔ مقصود علی خان صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ان کا وطن یہی شہر بیدر تھا۔

بیدر سے میں نے وحید چچا کو ساتھ لکھنؤ لانا چاہا لیکن انھوں نے کہا کہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد گرمی کی چھٹی ہوگی اور تب ہی وہ لکھنؤ آئیں گے۔ چنانچہ مجھے تنہا ہی آنا پڑا اور راستے میں میں اورنگ آباد میں رک گیا۔ ایک معمولی سے اجنتا ہوٹل میں قیام کیا۔ سنا ہے کہ اب وہ اورنگ آباد کا ایک بڑا ہوٹل ہے۔ دوسرے روز شہر کی سیر کو نکلا۔ یہ وہی شہر تھا جہاں کبھی ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی سخن سرائی فرمایا کرتے تھے اور اورنگ زیب کی آمد سے پہلے جس کا نام کھِڑکی تھا۔ شہر میں میرے دیکھنے کی دو جگہیں تھیں، ایک بی بی کا روضہ اور دوسری شاہی پن چکی۔ بی بی کا روضہ اورنگ زیب کی ایک بیگم کا مزار ہے جسے اس کے بیٹے اعظم شاہ نے تعمیر کروایا تھا۔ مقبرہ بالکل دوسرا تاج محل ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس پر سنگِ مرمر کے بجائے سیپ کے مسالے کا پلاسٹر ہے اور اس نقاشی سے بھی محروم ہے جس کی وجہ سے تاج محل ایک عجوبۂ روزگار ہے۔ دوسری قابلِ دید عمارت پن چکی ہے جسے ملک عنبر نے بنوایا تھا اور جس کے لیے دیوگری پہاڑی سے ایک نہر کے ذریعہ پانی لایا جاتا تھا۔ اب وہ ویران کسمپرسی کے عالم میں پڑی ہے۔

اورنگ آباد اور اس کا نواحی قلعہ بند ویران شہر دیوگری یا دولت آباد کسی زمانے میں ستاوہین، وکاتکاس، چالوکیہ اور راسٹرکوٹ راجاؤں کی سلطنت کا حصّہ تھا جن کی سرپرستی میں اجنتا اور الورا کے مندر وجود میں آئے۔ علاء الدین خلجی نے اسے فتح کیا تھا اور ملک کافور اُدھر سے

ہوتا ہوا مزید جنوب میں گیا تھا۔ محمد تغلق کے زمانے میں دیوگری دوبارہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا اور اپنی سلطنت کی وسعت کے پیشِ نظر اسے دیوگری وسطِ سلطنت میں معلوم ہوا اور اس نے اسے دارالحکومت بنالیا۔ دیوگری (دولت آباد) کا قلعہ آج بھی ناقابلِ تسخیر معلوم ہوتا ہے۔ قلعہ کے گرد متعدد حصار ہیں جن کا پار کرنا آسان کام نہ ہوگا۔ دولت آباد کے قریب ہی متعدد مسلمان صوفیوں کے مقابر ہیں اور انھیں میں حضرت برہان غریب کا مقبرہ بھی شامل ہے جس کے حصار میں اورنگ زیب کی کچی قبر ہے۔ یہ علاقہ اب خلد آباد کہلاتا ہے۔

اورنگ آباد کے نواح میں مشہور عالم اجنٹا اور الورا کے غار ہیں۔ اجنٹا کا فاصلہ شہر سے تقریباً چھتیس میل ہے۔ میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ میں وہاں جا سکتا۔ البتہ الورا قریب تھا۔ ایک شام کو وہاں گیا اور رات گیسٹ ہاؤس میں بسر کی۔ صبح کو الورا کے مندروں کو دیکھنے نکل گیا جو کئی صدیوں کی محنت سے تیار کیے گئے ہیں۔ اہرامِ مصر دنیا کے عجائبات میں ہیں لیکن میرے خیال میں الورا کے غاروں کے مندر ان سے کہیں زیادہ تحیّر خیز ہیں۔ اہرام میں تو بڑے بڑے پتھروں کے بلاکوں کو بلندی تک لے جانا ایک ناممکن بات کو ممکن بنانا تھا لیکن الورا میں پہاڑ کو کاٹ کر اس کے اندر تین منزلہ تک عمارتیں بنانا اس سے کہیں زیادہ مشکل کام اور فنکارانہ مہارت کا کارنامہ ہے۔ ان مندروں کی تعداد بہت کافی ہے جواب یاد نہیں لیکن ان میں دو ایسے ہیں جن کا نقشہ اس وقت بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ ان میں ایک بُدھ مندر ہے۔ سامنے سے پہاڑ کی ڈھال میں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آتا ہے۔ دروازے سے اندر داخل ہو کر ایک وسیع صحن میں پہنچ جاتے ہیں جسے پورا پہاڑ صاف کر کے بنایا گیا ہے۔ صحن کے آگے پیچھے کئی دالان ہیں۔ ان کے اوپر ایسی ہی دوسری منزل ہے اور اس پر ایسی ہی تیسری منزل جس کی چھت بلند پہاڑ ہے۔ نچلے دالانوں میں آخری میں گوتم بدھ کی مورتی ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ کس

طرح پورے پہاڑ کو تراش کر اس کے اندر سہ منزلہ عمارت بنائی گئی ہوگی۔ عمارت بالکل سادی ہے لیکن کہیں رنگین دھبّے موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اجنٹا کے غاروں کی طرح ان میں بھی مصوّری (Paintings) ہوگی۔ دوسرا کیلاش مندر ہے، انتہائی منقش۔ کھجراہو اور پوری کے مندروں کی طرح یہ مندر بھی جنسی عمل کرتے ہوئے بتوں سے مزین ہے۔ میرے بیٹے کے ہم زلف کا خاندان اورنگ آباد میں مقیم ہے۔ ان سے پتہ چلا کہ اجنٹا کے غار تو الگ، ان کے پاس پڑوس کا علاقہ قدرتی حسن کے سلسلے میں لاجواب ہے۔ افسوس میں دوبارہ اس علاقے میں نہ جا سکا اور دنیا کے عجوبہ اجنٹا اور اس کے نواحی علاقے کو نہ دیکھ سکا۔

مہاراشٹر کا دوسرا دارالحکومت ناگپور بھی میں متعدد مرتبہ گیا۔ عربی فارسی شعبہ کے صدر ڈاکٹر رفیع الدین صاحب میرے کرم فرما اور پروفیسر شپ کے انتخاب میں اکسپرٹ بھی تھے۔ ان کے دور صدارت میں میں وہاں نہ جا سکا لیکن ان کے جانشین ڈاکٹر عبدالرحیم نے مجھے ناگپور جانے کے مواقع فراہم کئے اور یہ سلسلہ ان کے جانشین ڈاکٹر عبدالرب عرفان صاحب کے دور صدارت تک جاری رہا۔ ناگپور آر، ایس، ایس کا ہیڈ کواٹر ہے اور میں سمجھتا تھا کہ وہاں مسلمانوں کی حالت خراب ہوگی لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسٹیشن کے قریب ہی مسلمانوں کا پورا ایک علاقہ مومن پورہ موجود ہے اور شہر میں متعدد اردو میڈیم اسکول بھی ہیں۔ میری ملاقات مہاراشٹر ہائی کورٹ کے ایک جج صاحب سے بھی ہوئی جن کا نام ذہن سے نکل گیا ہے۔ ہمارے یہاں کے بیشتر مسلمان ججوں کے برخلاف وہ کھلے طور سے خالص مسلمانوں کی انجمنوں کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور کارآمد مشورے دیتے تھے۔ ناگپور کے نواح میں کامٹی قصبہ ہے جہاں نوے فیصدی مسلمانوں کی آبادی ہے۔ وہ بنکر برادری کا گڑھ ہے۔ لوگ کافی خوشحال، پڑھے لکھے اور علم دوست ہیں اور وہاں اکثر بڑے مشاعرے ہوا کرتے ہیں جن میں معروف شعراء

حصّہ لیتے ہیں۔ اس قصبہ کے کئی حضرات ناگپور یونیورسٹی کے استاد ہیں یا رہ چکے ہیں۔ عبدالرب عرفان صاحب بھی اسی قصبہ کے باشندے تھے اور ایک روز کامٹی میں مجھے بھی ان کی قیام گاہ پر رکنا اور شام کو ایک ادبی محفل میں حصّہ لینا پڑا۔ موجودہ صدر شعبۂ فارسی ڈاکٹر خالدہ نگار کا وطن بھی کامٹی ہے۔ خود شہر ناگپور میں میری دلچسپی کے سامان کم تھے۔ گاندھی جی کا واردھا آشرم ناگپور سے بہت دور نہیں ہے لیکن میں وہاں نہ جاسکا۔ ناگپور میں میرا قیام عموماً ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب کے یہاں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مجھے اپنی احباب کالونی میں لے گئے اور وہیں میرا قیام رہا۔ عبدالرحیم صاحب بھی شہر کے مضافات میں اسی کالونی میں رٹائر ہوکر چلے گئے تھے۔

حیدرآباد کی ہوا میں مَیں نے پہلی بار ۱۹۵۱ء میں سانس لی تھی۔ لیکن، جیسا کہ لکھ چکا ہوں، صرف اسٹیشن سے بیدر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد اس شہر میں اتنی مرتبہ جانا ہوا کہ ان کی تعداد تک یاد نہیں۔ ریاست حیدرآباد سے میرے خاندان گا گہرا تعلق رہا ہے۔ مختلف زمانوں میں یہاں کے علماء نہ صرف وہاں جاتے رہے بلکہ مستقل آباد بھی ہوتے گئے۔ چنانچہ آج سے کئی پشت پہلے ملک العلماء ملاّ حیدر حیدرآباد میں بس گئے تھے اور ان کی نسل کے حضرات آزادئ ہند کے بعد تک وہاں رہے لیکن اب شاید کوئی نہیں ہے۔ بعد کے جانے والوں میں میرے دادا مولانا فضل حق اور ان کے دو چچازاد بھائی شمس الحق صاحب اور امتیاز الحق صاحب بھی تھے۔ میرے دادا اور ایک چچا وحید الحق صاحب خاکِ حیدرآباد میں مستقل آرام پذیر ہیں اور دوسرے چچا اورنگ آباد میں۔ میرے دادا کے چچازاد بھائیوں کے خاندان مستقل طور سے حیدرآباد میں بس گئے تھے لیکن ان میں سے اب صرف ایک ڈاکٹر سلمٰی جلیل حیدرآباد میں ہیں اور باقی سب پاکستان یا دوسرے ممالک جا چکے ہیں۔

قطب شاہی سلطانوں کا دارالحکومت گولکنڈہ تھا لیکن پانی کی کمی کی وجہ سے محمد قلی قطب شاہ نے ۱۵۹۰ء میں حیدرآباد کی بنیاد ڈالی اور اسے دارالحکومت بنایا۔ اس نئے شہر کی سب سے قدیم عمارت چار مینار ہے جو شہر کے وجود میں آنے کے ایک سال کے بعد یعنی ۱۵۹۱ء میں بنایا گیا۔ شاید باہر کے کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ چار مینار کی بلند عمارت کے اوپر ایک مسجد ہے۔ حیدر آباد نظام الملک کے خاندان کی حکومت کے زمانے میں ایک پرامن شہر رہا ہے۔ اس وقت سے آج تک وہ اپنی صفائی اور معتدل آب وہوا کے لیے ہندوستان کا ایک منفرد شہر رہا ہے۔ یہ ہندوستان کا پہلا شہر ہے جس میں ذریعہ تعلیم ایک ہندوستانی زبان اُردو کو بنایا گیا اور اس معنی میں بھی پہلا ہے کہ دارالترجمہ کے ذریعہ کسی ہندوستانی زبان میں بیرونی علمی اصطلاحات کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا۔ آج بھی ہندوستان میں سب سے زیادہ یونیورسیٹیاں اسی شہر میں ہیں۔ آزادیٔ ہند کے بعد مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی وجود میں آئی۔ آج بھی حیدرآباد، اردو کا سب سے بڑا مرکز ہے اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے مزاحیہ مشاعرے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ حسین ساگر کو ابراہیم قطب شاہ نے ۱۵۶۲ء میں بنوایا تھا۔ اس کی وجہ سے حیدرآباد میں سمندر کا لطف آتا ہے۔ تیلگو دیشم کے دور حکومت میں اسے اور خوبصورت بنا دیا گیا ہے اور اس کے بیچ میں گوتم بدھ کا مجسمہ نصب کر دیا گیا ہے۔

حیدرآباد سے پہلے قطب شاہیوں کا دارالحکومت حیدرآباد سے گیارہ کلومیٹر کے فاصلے پر گولکنڈہ تھا۔ اس کی ابتدا مٹی کے قلعہ کی شکل میں ورنگل کے کاکتیہ حکمرانوں کے دور میں ہوئی۔ اور اسے ایک پتھر کا مضبوط قلعہ قطب شاہی خاندان کے ابتدائی تین حکمرانوں نے بنایا۔ وہ ہندوستان کے مضبوط ترین قلعوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ قلعہ کے آٹھ دروازے تھے جن میں فتح دروازہ سب سے اہم ہے۔ اورنگ زیب اسی سے قلعہ میں داخل ہوا تھا اور اب یہی قلعہ میں

جانے کا راستہ ہے۔اس دروازے میں ایک خاص جگہ سے اگر تالی بجائی جائے تو سب سے بلند محل میں آواز پہنچ جاتی ہے۔ (یہی چیز میں نے بیجاپور میں دیکھی تھی)۔قلعہ میں کسی زمانے میں شاندار مسجدیں اور دوسری عمارتیں تھیں جن میں سے اب بھی کچھ باقی ہیں۔ بالا حصار دروازہ دوسرا شاندار دروازہ ہے جہاں سے ۳۸۰ سیڑھیاں چڑھ کر بالا حصار بارہ دری تک جایا جاتا ہے۔قلعہ کے باہر تقریباً ایک کلومیٹر دور قطب شاہی بادشاہوں کے مقابر ہیں۔اس خاندان کے آخری بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کے متعلق مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ وہ فنونِ لطیفہ کا دلدادہ اور عیش وعشرت میں مست رہنے والا کہا جاتا ہے لیکن برسوں اس نے اورنگ زیب کی زبردست طاقت کا مقابلہ کیا۔موجودہ آندھرا پردیش میں میرا گذر مذکورہ جگہوں کے علاوہ کہیں اور نہیں ہوا۔

جنوبی ہند میں مجھے آندھرا کے علاوہ تامل ناڈو اور کرناٹک کے مختلف مقامات دیکھنے کے مواقع ملے۔مدراس کے بارے میں شاید پہلے کچھ لکھ چکا ہوں۔یونیورسٹی کے تعلیمی کاموں کے علاوہ **Inter 'Varsity Rowing Competition** کے سلسلے میں بھی میں اس شہر گیا اور پنجاب ایسوسی ایشن اور تھاؤزنڈ لائٹ امامباڑے کے مشاعروں میں شرکت کے لیے بھی میں بہت بار مدراس گیا اور دل کھول کر اس شہر کو دیکھا۔وہاں میری دلچسپی کا خاص سبب یونیورسٹی سے ملحق اورینٹل لائبریری اور یونیورسٹی کے سامنے کی سمندری بیچ تھی۔ مدراس آخری مرتبہ آنکھوں کے علاج کے سلسلے میں وہاں کے مشہور آنکھوں کے اسپتال شنکر نیترالے گیا تھا۔اتفاق سے وہ عید کا دن تھا۔ ہوٹل کے قریب ہی ایک مسجد میں نماز پڑھنے چلا گیا۔نماز میں چھ تکبیر زاید ہر رکعت میں پڑھی گئیں جو میرے لیے ایک نئی بات تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ مسجد شافعی مسلک کے حضرات کی تھی جن کے یہاں دونوں رکعتوں میں چھ چھ زاید تکبیریں پڑھی جاتی ہیں۔اس موقع پر مدراس کافی بدلا ہوا نظر آیا لیکن میں وہاں گھوم نہ سکا۔مدراس میں مسلمان کم ہیں لیکن منظّم اور

خوشحال ہیں اوراس شہر میں آج بھی گورنمنٹ قاید ملّت گرلز کالج اور گورنمنٹ قائدِ ملّت بوائز کالج موجود ہیں۔ یہ قائد ملّت سیٹھ اسماعیل مسلم لیگ کے ایک بڑے لیڈر تھے۔ کیا یو پی میں گورنمنٹ کی طرف سے راجہ محمود آباد یا چودھری خلیق الزماں کالج قائم ہو سکتے ہیں؟ وہاں اردو جاننے والے کم ہیں لیکن جتنے ہیں وہ اردو کے شیدائی ہیں۔ پنجاب ایسوسی ایشن جس کے مشاعروں کے کنو ینر کمال مدراسی مرحوم ہوا کرتے تھے دراصل پنجاب کے غیر مسلموں کی انجمن ہے لیکن ان کے اُردو مشاعرے دو دو دن چلتے ہیں۔

کرناٹک میں بنگلور کے متعلق بھی شاید کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس خوبصورت شہر میں بھی مجھے مہینوں رہنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اس کی چوڑی سڑکیں، ان کے کنارے لگے گھنے سایہ دار درخت، لال باغ، کبّن پارک اور بارونق کامرشیل اسٹریٹ اور مہاتما گاندھی روڈ کے علاوہ وہاں کے الامین اور دوسرے اسلامی ادارے بھلانے والی چیزیں نہیں ہیں۔ وہاں اُردو ہمارے لکھنؤ سے زیادہ رائج ہے۔ باقاعدہ اُردو میڈیم اسکول ہیں اور اہم اُردو اخبار نکلتے ہیں جن کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ہمارے صوبے کے برخلاف مسلمان عام طور سے بیدار مغز اور منظّم ہیں۔ وہ خوشحال ہیں اس لیے کہ عموماً تجارت پیشہ ہیں۔ کامرشیل اسٹریٹ کی زیادہ تر دوکانیں مسلمانوں کی ہیں۔ میسور اور سری رنگا پٹم کا بھی شاید ذکر کر چکا ہوں۔ میسور میں میری دلچسپی کی کوئی چیز نہیں۔ راجہ کا محل بڑا ضرور ہے لیکن جاذبِ نظر بالکل نہیں۔ سری رنگا پٹم کا قلعہ بالکل ویران ہے۔ باہر Summer Palace کے نام سے صرف ایک عمارت ہے لیکن کوئی خاص اہم نہیں۔ سلطان شہید، ان کے والد اور عزیزوں کی قبریں بہت کچھ زبانِ حال سے کہتی ہیں جسے صرف گوشِ شنوا ہی سن سکتے ہیں۔

شمالی کرناٹک کو دیکھنے کے مجھے دو مواقع ملے۔ پہلی مرتبہ ممبئی میں حافظ سیمینار کے بعد

جب کرلا بنگلور اکسپریس سے میں پہلی مرتبہ بنگلور جارہا تھا تو راستے میں گلبرگہ پڑتا تھا۔ مرحوم طیب انصاری وہاں کے ایک ڈگری کالج کے استاد تھے اور گلبرگہ کے قریب ہی ایک مقام اُلند میں مدفون ایک بزرگ علاء الدین انصاری کے اخلاف میں تھے۔ اپنے لکھنؤ کے ہر سفر میں مجھے وہ گلبرگہ آنے کی دعوت دیتے تھے۔ ان سے ملنے کے خیال سے گلبرگہ میں میں نے سفر ختم کردیا۔ لیکن ٹرین سے اترنے کے بعد اسٹیشن سے ٹیلیفون پر معلوم ہوا کہ موصوف حیدرآباد گئے ہوئے ہیں۔ گلبرگہ ایک قدیم شہر ہے۔ بہمنی سلطنت کے بانی علاء الدین بہمن شاہ نے دولت آباد میں تخت نشینی کے بعد کچھ برسوں تک وہاں قیام کیا اس کے بعد گلبرگہ کو دارالحکومت بنالیا تھا اور بہمنی خاندان کے آٹھ سلطانوں کے عہد میں یہی شہر دکن کا دارالحکومت بنا رہا۔ اس خاندان کا آٹھواں بادشاہ تاج الدین فیروز شاہ (۱۴۲۲۔۱۳۹۷ء) زبردست عالم اور شاعر تھا اور عروضیؔ اور فیروزیؔ تخلص کرتا تھا۔ اس بادشاہ کو عربی، فارسی، ترکی، تیلگو، کناری، مراٹھی اور بنگالی زبانوں پر کامل عبور تھا۔ اس نے دولت آباد کے قریب ایک رصدگاہ بھی تعمیر کرانا چاہی تھی۔ وہ حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کے خلیفہ حضرت سید محمد گیسودراز (۱۴۲۲۔۱۳۳۱ء) کا ارادتمند تھا۔ ان بزرگ کے والد سید یوسف محمد تغلق کے عہد میں دولت آباد (دیوگری) آئے تھے اور وہ خود گلبرگہ منتقل ہوکر جامع مسجد کے قریب اقامت پذیر تھے۔ گلبرگے کے قریب ہی اُلند نامی قصبے میں ایک انصاری بزرگ علاء الدین اُلندی کی آرامگاہ بھی ایک اہم زیارت گاہ ہے لیکن میں وہاں نہ جاسکا اور حضرت سید محمد گیسودراز کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر دوسری گاڑی سے بنگلور روانہ ہوگیا۔ سید محمد گیسودراز کا ابتدائی اُردو ادب سے گہرا تعلق رہا ہے۔ شمالی کرناٹک کا میرا دوسرا سفر کئی سال کے بعد ہوا۔ میں اپنے خویش احمد شکیل ہاشمی کے ساتھ بذریعہ ٹرین جڑواں شہر ہُبلی۔ دھارواڑ گیا۔ یہ چھوٹا سا شہر ایک تنازعہ کی وجہ سے ہندوستان بھر میں مشہور ہوگیا ہے۔ وہاں کی عیدگاہ پر

جھنڈا لہرانے کے سوال کو فرقہ پرستوں نے مسئلہ بنا دیا۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے (خصوصاً مندروں پر) ہُبلی عیدگاہ پر بھی ایک جھنڈا لہراتا تھا۔ بی۔ جے۔ پی کے فرقہ پرستوں نے اس پر اعتراض کیا اور قومی جھنڈا لہرانے پر مصر ہوئے اور فضا میں کافی فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوگئی لیکن مسلمانوں نے سمجھداری سے کام لیا اور خود ہی وہاں قومی جھنڈا لہرادیا۔ اس سال (۲۰۰۶ء) میں بھی اما بھارتی نے وہاں فضا خراب کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئیں۔ اپنے اس سفر کے دوران مَیں یہ عیدگاہ دیکھنے گیا۔ یہ زمین کا تکونا متوسط سائز کا ٹکڑا ہے جس پر عید اور بقرعید کے موقعوں پر نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے۔ عام دنوں میں وہ کاروں کا اسٹینڈ بنا رہتا ہے۔ ہبلی سے ملحق دھارواڑ ہے جو اپنی یونیورسٹی کے لیے مشہور ہے۔ اس یونیورسٹی میں اُردو کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ ہبلی میں ایک روز ایک اچھے ہوٹل میں قیام کے بعد بذریعہ ٹیکسی ہم لوگ عادل شاہی حکومت کے دارالسلطنت بیجاپور کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ ایک طویل سفر تھا جس میں عظیم دریا کرشنا کو دو مرتبہ پار کرنا پڑا۔ یہ وہی دریا ہے جس سے آگے دریائے تنگ بھدرا ملتا ہے اور ان دونوں کے درمیان کا رائچور دوآبہ بہمنی اور وجے نگر سلطنتوں میں جھگڑے کا باعث بنا رہتا تھا۔ بیجاپور ہم لوگ شام کو پہنچے اور ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ دوسری صبح کو سب سے پہلے مشہور عالم گول گنبد کو دیکھنے پہنچ گئے۔ محمد عادل شاہ کا یہ مقبرہ جس کی تکمیل خود اس نے بیس سال میں کرائی تھی دُنیا کے عظیم الشان مقبروں میں سے ایک ہے اور بغیر کسی سہارے کے قائم اس کا عظیم گنبد انجنئرنگ کا شاہکار ہے۔ اس کا قطر (Diameter) ایک سو چوبیس فٹ ہے اور اس لحاظ سے وہ دُنیا کا دوسرا سب سے بڑا گنبد ہے۔ گنبد تک پہنچنے کے راستے چاروں مینار ہیں۔ گنبد کے اندر ایک گیلری ہے جس میں آواز کی بازگشت ایسی ہے کہ ایک طرف کی ہلکی سے ہلکی آواز دوسری طرف سنائی دیتی ہے۔ گنبد کے اندر ہر ہلکی سے ہلکی آواز کی کم از کم نو مرتبہ بازگشت ہوتی ہے۔ یہ

گیلری Whispering Gallery کے نام سے مشہور ہے۔ گنبد کی اس گیلری کے متعلق مشہو
رہے کہ عمارت مکمل ہونے کے بعد محمد عادل شاہ اپنی محبوبہ کے ساتھ وہاں گیا اور مذاقاً اس نے
محبوبہ سے کہا کہ کیا وہ اپنی محبت کے ثبوت میں اس نو منزلہ گہرائی میں نیچے کے ہال میں کود سکتی
ہے؟ محبوبہ نے اثبات میں جواب دیا اور فوراً کود کر مر گئی۔ اس کے بعد محمد عادل شاہ عمر بھر اس
کے فراق میں روتا رہا۔ گول گنبد کے بعد بیجاپور کی دوسری اہم عمارت وہاں کی جامع مسجد ہے
جسے علی عادل شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ بیجاپور کی فتح کے بعد اورنگ زیب نے اس مسجد میں
ترمیمیں اور اضافے کرائے۔ بیجاپور کا تیسرا انجینئرنگ شاہکار بارہ کمان ہے جہاں بارہ محرابیں
ایک ہی جگہ سے نکلتی ہیں۔ عادل شاہی محلوں کے کچھ حصّے آج بھی موجود ہیں اور سیاحوں کے
لیے کھلے ہوئے ہیں۔ شہر کے بالکل قریب ہی دنیا کی سب سے بڑی توپ بھی دیکھی جس کے
متعلق اب یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ اس کے چھونے کے بعد جو خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے وہ
پوری ہو جاتی ہے۔ اس توپ کی لمبائی چودہ فٹ اور وزن پچپن ٹن ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کا
مقبرہ ابراہیم روضہ بھی ایک خوبصورت عمارت ہے۔ ان کے علاوہ بھی بیجاپور میں ابھی بھی کچھ
خوبصورت عمارتیں ہیں جن میں مہتر محل، اثر محل، افضل خان کا مقبرہ وغیرہ شامل ہیں۔ شہر میں وہ
مقام بھی دیکھا جہاں آخری عادل شاہی بادشاہ نے قید کی زندگی کے آخری دن گزارے تھے۔
بیجاپور میں شہری آبادی سے باہر ایک ایسے مقام پر بھی ہم گئے تھے جہاں گولکنڈہ کے فتح دروازے
کی خصوصیت تھی۔ اس شاہی بارہ دری میں کھڑے ہو کر اگر تالی بجائی جائے تو بہت کافی فاصلہ پر
ایک دوسری عمارت میں جو شاہی زنانخانہ کہلاتی ہے اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

یہاں ایک بات اور تحریر کرنا چاہتا ہوں۔ دیگر باتوں کے علاوہ اورنگ زیب کو اس
بات کے لیے بھی مطعون کیا جاتا ہے کہ اس نے دکن کی ریاستوں کو اس لیے فتح کیا کہ ان کے

حکمران شیعہ تھے۔ بیجاپور کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں عجیب سلسلہ رہا ہے۔ اگر ایک بادشاہ شیعہ ہے تو اس کا جانشین سنی اور اس کا جانشین پھر شیعہ اور اسی طرح۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ آخری بادشاہ جو اورنگ زیب کا نشانہ بنا نہ صرف سنی تھا بلکہ سلسلہ قادریہ میں مرید بھی تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب شوقِ جہاں کشائی کا کرشمہ تھا۔ دکنی ریاستوں کی فتوحات اکبر کے دور سے شروع ہوتی ہیں۔ برار کی عماد شاہی حکومت عہد اکبری میں ختم ہوئی اور احمد نگر کی فتح کا سلسلہ بھی عہدِ اکبری سے شروع ہوتا ہے۔ خاندیش کی فاروقی خاندان کی حکومت بھی اکبری عہد میں مغل سلطنت میں ملائی گئی اور عبدالرحیم خانخانہ وہاں کے صوبیدار ہوئے۔ احمد نگر مکمل طور سے عہد شاہجہانی میں مغل سلطنت میں شامل ہوا۔ دکن کی چھ ریاستوں میں سے صرف دو بچ گئی تھیں جنہیں اورنگ زیب نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان دونوں حکومتوں کے آخری فرمانرواؤں کو صرف قید میں اسی طرح رکھا گیا جیسے شاہجہاں کو رکھا گیا تھا۔

میں نے ہندوستان کے کافی مقامات کی سیر کی اور اتنی جتنی شاید ہی ہمارے اساتذہ کے گروہ میں بشمول پروفیسر امیر حسن عابدی صاحب، کسی نے کی ہو لیکن پھر بھی اس عظیم ملک میں مَیں نے کیا دیکھا؟ کچھ بھی نہیں۔ تاریخ کا ایک پرانا واقعہ یاد آرہا ہے۔ یونان میں ڈلفی کے مقام پر سورج دیوتا اپالو کا مندر تھا جس کے کاہنوں کی زبان سے الہامی فیصلے سنے جاتے تھے اور سوالوں کے جواب ملتے تھے۔ پوچھا گیا کہ اس عہد کا سب سے عقلمند انسان کون ہے۔ جواب ملا سقراط۔ سقراط کو لوگ مبارکباد دینے پہنچے تو اس نے کہا کہ ایسا تو نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا کہ کیا مندر کا الہامی جواب غلط ہے؟ اس نے جواب میں کہا ایسا بھی نہیں۔ پوچھا گیا پھر کیا ہے۔ سقراط نے جواب دیا کہ میں کچھ نہیں جانتا لیکن اس حقیقت سے واقف ہوں کہ کچھ نہیں جانتا۔ دوسرے اتنا بھی نہیں جانتے۔ ایسا ہی کچھ میں بھی محسوس کرتا ہوں۔ میں نے ہندوستان کو بہت دیکھا پھر

بھی کچھ نہیں دیکھا۔ کشمیر سے بھوٹان تک پہاڑوں کا حال بیان کر چکا ہوں لیکن کیا میں نے شیلانگ دیکھا؟ جی نہیں۔ کیا میں نے مسوری اور گڑھوال کے دوسرے مقامات دیکھے؟ جی نہیں۔ کیا میں نے ہماچل پردیش میں شملہ، کلو اور کانگرہ کی وادیاں اور منالی میں مہا بھارت کے ہیرو بھیم کی راکششنی بیوی کا مندر دیکھا؟ جی نہیں۔ کیا میں نے جنوب میں پہاڑی تفریح گاہ اوٹی دیکھی؟ جی نہیں۔ کیا میں نے حیدر آباد سے ساحل سمندر سے ہوتے ہوئے کلکتہ جاتے ہوئے بھوبھانیشور اور پوری سے گزرنے کے باوجود وہاں کے مندروں کو دیکھا؟ جی نہیں۔ کیا میں نے اجنٹا اور ایلی فینٹا کے غار دیکھے؟ جی نہیں۔ کیا میں نے جبل پور کے قریب سنگ مرمر کی چٹانوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے نربدا کے خوبصورت مناظر کو دیکھا؟ جی نہیں، قطعی نہیں۔ کیا میں نے چتوڑ کے قلعہ اور فتح مینار کو دیکھا؟ جی نہیں۔ کیا میں نے جیسلمیر وغیرہ کی ریگستانی اور اروناچل کے بلند پلیٹو کی عظمت کا نظارہ کیا؟ جی نہیں۔ کیا میں نے کیرالا کے ناریل کے جھنڈوں کے مناظر دیکھے؟ قطعی نہیں۔ کیا میں نے بالکل جنوب میں معبر کی سلطنت کے کھنڈرات دیکھنے کی کوشش کی؟ جی نہیں۔ کیا بنگلور میں رہنے کے باوجود وجے نگر کے دارالحکومت ہمپی کے خرابہ کا مشاہدہ کیا؟ جی نہیں۔ کیا سلّی گوڑی میں رہتے ہوئے بنگال کے قدیم دارالحکومت گوڑ گیا؟ جی نہیں۔ کیا حیدر آباد اور مدراس جاتے وقت ورنگل سے گزرتے ہوئے عظیم کاکاتیہ سلطنت کے کھنڈرات کا پتہ لگانے کی کوشش کی؟ بالکل نہیں۔ کیا مغربی گھاٹ اور مشرقی گھاٹ اور وندھیاچل اور ست پڑھ پہاڑوں کے خوبصورت مناظر دیکھے؟ جی نہیں۔ کیا منی پور اور ناگا لینڈ کے قبائلی لوگوں کی زندگی کا مشاہدہ کیا؟ جی نہیں۔ ولی الحق صاحب، جب آپ نے یہ سب اور اس کے علاوہ بہت کچھ نہیں دیکھا تو آپ نے ہندوستان کو کیا دیکھا؟ آپ یہاں کی زیادہ تر زبانوں سے ناواقف، آپ یہاں کے مختلف مقامات کی تہذیبوں سے ناواقف، آپ یہاں بہت سی

جگہوں کی تاریخ سے ناواقف، آپ یہاں کے ہزاروں قدرتی مناظر سے ناواقف۔ حد یہ ہے کہ آپ نے گینگ ٹاک جانے کے باوجود یم تھانگ کی پھولوں کی وادی اور شمالی کمایوں تک جانے کے باوجود گڑھوال کی پھولوں کی وادی تک نہ دیکھی! پھر آپ کو جاہل اور بے خبر نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ لیکن آپ بھی تو مجبور ہیں۔ عشق بتاں نہ سہی، فکرِ معاش میں تو زندگی بھر گرفتار رہے۔ آپ کے دماغ میں ساحر لدھیانوی کا شعر ہمیشہ گونجتا رہا۔

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں، جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرّہ ہیرا ہے، اس وقت یہ قطرہ موتی ہے

اب بیاسی سال عمر کے آپ پورے کر چکے ہیں لیکن ہوس اب بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ جو نہیں دیکھا اسے دیکھنا چاہتے ہیں جو ناممکن ہے۔ پیر چلنے کے قابل اور آنکھیں دیکھنے کے لائق ہی کب ہیں؟ صبر کیجئے چھوٹا سا ہندوستان دیکھا نہیں اور وسیع دُنیا دیکھنے کی تمنّا ہے۔

تو کارِ زمین را نکو ساختی
کہ بر آسمان نیز پرداختی

سولھواں باب

جلوہ ھای ایران

"می نگریم و می رویم"

ہندوستان کو جنت نشاں کہا جاتا ہے اور درست بھی ہے۔ شمال و مغرب میں کشمیر اور شمال و مشرق میں شمالی بنگال اور سکم میں ایسے علاقے ہیں جن پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

اگر فردوس بر روی زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

میرے ایک عزیز جہانیان جہاں گشت رہ چکے ہیں اور سوئٹزرلینڈ کے مناظر سے بھی آشنا ہیں۔ میرے سلّی گوڑی کے قیام کے دوران وہ تشریف لائے تھے اور ہمارے ساتھ ہمالہ کی وادیوں میں تشریف لے گئے تھے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ جو مناظر ان کو وہاں دیکھنے کو ملے وہ سوئٹزرلینڈ میں نہیں ملے۔ ان کی یہ رائے اس وقت تھی جب انھوں نے خوبصورت ترین علاقہ یُم تھانگ دیکھا ہی نہ تھا جسے عرف عام میں پھولوں کی وادی کہا جاتا ہے۔ پہاڑوں پر جمی برف کے مناظر، بلندیوں سے گرتے ہوئے خوبصورت آبشار، شفاف پانی کے چشمے، صنوبر کے درختوں کے جنگل، کوہسار سے میدانوں میں تیز رفتاری سے آکر عظیم الشان بن جانے والے

دریا، لہلہاتے ہوئے ہرے کھیت، سمندر سے اٹھتی ہوئی لہریں الغرض قدرتی حسن کے جتنے بھی نمونے ممکن ہیں وہ سب اگر یکجا دیکھنا ہوں تو ہندوستان میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ پھر بھی سرزمین ایران کا اپنا حسن الگ ہے۔ وہاں کا زیادہ حصّہ بنجر، کویر یا پھر پہاڑی ہے، پھر بھی بحر اخضر (Caspian Sea) کا نواحی علاقہ سرسبزی میں شمالی ہند کی یاد دلاتا ہے اور بلندیوں سے پستیوں تک آنے والے چشمے ہمالہ سے نکلنے والے چشموں سے صفائی اور شفافی میں کم نہیں۔ وہاں نہ کوہِ ہمالہ ہے نہ دریائے گنگا لیکن کوہ وماوند اور دریائے کارون کچھ حد تک اس کمی کو پورا کرتے ہیں لیکن ان کے حسن کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے پہلے دل ودماغ کو ہندوستان کی یادوں سے پاک کرنا ہوگا۔ عرفی نے ہندوستان کے حسن ورونق سے لطف اٹھانے کے لیے اہلِ ایران سے کہا تھا کہ پہلے دل سے عراق کے حسن کو بھلا دو پھر ہندوستان کو دیکھو۔

تو از ملکِ عراقی، واژگون کن عادتِ پیشین
اگر خواہی کہ حسن و رونقِ ہندوستان بینی

اور میرا کہنا یہ ہے کہ:

نظر از جلوہ ہای ہند برتاب ار ولی خواہی
بہ ایران رفتہ حسنِ میہنِ ایرانیاں بینی

پہلی مرتبہ ایران جانے کا موقع مجھے ۱۹۷۶ء میں ملا جب کئی دیگر استادوں اور کچھ طالبعلموں کے ساتھ ساتھ بنیادِ فرہنگِ ایران کی طرف سے ہمیں ایران آنے کی دعوت دی گئی۔ صبح کے وقت مہر آباد ائیر پورٹ سے اترتے ہی گرد و غبار سے پاک صاف وشفّاف علاقہ نظر آیا اور ٹیکسی سے ہی ایک بلند و بالا پہاڑ دکھائی دیا۔ اس وقت تک میں جدید فارسی کے لہجے سے ناواقف تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا ''این کوہ چیست'' (کوہ واو مجہول کے ساتھ)۔

ڈرائیور سمجھا ہی نہیں۔ دو تین مرتبہ دہرانے پر کہنے لگا ''آ، کوہ'' (واوٴ معروف کے ساتھ)۔
الغرض خیابانِ وصالِ شیرازی پر پہنچ کر اپنے ہندوستانی ساتھیوں میں شامل ہو گیا (میں تنہا دو روز کے بعد تہران پہنچا تھا)۔ ناشتے کے بعد ہی بنیادِ فرہنگ ایران کے دفتر پہنچے۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر سعیدی سیر جانی سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر خانلری ایران کے اہلِ نظر حضرات میں سمجھے جاتے تھے۔ وہ ملکہ فرح دیبا کے استاد رہ چکے تھے جس کے نتیجہ میں انقلابِ اسلامی کے بعد ان کی جان تو بچ گئی لیکن ان کا کل اثاثہ ضبط کر لیا گیا۔ ڈاکٹر سعیدی اپنے نظریات میں بہت سخت تھے۔ نہ شاہی دور میں وہ اپنے کو بدل سکے اور نہ انقلاب کے بعد۔ انھیں زندان میں زندگی کے آخری دن کاٹنے پڑے اور ''خاکستر'' ہونے کے بعد ''زیر خاکستر'' ہو گئے۔ (یہ ان کے شعری مجموعوں کے نام ہیں)۔ ۱۹۹۴ء کے سفر میں میری ان کی آخری ملاقات ہوئی لیکن اس وقت وہ معتوب ہو چکے تھے۔ کسی طرح چھپتے چھپاتے مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں نے ایرانی شعراء سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ پرسوں اپنے یہاں شعری نشست رکھوں گا، وہاں سب سے مل لیجیے گا۔ تیسرے دن میں ان کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہ آئے۔ میں تقریباً ناامید ہو گیا تھا جب ان کی بہن بتول سعیدی تشریف لائیں۔ بہت پریشان نظر آ رہی تھیں۔ مجھ تک سعیدی صاحب کا پیغام پہنچایا کہ کچھ اسباب سے نشست ملتوی کرنا پڑ گئی۔ بتول سعیدی کی حالت سے اندازہ ہوا کہ غالباً سعیدی صاحب گرفتار کر لیے گئے تھے۔ کچھ ہی زمانے کے بعد ان کی وفات کی خبر ملی۔ میں نے یہ تاریخ کہی۔

بی سبب از جورِ چرخ ملزم و معتوب گشت — آنچہ نکرد او غلط، بر سرش الزام رفت
مردنِ او چون شنید، گفت ولیؔ ''ہای وای — حیف سعیدی ز دہر رفتہ و ناکام رفت''

اس سال یعنی ۲۰۰۶ء میں چند ماہ پہلے پروفیسر عبدالودود اظہر صاحب کے ساتھ دہلی

میں ان کی دختر اور داماد سے ملاقات ہوئی تھی۔ تمام گذشتہ صحبتیں یاد آ گئیں۔

بنیادِ فرہنگ ایران نے ہمیں ایران کو دیکھنے اور ایرانیوں کو سمجھنے کے لیے بلایا تھا۔ چنانچہ اپنے سہ ماہی قیام میں جس قدر ممکن تھا میں نے ایران کو دیکھا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ ناشتے کے بعد تہران یونیورسٹی چلا جاتا تھا اور دوپہر تک، جب تک یونیورسٹی بند نہ ہو جاتی تھی، کتابخانۂ مرکزی میں مطالعہ میں مصروف رہتا تھا۔ اس کتابخانے میں مجھے بعض بہت ہی نایاب قلمی نسخے دیکھنے کو ملے۔ سفینۂ خوشگو ہندوستان میں لکھا گیا لیکن اس کی دوسری جلد یہاں نہیں ہے۔ وہ مجھے تہران یونیورسٹی کے کتابخانے میں ملی اور ایک دوسرا نسخہ بھی ایران ہی کے ایک دوسرے کتابخانے، کتابخانۂ ملک، میں ملا۔ میں نے اس کی تدوین کرنا چاہی لیکن کام مکمل نہ کر سکا۔ بعد کو میں نے عزیزی کلیم اصغر نقوی کو جو ایران ہی میں تھے، اس کی تدوین کے لیے آمادہ کیا اور دوست گرامی ڈاکٹر غلام رضا ستودہ کو ان کی رہنمائی کے لیے راضی کر لیا۔ کلیم اصغر نے واقعی قابلِ ستائش کام کیا اور ڈاکٹریٹ حاصل کر لی۔ ایک دوسرا اہم نسخہ عبدالنبی فخرالزمانی، مولف تذکرۂ میخانہ، کا ایک دوسرا تذکرہ ''طراز الاخبار'' مجھے وہاں ملا۔ یہ میری دریافت تھی جس کا اس وقت تک ایران میں بھی کسی کو علم نہ تھا۔ نسخہ خود مصنّف کے قلم سے تحریر شدہ معلوم ہوتا تھا۔ کلیاتِ عرفؔی کے بھی دو انتہائی اہم نسخے ملے جن میں سے ایک وہ بھی تھا جس پر عبدالباقی نہاوندی کا نادر دیباچہ بھی تھا۔ اسی کتابخانے میں دیوان حافؔظ کا ایک نسخہ ملا جس کی کتابت عرفؔی شیرازی نے کی تھی۔ یونیورسٹی کے باہر نکلتے ہی خیابانِ شاہ رضا تھی، اب جس کا نام خیابان انقلاب ہے۔ اس پر زیادہ تر کتابوں کی دوکانیں ہیں۔ میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ یونیورسٹی بند ہونے کے بعد گردش کے لیے نکل جاتا تھا۔ پروفیسر شریف قاسمی جو اس وقت نوجوان اور دہلی یونیورسٹی میں تازہ وارد تھے، اکثر میرے ساتھ ہوتے تھے۔ ہم دونوں ''پائین شہر'' (قدیم شہر) کی طرف نکل جاتے تھے

اور راستوں کو دیکھتے ہوئے، لوگوں سے ملتے ملاتے، دوکانوں پر سودا خریدتے ہوئے میلوں قدیم شہر کی طرف چلے جاتے تھے۔ قدیم شہر میں ایک بہت بڑا مسقف بازار ہے جو بازارِ بزرگ کہلاتا ہے۔ دُنیا کی ہر چیز اس بازار میں ملتی ہے۔ اسی میں ایک اہم لائبریری، کتابخانۂ ملک بھی ہے۔ اس کتابخانے میں بھی میرا اچھا خاصہ وقت گزرتا تھا اور اسی میں مجھے سفینۂ خوشگو کا دوسرا نسخہ ملا تھا۔ وہاں ہی مجھے کلیاتِ عرفی کے چند قدیم ترین نسخے دیکھنے کو ملے۔ مولانا علی نقی صاحب مجتہد کے نوجوان فرزند مولانا علی محمد صاحب سے میری پہلی ملاقات اسی کتابخانے میں ہوئی۔ اس وقت تہران اتنا بڑا نہ تھا جتنا آج ہے۔ چنانچہ قدیم تہران کو پیدل چل کر دیکھنا ناممکنات میں نہ تھا۔ ایک مرتبہ یوں ہی گشت لگاتے ہوئے خیابانِ وصالِ شیرازی سے ہم لوگ (میں اور قاسمی) ریلوے اسٹیشن تک پہنچ گئے جس کا لوگوں کو یقین نہ آ رہا تھا۔ ہماری اقامت گاہ خیابانِ وصالِ شیرازی شہر کے وسط میں تھی۔ شمال کی طرف صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر تہران کی سب سے اہم شاہراہ بُلوارِ الزبیتھ تھی اور اس کے شمال میں ایک خوبصورت باغ تھا جو باغِ ولی عہد کے نام سے موسوم تھا۔ اس کے اور شمال میں ہوٹل لالہ تھا جس میں ۱۹۹۹ء کے آخری سفر میں مَیں ٹھہرا تھا۔ اس کے اور آگے شمیران اور تجریش کا علاقہ تھا اور وہیں لغت نامۂ دہخدا کا دفتر تھا۔ بعد کو کچھ نئی یونیورسٹیاں دانشگاہ تربیت مدرس وغیرہ بھی اس علاقے میں بن گئیں۔ اسی کے قریب تہران کا سب سے بڑا ہوٹل Continental تھا جس میں اس سفر کے دوران خطّاطی کی ایک نمایش دیکھنے کو ملی۔ انقلاب کے بعد یہ ''ہوٹل آزادی'' ہوگیا۔ ایک سفر کے دوران اس ہوٹل میں بھی مجھے قیام کرنے کا موقع ملا۔ وہاں کا ایک واقعہ دلچسپ ہے۔ ہم لوگ گیارہویں منزل کے کمروں میں مقیم تھے۔ لفٹ سے میں، ڈاکٹر اسلم خان مرحوم اور پروفیسر امیر حسن عابدی نیچے آ رہے تھے کہ لفٹ خراب ہوگئی اور ہم لوگ بیچ میں معلّق ہوگئے۔ سخت سردی میں بھی ہم لوگوں کو

پسینہ آرہا تھا۔ پروفیسر عابدی صاحب پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ بے تحاشہ لفٹ کا دروازہ پیٹ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے لفٹ ٹھیک ہوئی اور ہم لوگ نیچے اترے۔ اسی شمالی علاقے میں ایک محلّہ نادری ہے۔ لکھنؤ کے میرے ایک خُرد حیدر طباطبائی کا وہیں قیام تھا۔ وہ ہندوستان سے غلط طریقہ سے ایران پہنچے تھے اور پوشیدہ طور سے رہ رہے تھے۔ میں ان کا پتہ لگاتا ہوا ان تک پہنچ گیا اور اس کے بعد حیدر جہاں تک ممکن ہوسکتا تھا میرے ساتھ رہتے تھے۔ ایران کے مذہبی حلقوں تک ان کی رسائی تھی اور انھیں کے ساتھ مجھے چند بہت اہم مجتہدوں سے ملنے کا موقع ملا۔ اس وقت ایران میں ایک عام سوال تھا۔ ''آغا شما مسلمان ہستید''؟ اگر ''بلی'' کہہ دیا تو دوسرا سوال ہوتا تھا ''آغا شما سنّی ہستید یا شیعہ''؟۔ اگر سنّی کہہ دیا تو عموماً منہ بنا کر منھ پھیر لیا جاتا تھا لیکن شائستہ لوگوں کا جواب ہوتا تھا۔ ''اشکال ندارد''۔ حیدر نے مجھے بہت سمجھایا تھا کہ ولی بھائی یہاں خود کو سنّی نہ کہیے گا لیکن میں نہ مانتا تھا اور حیدر کو لیپا پوتی کرنا پڑتی تھی۔ ''آقا حنفی ہستند۔ برای زیارتِ امامِ رضا تشریف آوردہ اند''۔ ایک مرتبہ میں اور حیدر ساتھ جا رہے تھے۔ ایک شخص سامنے جا رہا تھا۔ حیدر نے کہا ''ولی بھائی یہ سنّی ہے'' میں نے پوچھا تم نے کیسے جانا۔ کہا پٹکا باندھے ہوئے ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ کُرد ہے اور کُرد سنّی ہوتے ہیں۔ حیدر نے کہا ابھی پوچھتا ہوں۔ ہم دونوں تیز قدم بڑھا کر اس کے برابر پہنچے اور حیدر نے سوال کیا ''آغا شما سنّی ہستید؟'' اس نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ ہم دونوں نے پھر تیز قدم بڑھائے اور اس کے برابر پہنچ کر پھر حیدر نے وہی سوال کیا، ساتھ ہی یہ بھی کہا ''آغا ما ہندی ہستیم و سنّی ہستیم''۔ اس وقت اس نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ حیدر کے ساتھ گھومنے میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ہم دونوں ایک فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے۔ ایک ایرانی نوجوان ہم سے آگے جا رہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک مرتبہ وہ سڑک پار کر کے دوسری طرف فٹ

پاتھ پر چلا گیا لیکن تقریباً ایک فرلانگ جانے کے بعد پھر پہلے فٹ پاتھ پر واپس آ گیا۔ میں نے حیدر سے پوچھا کہ اس نے یہ کیوں کیا۔ حیدر نے بتایا کہ جس فٹ پاتھ پر ہم چل رہے تھے اس پر ایک سرکاری دفتر تھا اور وہ نوجوان اس کے سامنے سے جانا نہ چاہتا تھا۔ میں نے حیدر سے سبب پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ ساواک کا ڈر تھا۔ (ساواک شاہ کے زمانہ کا خفیہ ادارہ تھا)۔ اس سفرِ ایران میں حیدر اکثر میرے ساتھ رہتے تھے اور ان کے ساتھ بہت سے دوسرے ہندوستانیوں سے ملاقات ہوئی جن میں ایک زیدی صاحب بھی تھے۔ حیدر بہت مخلص انسان ہیں لیکن سخت جذباتی۔ اگر خوش ہیں تو بچھے جاتے ہیں اور اگر خفا ہو گئے تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔ دہلی کے ایک صاحب ڈاکٹر حکیم الدین قریشی دہلوی اس وقت تہران میں تھے۔ انقلاب کے بعد انھیں تہران چھوڑنا پڑا اور دہلی کے ان کے ساتھیوں شریف حسین قاسمی اور ڈاکٹر یوسف وغیرہ نے بتایا کہ ان کے معتوب ہونے میں حیدر طباطبائی کا ہاتھ تھا جو علماء سے قریب ہونے کی وجہ سے انقلاب کے بعد کافی اہم شخصیت ہو گئے تھے۔ حیدر نے ایران ہی میں شادی کر لی تھی اور اب انگلینڈ میں مقیم ہیں اور ایک اُردو رسالہ نکالتے ہیں۔ قاسمی صاحب کے ساتھ دہلی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل شمیم احمد قریشی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور صحبتیں رہیں۔ ہندوستانی سفارت خانے میں کام کرتے تھے اور انتہائی مخلص اور اچھے دوست تھے۔ برادر مکرم علی جواد زیدی صاحب مرحوم بھی اس زمانے میں تہران ہی میں مقیم تھے۔ اس وقت تک میں بڑے بھائی کی طرح ان کا احترام کرتا تھا لیکن بعد کو وہ میرے بے تکلف دوست ہو گئے تھے۔ ان کی وجہ سے تہران میں شعر و سخن کی محفلیں جما کرتی تھیں اور ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کا ایک اچھا خاصہ ادبی حلقہ وجود میں آ گیا تھا جس میں مجھے بھی شرکت کے مواقع ملا کرتے تھے۔ تہران یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں برابر جانے کے مواقع ملتے رہے۔ پروفیسر اسماعیل حاکمی، پروفیسر شفیعی کدکنی، پروفیسر جلیل

تجلیلی وغیرہ سے نہ صرف تعارف ہوا بلکہ دوستانہ تعلقات بھی قائم ہوئے۔ پروفیسر حاکمی ڈائری لکھتے تھے جس میں اہم اشخاص کی وفات کے سنہ بھی نوٹ کرلیا کرتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بہت سے حضرات کی تاریخیں کہلوائیں۔ حاکمی صاحب بعد کو کئی مرتبہ ہندوستان بھی آئے اور انتہائی گرمجوشی سے ملے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ میری ڈی۔لٹ کے مقالے کے ممتحن استاد حسین بحرالعلومی اور استاد غلام رضا ستودہ صاحبان تھے۔ میں ان سے ملنے کا بیحد مشتاق تھا لیکن تہران پہنچ کر معلوم ہوا کہ استاد بحرالعلومی کا انتقال ہوگیا اور استاد ستودہ لغت نامۂ دہخدا میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہوگئے ہیں۔ ان سے ملاقات کا شوق مجھے لغت نامے کے دفتر تجریش لے گیا۔ واقعی مردِ ستودہ صفات نظر آئے۔ واقعی انتہائی خوش مذاق، خوش اطوار، خوش خو، ہیں یعنی پورے طور سے ستودہ۔ بعد کو استاد الاساتذہ ڈاکٹر شہیدی لغت نامے کے ڈائرکٹر ہوگئے تھے اور اب بھی ہیں۔ انتہائی پڑھے لکھے اور مولانا روم کے عاشق ہیں۔ انقلابِ اسلامی کے بعد تہران میں کئی دوسری یونیورسٹیاں کھل گئیں۔ یونیورسٹی شہید بہشتی کے استاد ڈاکٹر مصطفوی ایران کلچرل ہاؤس میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے تشریف لائے تھے اور یہاں ہی میری ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ تہران کے آئندہ سفروں کے دوران ان سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔ حاکمی صاحب کی طرح وہ بھی مجھ سے تاریخیں کہلواتے رہے۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی تاریخِ وفات کے علاوہ اپنے ایک دوست اور یونیورسٹی کے ساتھی ڈاکٹر محمود طباطبائی اردکانی کی تاریخیں بھی انہوں نے مجھ سے کہلوائیں۔ مصطفوی صاحب کا متعدد بار کلچرل ہاؤس دہلی میں تقرر ہوا۔ اس کے بعد وہ پاکستان میں کلچرل کونسلر ہوگئے اور اب تہران واپس جاچکے ہیں۔ عمر کی برابری ان سے ذہنی قربت کا ایک اور سبب ہے۔ تہران میں مصطفوی صاحب کی پرتکلف دعوتیں بھلائی نہیں جاسکتیں۔ (۷؍ مارچ ۲۰۰۷ء کو علی گڑھ کے بین الاقوامی سیمینار میں مصطفوی

صاحب سے ایک مرتبہ پھر چند گھنٹوں کی ملاقات ہوگئی)۔ڈاکٹر اکبر ثبوت فلسفہ کے استاد تھے اور بحیثیت ڈائرکٹر تحقیقات ایران کلچرل ہاؤس میں مقرر تھے۔فرنگی محل سے، جو کبھی اسلامی فلسفہ کی تعلیم کے لیے دنیا بھر میں مشہور تھا، خوب واقف تھے۔ مجھ سے مدرسۂ نظامیہ کے متعلق پوچھا کرتے تھے۔ انھیں کیا بتاتا کہ اب اس کی عمارت ایک درزی خانہ میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ہندوستان سے واپس جانے کے بعد وہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں بحیثیت معاون مقرر ہوئے تھے جہاں ڈاکٹر حدّاد عادل اس وقت ڈائرکٹر تھے۔ اپنے ۱۹۹۹ء کے ایران کے آخری سفر میں جمعرات کے روز جب بدمعاشوں نے میرے ڈالر مجھ سے حاصل کر لیے تھے، رات کے کھانے پر میں ان کے یہاں مدعو تھا۔اس وقت ڈاکٹر کریمیان نے مجھے اطلاع دی تھی کہ بدمعاشوں کا پتہ چل گیا ہے اور رقم دوسرے روز مل جانے کی امید ہے۔شہید بہشتی یونیورسٹی کے ایک دوسرے پروفیسر سجادی صاحب بھی بحیثیت استاد ایک مہینے کے لیے ایران کلچرل ہاؤس تشریف لائے تھے اور یہاں ہی میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بعد کو بہت اچھے دوست ثابت ہوئے۔ڈاکٹر حدّاد عادل کا میری فارسی شعر گوئی میں بڑا دخل ہے۔جس سال پرشین ٹیچرز کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی تو وہ اور کچھ دوسرے ایرانی اہلِ علم بشمول پروفیسر غلام رضا ستودہ کانفرنس میں حصّہ لینے کے لیے تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر نورالحسن انصاری مرحوم نے مجھ سے کچھ شعر پڑھوائے جن کی ڈاکٹر حدّاد عادل نے بہت تعریف کی اور وہیں سے مجھے فارسی شعر گوئی میں خود اعتمادی حاصل ہوئی اور میں نے پہلا فارسی مجموعہ شعلۂ ادراک شایع کیا۔انقلاب کے بعد حدّاد عادل کو بہت عروج حاصل ہوا اور آج وہ ایرانی پارلیمنٹ ''مجلس'' کے اسپیکر اور علی خامنہ ای صاحب کے سمدھی ہیں۔میرے عزیز دوست ڈاکٹر کریمیان دس پندرہ سال پہلے ایران کلچرل ہاؤس میں رایزنِ فرہنگی (Cultural Councellor) تھے اور یہاں ہی ان سے میری

ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور بعد کو یہ ملاقاتیں بے تکلفی میں بدل گئیں۔ ایران کے ہر سفر میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ۱۹۹۹ء کے آخری سفر کے دوران جمعرات کے روز ہوٹل لالہ سے ان کے دفتر جو قریب ہی تھا میں ان سے ملنے جارہا تھا جب رقم چھینے جانے کا واقعہ پیش آیا۔ اس کا بھی تھوڑا ذکر کرتا چلوں تو مناسب ہے۔ ۱۹۹۹ء میں جب پندرہ روز کے لیے میں تہران گیا تو پروفیسر ستودہ نے کلیات عرفی کے حقِ تصنیف کی رقم دلوادی تھی جسے میں نے دوست عزیز عبدالقادر ہاشمی کے توسط سے ڈالروں میں تبدیل کرالیا تھا۔ یہ تمام ڈالر میری بغیر قفل کی اٹیچی میں پڑے ہوئے تھے۔ میرے ہندوستان واپسی کے دو دن قبل کچھ ہندوستانی طلباء بشمول کلیم اصغر نقوی مجھے رخصت کرنے آئے اور ڈالروں کو یوں پڑا دیکھ کر حیران ہوئے۔ وہ لوگ سوئی تاگا لائے اور انھیں میرے اس کوٹ کی جیب میں جسے میں پہن کر دو دن کے بعد ہندوستان آنے والا تھا سی دیا، میں دوسرے روز جمعرات کو علی الصباح وہی کوٹ پہنے ڈاکٹر کریمیان کو خدا حافظ کہنے کے لیے خیابانِ حسینِ فاطمی کے سرے پر ان کے دفتر جانے کے لیے ہوٹل سے نکلا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک کار رکی۔ دو لوگ ایک خاص وردی پہنے اتر کر میرے پاس آئے۔ میں سمجھا کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کچھ اس طرح سوال کرنا شروع کیے گویا وہ محکمۂ خفیہ کے اراکین ہیں۔ میرا پاسپورٹ طلب کیا اور پوچھا کہ تمہارے پاس رقم کتنی ہے اور کہاں ہے۔ میں نے بتادیا۔ انھوں نے سلی ہوئی کوٹ کو کھلوا کر وہ سب رقم دیکھی۔ میرے کوٹ میں ڈالروں کے علاوہ ہندوستانی کرنسی اور ایرانی ریال کی ایک گڈی بھی تھی۔ دیکھنے کے بعد پاسپورٹ اور رقم کی گڈیاں معذرت کے ساتھ مجھے واپس کردیں۔ جب تک میں کرنسی کے بنڈلوں کو دیکھوں ان کی گاڑی روانہ ہوگئی۔ دیکھا تو پتہ چلا کہ ڈالر اور ہندوستانی روپیہ غائب تھا۔ میں کریمیان صاحب کے دفتر جانے کے بجائے ہوٹل لالہ واپس آ گیا۔ وہاں میرے ایک

ایرانی دوست پروفیسر توفیق سبحانی میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ان سے پورا واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے فوراً ہوٹل کے منیجر کو اطلاع دی اور آدھ گھنٹے کے اندر پولیس میرا بیان لینے کے لیے آ گئی۔ اسی درمیان میں مَیں نے ستودہ صاحب کو بھی اس واقعہ کی اطلاع کر دی تھی۔ تب انھوں نے بتایا کہ اسی سبب سے وہ مجھے بازار میں تنہا نہیں جانے دیتے تھے اور ہمیشہ میرے ساتھ ہو لیتے تھے۔ انھوں نے فوراً وزارتِ فرہنگ کو اطلاع دی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس وزارتِ فرہنگ سے بھی تحقیقاتی ٹیم آ گئی۔ مجھے ہندوستانی پولیس کے تجربے تھے۔ میں سمجھا یہ سب رسمی کارروائی ہے۔ رقم ملنے کا کیا سوال۔ رات کو ثبوت صاحب کی دعوت میں ڈاکٹر کریمیان جن سے ملنے میں جارہا تھا وہ بھی تشریف لائے۔ جب ان کو اس واقعہ کا علم ہوا تو بغیر کسی گفتگو کے انھوں نے ٹیلی فون اٹھایا اور کسی سے گفتگو کرنے لگے (موصوف وزارت ہی کے ہم مرتبہ کسی عہدے پر فائز تھے)۔ ٹیلی فون رکھنے کے بعد مجھ سے بولے کہ بدمعاشوں کا پتہ چل گیا ہے۔ کل تک آپ کو آپ کی رقم واپس مل جائے گی لیکن جمعہ کی تعطیل کی وجہ سے اگر نہ مل سکی تو ہندوستان میں آپ تک پہنچ جائے گی۔ اسے بھی میں طفل تسلّی سمجھتا رہا۔ دوسرے روز یعنی جمعہ کو میری روانگی تک رقم نہ مل سکی۔ ہندوستان واپسی کے کئی مہینہ کے بعد جب میں سب کچھ بھول چکا تھا ایران کلچرل ہاؤس سے میرے بینک اور اکاؤنٹ نمبر کو پوچھا گیا تا کہ رقم میرے حساب میں جمع کر دی جائے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ واقعی وہ بدمعاشوں سے وصول کر لی گئی تھی یا ایرانی حکومت نے اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لیے خود ادا کر دی تھی۔

تہران میں ایرانی علماء کے ملاقات کے سلسلے میں تقی جعفری صاحب کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ شاہی زمانے میں وہ بازار بزرگ کی ایک مسجد میں مثنوی معنوی کا درس دیتے تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات دہلی میں بوعلی سینا کے انٹرنیشنل سیمینار میں ہوئی تھی۔

انقلاب کے بعد ان سے ان کے عالی شان مکان میں دوبارہ ملاقات ہوئی۔ مثنوی معنوی پر ان کی حیثیت سند کی تھی اور مثنوی پر دُنیا کی کسی زبان میں کوئی بھی کتاب لکھی گئی ہو ان کے کتابخانے میں موجود تھی۔ موصوف تمام رات مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ مختلف موقعوں پر قیام کے دوران جن ہندوستانی حضرات کا میرا مستقل ساتھ رہا ان میں عبدالقادر ہاشمی صاحب جو آج بھی تہران میں مقیم ہیں اور ڈاکٹر حسن عباس جو اب بنارس یونیورسٹی میں فارسی کے استاد ہیں، پیش پیش تھے۔ عبدالقادر صاحب دہلی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں اور سنا ہے کہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی بننے کے وقت وہاں ان کا تقرر بھی ہو گیا تھا لیکن انھوں نے ایران کو ہندوستان پر فوقیت دی اور ایران چلے گئے۔ انھوں نے وہیں شادی کی اور وہیں کے مستقل باشندے ہو گئے۔ تہران ریڈیو پر پہلے کام کرتے تھے لیکن بعد کو ملازمت چھوڑ دی اور ترجمہ کا کام کرنے لگے۔ بہت ہی مخلص آدمی ہیں اور ان کی بیگم ان سے زیادہ مہمان نواز ہیں۔ ڈاکٹر حسن عباس سے میرا غائبانہ تعارف طاہر جرولی صاحب نے کروایا تھا۔ وہ گوپال پور صوبۂ بہار کے رہنے والے ہیں۔ تہران حصول علم کے لیے گئے تھے اور وہاں ہی سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کی۔ بہار یونیورسٹی مظفر پور سے اردو میں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور جنوبی بہار میں عرصے تک اُردو کے استاد رہے۔ چند سال قبل بنارس یونیورسٹی میں ان کا بحیثیت فارسی لکچرر تقرر ہو گیا اور اب سینئر لکچرر ہیں۔ تہران میں حیدر طباطبائی کے بعد جو ہندوستانی میرے سب سے زیادہ قریب رہے اور ہر ممکن مدد کرتے رہے ان میں یہ دونوں حضرات سب سے پیش پیش تھے۔ اس وقت فارسی ادبیات پر جو لوگ کام کر رہے ہیں ان میں رٹائرمنٹ کی منزل پر پہنچنے والوں میں صرف شریف حسین قاسمی ہیں اور کم عمر والوں میں صرف حسن عباس ہیں۔ نوجوانوں میں کلیم اصغر نقوی سے اچھی امید قائم کی جا سکتی ہیں۔ حسن عباس کا غلام علی آزاد بلگرامی پر تحقیقی

مقالہ حال ہی میں تہران سے شائع ہو گیا ہے اور کلیم اصغر کے درست کیے ہوئے سفینۂ خوشگو کی دوسری جِلد امید ہے کہ جَلد ہی ایران سے شائع ہو جائے گی۔ ان کے علاوہ کام کرنے والے جواں سال اسکالروں میں ڈاکٹر علیم اشرف خان سے بھی بہت امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ ان کا تحقیقی مقالہ بھی حال ہی میں ایران سے شائع ہوا ہے۔

تہران مَیں بہت مرتبہ گیا، انقلاب سے پہلے بھی اور انقلاب کے بعد بھی اور بعض مواقع پر دعوت ملنے کے باوجود کچھ ذاتی اسباب سے نہ بھی جاسکا۔ تہران کی گلی کوچوں کا نقشہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اگر بالائے شہر بالکل جدید شہر ہے تو پائینِ شہر ایک قدیم شہر ہے جو اسلامی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ شاہی دور میں محمد رضا شاہ اور ان کے والد نے ایران کی مادّی ترقی کے لیے بہت کچھ کیا لیکن یہ لوگ مغرب سے ضرورت سے زیادہ مرعوب تھے۔ انھیں اپنی تہذیب میں صرف خامیاں اور مغربی تہذیب میں صرف خوبیاں نظر آئیں۔ انھوں نے زبردستی ایران کو مغربی طرز میں ڈھالنے کی کوشش کی اور یہی بات ان کے زوال کا باعث بنی۔ قاچاری دور میں امیر کبیر کے قائم کردہ دارالفنون اور ۱۹۳۴ء میں رضا شاہ کی قائم کردہ تہران یونیورسٹی نے نوجوانوں کی ایسی نسل پیدا کر دی جو ایرانی قومی دولت کو دوسروں کے پاس جاتے ہوئے دیکھنا پسند نہ کرتے تھے اور ایران کی تیل کی دولت میں ایرانیوں کا زیادہ حصّہ چاہتے تھے۔ اسی تحریک کے تحت ڈاکٹر مصدّق ایران کے وزیر اعظم بنے۔ باہری اثرات کی وجہ سے محمد رضا شاہ اس پالیسی کو قبول نہ کر سکے اور انھیں ایران چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور امریکیوں کی مدد سے وہ واپس آئے اور ۱۹/اگست ۱۹۵۴ء سے مطلق العنان شہنشاہ ہو گئے۔ ڈاکٹر مصدّق کو عمر قید کی اور ان کے قریبی ساتھی ڈاکٹر حسین فاطمی کو سزائے موت ملی۔ ایرانی عوام جو شاہ کی حد سے بڑھی ہوئی مغربیت اور امریکہ نوازی سے غیر مطمئن تھے، اپنے لیڈروں کی سزاؤں اور

امریکی سہارے سے قائم شدہ مطلق العنانی سے اور زیادہ ناراض ہوگئے اور شاہ کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آئی۔ امریکیوں اور یہودیوں کی مدد سے خفیہ ایجنسی ساواک وجود میں آئی جس کے مظالم نے حالات اور بگاڑ دیے۔ عوام اور زیادہ شاہ سے متنفر ہوگئے اور ایک معاندانہ دائرہ (Vicious Circle) چل پڑا۔ شاہ جتنی زیادہ اپنی حفاظت کے سلسلے میں امریکہ کے دست نگر ہوتے گئے، عوام اتنے ہی زیادہ اُن سے متنفر ہوتے گئے اور شاہ کے ساتھ ساتھ امریکہ بھی شیطانِ بزرگ بن گیا۔ اس شیطنت کے نمونے وہ سنیما تھے جہاں فحش فلمیں دکھائی جاتی تھیں اور شہر نو تھا جو حکومت کی طرف سے قائم کردہ قحبہ خانہ تھا اور وہ شراب خانے تھے جو ہر چار قدم پر ملتے تھے۔ یہ سب کچھ امریکہ کی مدد اور مشورے سے ایرانی نوجوان نسل کو اخلاقی طور سے برباد کرنے کے لیے کیا جارہا تھا۔ امریکیوں کی خوشامد حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ ۱۹۷۶ء کے سفر میں واپسی کے چند روز پہلے خبر آئی کہ دو امریکیوں کو قتل کر دیا گیا اور دو دن کے بعد ہی دوسری خبر آئی کہ ''دو دہشت پسندوں'' کو گولی ماردی گئی۔ (دو تا تیرورست نابود شدند)۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ نابود ہونے والے واقعی ''تیرورست'' تھے بھی یا نہیں یا صرف امریکی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے دو بے گناہوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ یہی وہ حالات تھے جنھوں نے انقلابِ اسلامی کی بنیاد رکھی۔

اپنے پہلے سفر کے دوران ملکہ فرح دیبا سے ملنے کا موقع ملا۔ شہنشاہ بیمار ہو چکا تھا اور ملکہ فرح دیبا ہی باہر والوں سے ملنے کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ ملکہ سے ہماری یہ ملاقات کاخِ سعد آباد میں ہوئی تھی۔ شاہ خواہ کچھ بھی ہوں، ملکہ مجھے ایک شریف خاتون نظر آئیں۔ جدید فارسی زبان کے سلسلے میں ان سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ تہران کی زبان بہت غلط ہے لیکن کیا کیا جائے اب وہی رائج الوقت زبان ہے۔ (ایران میں زبان کو زبوں کر دیا

گیا) اور وہی صحیح تلفظ ہے جو تہران میں کیا جاتا ہے۔ ملکہ سے ملاقات ہی کے دوران پہلی مرتبہ وزیر اعظم ہویدا بھی نظر آئے۔ سیدھے سادے انسان چھڑی ٹیکتے چلے جا رہے تھے۔ انقلاب کے بعد ہویدا کو بھی سزائے موت دے دی گئی لیکن بعد کو ہویدا کے بھائی نے اپنی کتاب میں ہویدا کے موت کا ذمہ دار شاہ کو قرار دیا تھا۔ ہویدا سے وزارتِ فرہنگ کے دیئے ہوئے ایک ڈنر میں باقاعدہ ملاقات ہوئی تھی۔

تہران میں میری دلچسپی کا سب سے بڑے مراکز شاندار کتابخانے تھے۔ تہران یونیورسٹی کے مرکزی کتابخانے کا کچھ ذکر کر چکا ہوں۔ یہ انتہائی نادر قلمی نسخوں کا ایک خزانہ ہے۔ پروفیسر جلیل تجلیلی ایک زمانے میں اس کے کتابدار تھے۔ کتابخانۂ ملک کا بھی کچھ ذکر ہو چکا ہے۔ بازار بزرگ کا یہ کتابخانہ کتابوں کا ایک شاندار مخزن ہے۔ اس کا انتظام اب مشہد کے کتابخانۂ آستانۂ قدس کے تحت ہے۔ ایک تیسرا کتابخانہ، کتابخانۂ سپہ سالار ہے۔ اس سے بھی میں نے بہت کچھ فیض اٹھایا اور اس میں بھی بہت سے نادر قلمی نسخے ملے۔ کتابخانۂ ملّی ایران کی سرکاری نیشنل لائبریری ہے۔ دیگر کتابوں کے علاوہ وہاں قرآن مجید کے ایسے نادر نسخے دیکھے کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسے ہی نسخوں میں ایک وہ بھی ہے جسے ایک قاچار شاہزادی نے لکھا ہے اور ایک دوسرا نسخہ مشہور شاعر وصالِ شیرازی کا مرقومہ ہے۔ اسی کتابخانے میں مجھے کلیاتِ عرفی کے ان نادر نسخوں میں سے ایک ملا جس پر عبدالباقی نہاوندی کا دیباچہ ہے۔ ایران میں اس قسم کا یہ تیسرا نسخہ ہے جسے میں نے استعمال کیا ہے۔ یہ کتابخانہ واقعی فارسی خطّی نسخوں کا خزانہ ہے۔ کتابخانۂ کاخِ گلستاں بھی ایک اہم کتابخانہ ہے جو کسی زمانہ میں بادشاہ کی ذاتی ملکیت تھا۔ مجھے کچھ خاص بندشوں کی وجہ سے اس کتابخانے کو دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ کتابخانۂ مجلس ایرانی پارلمنٹ کا کتابخانہ ہے۔ انتہائی اہم خطّی نسخے اس میں محفوظ ہیں۔ کتابخانۂ مجلسِ سنا ایرانی پارلیمنٹ کے

ایوان بالا کا کتابخانہ ہے۔ اسے بھی میں نے اچھی طرح دیکھا۔ یہاں کلیاتِ عرفیؔ کا ایک ایسا نسخہ دیکھنے کو ملا جس کے متعلق مہدی بیانی نے لکھا ہے کہ خود عرفیؔ کے قلم سے تحریر ہوا۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں جو اصلاحات ہیں وہ عرفیؔ کے قلم سے ہوں۔

تہران کی تفریح گاہوں میں تالار فردوسی اور بانک ملّی کے تحت موزۂ جواہرات قابلِ ذکر ہیں۔ دونوں شاہی دور کی یادگاریں ہیں۔ تالارِ فردوسی ایک بڑا ہال ہے جس میں ثقافتی پروگرام ہوا کرتے ہیں جن میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔ موزۂ جواہرات ایک ایسا میوزیم تھا جس میں محفوظ جواہرات کی قیمت لگائی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ ملکہ اور شاہ کے جشنِ تاجپوشی کے جواہرات سے مزیّن لباس وہاں محفوظ تھے۔ جواہرات سے آراستہ شاہی تاج بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ کبوتر کے انڈوں سے بڑے لعل اور پکھراج آنکھوں کو خیرہ کرتے تھے۔ حفاظت کے سخت ترین انتظام تھے اور کسی بھی شوکیس سے ذرا بھی لمس سے پورے میوزیم میں گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ شاہی کے خاتمہ کے بعد یہ میوزیم نظر نہ آیا۔ ممکن ہے کہ شاہ ایران چھوڑتے وقت انھیں ساتھ لے گئے ہوں اور اب وہ امریکیوں کے قبضہ میں ہوں۔ شاہی کے خاتمے کے بعد قالینوں کا ایک میوزیم تیار ہوا تھا جس میں شاہی محلوں میں بچھے ہوئے قالین محفوظ تھے۔ بعد کے سفروں میں مجھے وہ بھی نہ ملا۔

انقلاب کے بعد ایران بالکل بدل گیا۔ ہوٹلوں کے کمروں میں شراب کی بوتلوں کے بجائے مصلّے، سجدہ گاہیں اور قرآنِ مجید کے نسخے ملنے لگے۔ بسوں میں عورتوں اور مردوں کے حصّے الگ الگ ہو گئے۔ عورتوں کے لیے چادر یا لمبے کوٹ اور سر کے اسکارف لازمی ہو گئے۔ وہ سنیما ہال ختم ہو گئے جہاں فحش فلمیں دکھائی جاتی تھیں اور انقلاب کے ابتدائی دنوں میں خبر آئی کہ ایک شراب خانہ لوٹا جا رہا تھا اور اس کا مالک ہنس رہا تھا۔ ہنسنے کا سبب پوچھا گیا تو جواب ملا کہ

مذہب کے نام پر توڑ پھوڑ مچانے والے وہی لوگ ہیں جو کل تک وہاں پینے جاتے تھے۔ خمینی صاحب نے مسلکی اختلافات مٹانے پر زور دیا تھا۔ اسی زمانے میں جامعہ ملیہ میں پرشین ٹیچرس کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ ایرانی شرکاء کے ساتھ ایک مذہبی عالم بھی تشریف لائے تھے۔ جمعہ کے روز انھوں نے تمام ایرانیوں کو حکم دیا تھا کہ سنیوں کے ساتھ سنّی پیش امام کی اقتدا میں نماز پڑھیں۔ انقلاب کے بعد ایک فرق یہ بھی میں نے محسوس کیا کہ ''آغا شما مسلمان ہستید؟'' ''آغا شما سنّی ہستید یا شیعہ''؟ ایسے سوالوں کے پوچھے جانے میں نمایاں کمی آ گئی تھی۔ انقلاب کے بعد تعلیمی معیار بھی بڑھا۔ پہلے تہران میں صرف ایک یونیورسٹی تھی اور بعد کو چار پانچ ہوگئیں۔ کئی موقعوں پر مجھے ظہر کی نماز شیعہ حضرات کے ساتھ پڑھنا پڑی۔ جماعت میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے پر نہ کسی نے توجہ دی اور نہ کسی کو اعتراض ہوا۔ نماز بالکل اسی طرح پڑھی گئی جس طرح یہاں سنّی پڑھتے ہیں۔ اذان بھی محض اذان ہوتی تھی۔ لکھنؤ کی مسجدوں کی طرح اس میں اختراعات نہ تھیں۔ میں لکھ چکا ہوں کہ اپنے پہلے سفر میں حیدر طباطبائی مجھے اکثر شیعہ مجتہدین سے ملانے لے گئے۔ ایک صاحب کا تعلق کربلا سے تھا اور وہ ایران میں بحیثیت پناہ گزین رہ رہے تھے۔ مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔ انھوں نے اندازہ کرلیا کہ میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ خود ہی بولے یہاں ہی پڑھ لیجئے۔ ''عیسیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود''۔ انقلاب کے بعد مذہبی تشدّد اور مسلکی منافرت میں کمی ہوئی لیکن مسلمانوں کو صرف مسلمان کہلوانے پر زور دیئے جانے کے باوجود اہلِ سنّت کی حالت درست کرنے پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ ان کے علاقے آج بھی ویسے ہی پس ماندہ ہیں جیسے پہلے تھے اور آج بھی حکومت کے کسی اعلیٰ عہدے پر کوئی سنّی فائز نظر نہیں آتا، اگرچہ ایران میں، بقول ایک سنّی امامِ جمعہ کے، ان کی تعداد پندرہ بیس فیصدی ہے اور وہ ایران کی چاروں طرف کی سرحدوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک انتہائی معتبر

ذریعہ سے یہ بات بھی میرے علم میں لائی گئی کہ تہران یونیورسٹی میں کُرد سنّی طالبعلموں کے داخلے ان کی صلاحیت کے باوجود ان کی مرضی کے مطابق نہیں کیے جاتے۔ خدا معلوم یہ بات صحیح ہے یا غلط۔ اپنے سفروں کے دوران ایک مرتبہ تہران کے انتہائی شمال میں شمیران میں دامنِ کوہ میں امام خمینی کی قیام گاہ پر بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ ایک عام زیارت گاہ ہے اور میری موجودگی ہی میں پاکستان اور بوسینیا کے لوگ بھی وہاں آئے تھے۔ خمینی صاحب کا مقبرہ تہران کے انتہائی جنوب میں قبرستان ''باغِ زہرا'' سے کچھ فاصلے پر ہے۔ انتہائی شاندار مقبرہ ہے جس کے گنبد اور میناروں پر سونا منڈھا ہوا ہے۔ وہ ایک عام زیارت گاہ ہے اور برسی کے موقع پر دُنیا بھر سے لوگ وہاں آتے ہیں۔

اپنے ایک سفر کے دوران (غالباً ۱۹۹۲ء یا ۱۹۹۴ء میں) میرے ساتھ ہندوستانی اساتذہ کی پوری ٹیم تھی جس میں زیادہ تر نوجوان تھے۔ ان لوگوں کو دانش گاہ تربیت معلم میں باز آموزی کے لیے بلایا گیا تھا اور دو تین سینیر اساتذہ کو بھی بحث و گفتگو کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ ہم لوگوں کا قیام پائینِ شہر یعنی جنوبی تہران میں تھا۔ جہاں سے بازارِ بزرگ کافی قریب تھا۔ گردش کے دوران تہران ریلوے اسٹیشن کے قریب ہمیں ایک ایسے ریسٹورنٹ میں لے جایا گیا تھا جسے عہد صفوی کے قہوہ خانوں کے انداز میں درست کیا گیا تھا۔ ہال میں کرسی میزوں کے بجائے تخت بچھے تھے جس پر چار چار آدمی بیٹھتے تھے۔ اس کے پیچھے ہال میں تختوں کی قطار تھی جس پر دیگر سامان کے علاوہ مگدر کی جوڑیاں بھی رکھی تھیں۔ اس قطار کے پیچھے زمین کا فرش لگا ہوا تھا جس پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ وہیں بٹھائے گئے۔ قدیم ایرانی غذاؤں سے ہماری خاطر کی گئی۔ پیشِ خدمتوں (Bearers) کا لباس بھی قدیم تھا یعنی قمیص، شلوار اور کمر میں پٹکا۔ کھانے کے بعد ایک نوجوان بیرے صاحب نے کافی بھاری مگدر ہلانے کا مظاہرہ کیا اور ہم

مہمانوں کو بھی دعوت دی۔ کئی نوجوان اٹھے لیکن ایک مگدر بھی نہ اٹھا سکے۔ مجھے غیرت آئی۔ اٹھا اور کچھ ہاتھ مگدر کے ہلا دئے۔ بیرا مجھے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس وقت میری عمر ستر سال سے متجاوز تھی۔ آج سوچتا ہوں کہ میں نے کیا غلطی کی تھی۔ مجھے انجائنا کا مریض بتایا جاتا رہا تھا۔ اگر واقعی ویسا ہوتا تو ہارٹ اٹیک یقینی تھا لیکن ایسا نہ ہوا اور تب مجھے خیال آیا کہ میں برسوں سے ڈاکٹروں کا شکار بنا رہا ہوں۔ میں دل کا مریض قطعاً نہیں۔ ایک بات اور لکھ دوں۔ مگدر ہلانے کے لیے صرف طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ایک فن ہے جسے جانے بغیر مگدر نہیں ہلائے جاسکتے۔ اپنے ورزشی عہد کے دوران مگدر ہلانا میرا ایک محبوب مشغلہ تھا جس کا مظاہرہ مجھے اس موقع پر بھی کرنا پڑا۔ ہوٹل کے باہر آ کر واپسی کی بس کا انتظار کر رہا تھا کہ دو ایرانی فٹ پاتھ پر مجھ سے پوچھنے لگے کہ کتنا Payment کیا۔ میں نے بتا دیا کہ حکومت کا مہمان ہوں Payment حکومت نے کیا ہوگا۔ دونوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں جس کا مفہوم یہ تھا کہ ہم ایرانی مہنگائی سے پریشان ہیں اور حکومت اس طرح بے دریغ خرچ کر رہی ہے۔ اس گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ہوٹل انتہائی مہنگا تھا اور صرف باہر والوں کے لیے قائم کیا گیا تھا تا کہ وہ ایرانِ قدیم کی تہذیب کی جھلکیاں دیکھ سکیں۔ پائینِ شہر (قدیم تہران) کی جس عمارت میں ہمارا قیام تھا اس کے تہہ خانے میں نماز کا انتظام تھا۔ شیعہ اور سنی سب ہی ایک دوسرے کی موجودگی میں نماز پڑھتے تھے اور کسی کو کسی پر اعتراض نہ ہوتا تھا۔ ۱۹۷۶ء کے پہلے سفر کے دوران حیدر طبا طبائی مجھے مجلسوں میں بھی لے گئے۔ ایرانی مجلسیں صاف ستھری ذکرِ شہادت پر مشتمل ہوتی تھیں لیکن جب ہندوستانیوں کی ایک مجلس میں حیدر صاحب لے گئے تو انداز وہی تھا جس کی وجہ سے خواہش کے باوجود ہم لکھنؤ میں مجلسوں میں نہیں جاتے۔ ایران میں مجھے ہر موسم میں اور ہر مہینے میں رہنے کا موقع ملا۔ ۱۹۷۶ء کے سفر کے دوران رمضان کا مہینہ آ گیا۔ ڈاکٹر شعیب اعظمی کی

اقتدا میں ہم شیعہ حضرات سے کچھ پہلے روزہ کھول لیتے تھے۔ ہماری دیکھ بھال کے لیے مقرر آغا سپہری سخت پریشان اور متعجب ہوتے تھے کہ یہ لوگ دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور وقت سے پہلے اسے توڑ ڈالتے ہیں۔ دو موقعوں پر ہمیں ایران میں محرّم کی عزاداری دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ (ڈاکٹر حسن عباس اس وقت تہران ہی میں تھے)۔ ہندوستان اور لکھنؤ کے برخلاف یوم عاشورہ کے پہلے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ماہِ محرّم ہے۔ دن کو حسبِ معمول زندگی کے کاروبار چلتے رہتے تھے اور شام کو بعدِ مغرب مجلسوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ جس مکان میں مجلس ہوتی تھی اس کے سامنے تعزیے کے قسم کی ایک چیز رکھ دی جاتی تھی جو اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ شب کو وہاں مجلس ہے۔ عزاداری کا میں صرف ایک جلوس دانش گاہِ تہران میں دیکھ سکا۔ لکھنؤ ہی کی طرح عزاداروں کا ایک گروہ علم لیے ہوئے ماتم کرتا ہوا گزرا۔ میں اور پروفیسر جلیل تجلیلی عمارت کے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ جلیل صاحب باوجود مذہبی ہونے کے اس مجمع سے بے نیاز رہے۔ ایک دوسرے سفر کے موقع پر میں نے اخبارات اور ریڈیو سے یہ اعلان ہوتے سنا کہ عزاداری کے دوران کوئی غیر سنجیدہ حرکت یا تماشہ نہ کیا جائے اور قمع اور اسی قسم کی غیر شرعی باتوں پر سختی سے پابندی لگا دی گئی۔ ہندوستان واپس آکر سنا کہ ایک مجتہد صاحب نے ایرانی علماء کے اس فیصلے پر سخت احتجاج کیا تھا۔

مجھے ایران کے ہر سفر کے دوران اندازہ ہوتا تھا کہ اقتصادی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں ایک تومان (یعنی سوا ایرانی ریال) کی **Exchange Value** سوا روپیہ تھی لیکن بعد کو معاملہ بالکل اُلٹ گیا۔ ایک روپیہ کی قیمت پندرہ بیس تومان ہوگئی اور آج وہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۹ء میں میں ریال کے نوٹوں کی ایک بہت بڑی گڈی لے کر بازار گیا اور بچّوں کے چند کپڑے خریدنے ہی میں وہ ختم ہوگئی۔ میں حساب بھی نہ کر سکا کہ مجھے

کس چیز کی کتنی قیمت دینا پڑی۔

اپنے ۱۹۷۶ء کے سفر کے دوران تہران شہر کے باہر ایک عمارت دیکھی تھی جس کا نام آرامگاہ بتایا گیا تھا یعنی رضا شاہ پہلوی کا مقبرہ۔ انقلاب کے بعد وہ نظر نہ آیا۔ بتایا گیا کہ انقلاب کے ایک انتہا پسند لیڈر آیت اللہ خلخالی نے جو اپنی سفّا کی کے لیے مشہور تھے، اس مقبرہ کو ختم کر کے اس کی جگہ ٹوائلٹ بنوا دیے تھے۔ یہ وہی خلخالی صاحب تھے جو کرد لیڈروں سے گفتگو کرنے گئے تھے اور انھیں گولی مار کر چلے آئے تھے اور غالباً وہی نقاب پوش جج تھے جن کے حکم سے ہویدا، نصیری وغیرہ کو گولی ماری گئی تھی۔ ان کی انتہا پسندی اور سفا کی ہی ان کے زوال کا باعث بنی۔

تہران کے مضافات میں رَے کا قدیم شہر ہے جہاں کسی زمانے میں طبیبِ حاذق زکریا رازی اور معروف فلسفی فخر رازی وغیرہ پیدا ہوئے تھے۔ اب یہ شہر محض ایک قصبہ ہے۔ قاچار عہد کی کچھ نشانیاں یہاں اب بھی موجود ہیں۔ عبدالعظیم کوئی بزرگ تھے جن کا مقبرہ ایک عام زیارت گاہ ہے۔ اسی کے پہلو میں فتح علی شاہ قاچار کی بلند قبر ہے جس پر ان کا اسٹیچو لیٹا ہوا ہے۔

ایران کے سفروں کے دوران کبھی کبھی ادبی جلسوں میں بھی شرکت کے مواقع ملے۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء میں داستانِ کوتاہ پر ایک مباحثہ میں شریک ہوا تھا۔ بعد کے سفروں میں متعدد موقعوں پر تہران اور مشہد میں شعری نشستوں میں حصّہ لینے اور شعر خوانی کے مواقع ملے۔ ۱۹۹۹ء کی ایک ایسی ہی نشست میں تاجیک شاعرہ گل رخسار سے بھی ملاقات ہوئی۔ شعر فارسی زبان میں کہتی ہیں لیکن لکھتی ہیں روسی رسم الخط میں۔ آج کل گل رخسار **Writers Union Of Tajikistan** کی ایک بہت ہی اہم رُکن ہیں۔ اس وقت جب میں اپنی سوانح حیات پر نظرِ ثانی کر رہا ہوں تو مجھے عبدالقادر نیازوف بھی یاد آرہے ہیں۔ وہ تاجیکستان کی ایک اہم شخصیت ہیں اور **Writers`**

Union Of Tajikistan کے صدر رہ چکے ہیں اور سنا ہے کہ آج کل صدرِ تاجیکستان کے ثقافتی مشیر ہیں۔ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ ان سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی لیکن بعد کو ایک مرتبہ جب وہ ہندوستان آئے تو لکھنؤ میں ایک روز کے لیے میرے مہمان ہوئے تھے۔ تاجیکی زبان افغانستان کی دری سے مختلف نہیں ہے لیکن تاجیکستان میں رسم الخط فارسی سے روسی کر دیا گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رسم الخط کی تبدیلی کے بعد تاجیک اہلِ ادب باقی دنیا کے فارسی ادب سے کس طرح تعلق رکھ سکتے ہیں۔ ایسی ہی ایک نشست میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو خود کو استاد شہریار کا شاگرد بتاتے تھے۔ میں نے اندازہ کیا کہ انقلاب کے بعد فارسی شاعری زوال پذیر ہوگئی۔ شعراب بھی کہا جا رہا ہے لیکن دورۂ مشروطیت اور اس کے بعد کے عہد کی شاعری کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ چند مہینے قبل چودہ چنیدہ ایرانی شاعر ہندوستان آئے تھے اور ایران ہاؤس میں میری صدارت میں اردو اور فارسی، دونوں زبانوں کا ملا جلا مشاعرہ ہوا تھا۔ ان میں سے کوئی ایرانی شاعر مجھے متاثر نہ کر سکا۔

تہران سے ڈھائی گھنٹہ ڈرائیو کر کے تہران سے جنوب کی طرف تقریباً ۱۴۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر چھوٹے سے شہر قُم پہنچ جاتے ہیں۔ جسے دنیای شیعت میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ فقہ جعفری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دنیا بھر سے طالبعلم یہاں آتے ہیں اور مختلف مدرسوں میں تعلیم حاصل کر کے درجۂ اجتہاد کو پہنچتے ہیں۔ مدرسوں کے علاوہ قم میں ایک علمی خزانہ کتابخانۂ مرعشی ہے جو آیت اللہ مرعشی کا ذاتی کتابخانہ تھا لیکن اب وہ ایران سرکار کے زیر انتظام آ گیا ہے۔ کتابخانے میں سیکڑوں بیش بہا خطی نسخے ہیں۔ قلمی کتابوں کو محفوظ اور درست حالت میں رکھنے کی جدید ترین آسانیاں اس کتابخانے میں موجود ہیں۔ مدرسوں اور اس کتابخانے کے علاوہ معصومہ کا روضہ بھی قم کی کشش کا باعث ہے۔ ان محترمہ کے متعلق روایت ہے کہ وہ حضرت

امام علی رضا کی ہمشیرہ تھیں اور بھائی سے ملنے کے لیے جا رہی تھیں کہ قم میں ان کا انتقال ہوا۔ (شیراز میں حضرت علاء الدین اور ان کے ایک بھائی کے مقبرے ہیں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی حضرت امام علی رضا کے بھائی تھے)۔ یہ روضہ آئینہ سازی کے ذریعہ آرائش کا ایک لا جواب نمونہ ہے۔ ایسی ہی آرائش میں نے ایران کے متعدد مقبروں میں دیکھی لیکن ایران کے باہر اس کے نمونے نظر نہ آئے۔ جب جب میں قم گیا میرا کوئی نہ کوئی ہندوستانی شاگرد مجھے مل گیا۔ ۱۹۹۹ء کے آخری سفر تہران کے دوران بھی وہاں میرے چار شاگرد تھے جو خاص طور سے مجھ سے ملنے تہران بھی آئے تھے۔ معروف مجتہد اور لکھنؤ کے خاندان اجتہاد کے چشم و چراغ مولانا کلب جواد بھی اس زمانے میں وہاں مصروف تعلیم تھے۔ قم کی مٹھائی سوہن پورے ایران میں مشہور ہے۔ وہ تقریباً وہی ہے جو ہمارے لکھنؤ میں حلوہ سوہن کہلاتی ہے۔

اصفہان شاہ عباس صفوی اور اس کے جانشینوں کا دارالحکومت تھا اور اس زمانے میں اپنی رونق کی وجہ سے نصف جہان کہلاتا تھا۔ وسطی ایران کا یہ شہر دریائے زائندہ رَود پر آباد ہے اور دریا اسے دو حصّوں پر تقسیم کرتا ہے۔ اصفہان یونیورسٹی دریا کے داہنے کنارے پر ہے اور شہر بائیں جانب۔ ۱۹۷۶ء کے سفر میں ہم لوگ یونیورسٹی کے علاقے میں ٹھہرے تھے۔ یونیورسٹی میں کچھ بہت ہی اچھے لوگوں سے ملاقات ہوئی جس میں ایک صوبۂ بہار کے رہنے والے ہندوستانی ڈاکٹر نصیر الدین اصفہان یونیورسٹی میں ریاضی کے استاد تھے۔ اسی طرح لکھنؤ کے ایک صاحبزادے کرمانی بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے اور انھوں نے وہیں شادی بھی کر لی تھی۔ سنا ہے کہ بعد کو وہ ایران چھوڑ کر امریکہ چلے گئے۔ یونیورسٹی کے بہت سے استادوں نے ہماری ضیافتیں کیں۔ لیکن ہم نے ایک نمایاں فرق دیکھا۔ ایرانیوں کا معیارِ زندگی بہت بلند ہوتا تھا اور ہندوستانیوں کا ان کے مقابلے میں کافی پست۔ اگرچہ تنخواہیں دونوں کی برابر تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ

ایرانی پروفیسر جو کچھ پاتا تھا خرچ کر ڈالتا تھا۔ اسے مستقبل کی بھی فکر نہ ہوتی تھی اس لیے کہ استاد کی آخری تنخواہ ہی بازنشستگی کے بعد اس کی پنشن ہو جاتی تھی۔ ہندوستانی تھوڑے عرصے کے لیے جاتے تھے اور زیادہ سے زیادہ پیسہ بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ عام مسلمانوں کی طرح ایرانی بھی Mathematics اور Economics سے بھاگتے ہیں۔ چنانچہ اصفہان یونیورسٹی، شیراز یونیورسٹی اور کچھ دوسری یونیورسٹیوں میں ہر جگہ Mathematics Departments میں ہندوستانی اساتذہ موجود تھے۔ جن ہندوستانی پروفیسر کا میں نے ذکر کیا ہے وہ بھی Mathematics کے استاد تھے۔ ایرانی یونیورسٹیوں میں ایک طریقہ اور تھا۔ اس وقت لکچرر کی تنخواہ آٹھ ہزار تومان ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وائس چانسلر کو اختیار ہوتا تھا کہ جس استاد کو چاہے چھ ہزار تومان ماہوار مزید دیے جانے کی منظوری دے دے۔ ایرانی استادوں کو یہ دوہری تنخواہ ملتی تھی اور ہندوستانیوں کو صرف بنیادی تنخواہ۔ اس کا توڑ یوں کیا جاتا تھا کہ کسی دوسری یونیورسٹی سے پروانۂ تقرری (Appointment Letter) حاصل کر لیا جاتا تھا اور ملازمت ترک کرنے کی دھمکی دی جاتی تھی اور تنخواہ بڑھ جاتی تھی۔ اہواز سخت گرم علاقہ ہے اور وہاں کی یونیورسٹی میں ایرانی جانا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے وہاں تنخواہ بہت زیادہ تھی (غالباً پندرہ ہزار تومان ماہانہ)۔ مذکورہ ہندوستانی استاد ناصر الدین وہاں سے پروانۂ تقرری حاصل کر رہے تھے تا کہ اصفہان یونیورسٹی انھیں مزید چھ ہزار تومان دینے لگے۔ اصفہان یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے علاوہ ایک اور عہدہ دار (غالباً ڈپٹی رجسٹرار) سے بھی ملاقات ہوئی۔ موصوف شاعر تھے۔ اپنے شعر سناتے رہے اور اپنی ایک غزل کا فوٹو کرا کے مجھے عنایت کیا تھا۔ یہ ۱۹۷۶ء کا واقعہ ہے۔ کافی عرصے کے بعد (غالباً ۱۹۹۴ء میں) جب میں مشہد سے نیشا پور پہونچا تو معلوم ہوا کہ ایک شاعر کینسر میں مبتلا ہیں اور اسپتال میں داخل ہیں۔ میں اپنے ایک ساتھی (غالباً پروفیسر

عبدالودود اظہر) کے ساتھ ان شاعر کی عیادت کے لیے اسپتال پہنچا۔ دیکھا کہ وہ وہی صاحب تھے جن سے اٹھارہ سال پہلے اصفہان یونیورسٹی میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اس بیماری کے عالم میں بھی ہمیں پہچان گئے اور اپنی بیگم سے اپنی ایک کتاب بطور تحفہ ہمیں دینے کو کہا۔ کچھ دیر بیٹھ کر ہم چلے آئے لیکن ان کی حالت ایسی نہ تھی کہ امید کی جاتی کہ وہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے زیادہ زندہ رہے ہوں گے۔

زائندہ رَود کا ایک پل پار کر کے یونیورسٹی سے شہر اصفہان آیا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں گومتی کے رتیلے کنارے کو اب پارکوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ زائندہ رود کے دونوں کناروں کی زمین کو سبزہ زار بنا کر فٹ بال کی فیلڈوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ زائندہ رود چوڑا لیکن اتھلا دریا ہے جو ریگستان میں جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی سطح پر پانی کے پودے اگے نظر آئے۔ ایرانی پانی کا بہت شوقین ہے لیکن ایران میں پانی کی کمی ہے۔ ہر تعطیل کے روز لوگ قالین لے کر گاڑیوں میں نکل جاتے ہیں اور جہاں کہیں کوئی بہت معمولی ندی بھی ہوتی ہے تو اس کے کنارے قالین بچھا کر پکنک (Picnic) مناتے ہیں۔ (تہران میں پہاڑوں سے بہنے والے پانی کو سڑکوں کے کنارے نالیوں کی شکل میں پائینِ شہر تک پہنچایا جاتا ہے اور یہی نالیوں میں تیز رفتار سے بہتا ہوا پانی عوام کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہے)۔ ان حالات میں زائندہ رود کا ایسا دریا اہلِ اصفہان کے لیے ایک نعمت ہے۔ قدیم شہر مجھے بالکل لکھنؤ کی طرح لگا۔ ویسے ہی گلی کوچے، ویسے ہی مکان اور ویسے ہی لوگ۔ اندازہ ہوا کہ لکھنوی تہذیب کی بنیاد اصفہان کی تہذیب ہے۔ میں اصفہان میں تنہا ہی گردش کے لیے نکل جایا کرتا تھا۔ ایک روز گلی کوچوں کے درمیان مینارِ چہل دختران کے قریب گھوم رہا تھا۔ پیاس لگی اور میں نے ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ایک صاحب باہر تشریف لائے میں نے پانی کی درخواست کی۔ نہایت اخلاق کے ساتھ اثبات

میں سر ہلاتے ہوئے اندر چلے گئے۔ کافی دیر ہو گئی لیکن پانی لے کر تشریف نہ لائے۔ میں جانے ہی والا تھا کہ پانی لیے ہوئے نکلے اور انتہائی معذرت کے ساتھ بولے کہ فریج (Refigirator) خراب ہو گیا تھا اس لیے دوسرے گھر سے پانی منگوانے میں دیر ہو گئی۔ اس علاقے میں بھی گلی کوچوں میں بچے اسی طرح کھیلتے نظر آئے جیسے میرے لکھنؤ میں۔ مجھے خارجی (غیر ملکی) سمجھ کر ہر ایک اپنے گھر لے جانے کا خواہشمند تھا۔ اصفہان میں قطب مینار کی طرح، لیکن اس سے چھوٹے اور کم خوبصورت دو بہت ہی قدیم مینار ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ جس زمانے میں قطب مینار بنا اس وقت مینار کی شکل میں یادگاریں بنانے کا رواج تھا۔ دہلی میں قطب مینار اور اس کی برابر علائی مینار کا نامکمل حصہ، افغانستان میں مینارِ جام اور اصفہان میں مینارِ چہل دختران اور مینار ساربان غالباً ایک ہی عہد کی یادگار ہیں۔ چنگیزی مغل دور میں یہ یادگاریں کلہ میناروں کی شکل میں بننے لگیں۔ یعنی سروں کو کاٹ کر دفن کر کے ان پر مینار بناتے تھے۔ اصفہان میں احمد آباد کی دو مسجدوں کی طرح ایک مسجد نظر آئی جس کے میناروں کو اگر ہلایا جاتا تھا تو وہ ہلنے لگتے تھے۔ اس کی تعمیر ۱۳۱۶ء میں ہوئی تھی لیکن اس مسجد کے مینار احمد آباد (ہند) کی مسجدوں کے میناروں کے مقابلے میں بہت چھوٹے ہیں۔ اصفہان کی دیکھنے کے لائق عمارتوں میں آرمینیائی عیسائیوں کا ایک قدیم جلفا چرچ ہے جو ۱۶۰۵ء میں تعمیر ہوا تھا۔ صفوی دور میں ان عیسائیوں کی کافی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اس گرجے میں ایک بال کے اوپر مسالہ لگا کر اس پر انجیل لکھی گئی ہے جو ایک عجوبہ ہے لیکن ہمارے ہندوستانی خطّاطوں نے چاول کے دانوں پر آیاتِ قرآنی لکھی ہیں۔ یہاں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ یونیورسٹی سے شہر میں آنے کے لیے پل پار کرتے ہی ایک بڑا جنرل اسٹور تھا جس کے مالک ایک ہندوستانی سکھ تھے۔ تہران میں بھی کافی سکھ موجود ہیں اور ان کا ایک گرودوارہ بھی ہے جو مسجد ہندواں کہلاتا ہے۔ ہندوستان کے

گردواروں کی طرح اس تہرانی گردوارے میں بھی مفت لنگر بٹتا ہے۔ ایک زمانے میں میرا ایک شاگرد سریندر سنگھ ایرانی تھا۔ وہ ایک ایسے ہی سکھ خاندان کا فرد تھا جو ایرانی ہو چکا تھا۔ اصفہان میں صائبؔ تبریزی کی قبر کی زیارت کا موقع ملا لیکن وہ کنواں نہ مل سکا جس میں کمال اسماعیل کو مغلوں نے پھینک دیا تھا۔ اصفہان کی قدیم جامع مسجد غالباً دنیا کی قدیم ترین مسجدوں میں سے ایک ہے۔ اور اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے عہد کی یادگار ہے۔ اس میں تیمور کے عہد تک ترمیمیں ہوتی رہیں چنانچہ ۲۲۶ھ میں عباسی خلیفہ نے اسے نئے سرے سے بنوایا اور ۱۰۵۰ء میں عہدِ سلجوقی میں اس کی مرمت ہوئی۔ مسجد کے مشرقی پھاٹک سے داخل ہونے کے بعد بائیں طرف ایک خرابہ ہے جس کے متعلق معلوم ہوا کہ کسی زمانے میں آتش کدہ تھا۔ مغربی اصل ہالوں کے علاوہ شمالی اور جنوبی رخ میں بھی عام مسجدوں کے حجروں کے بجائے جن میں اکثر مدرسے ہوتے ہیں، چھوٹے ہال ہیں اور مسجد کے تینوں جانب بیک وقت نماز جماعت ہو سکتی تھی۔ مسجد کے اصل گنبد کے نیچے عربوں، ترکوں، مغلوں، ایرانیوں اور افغانوں تک کے کتبے ہیں اور مسجد کے گنبد کا نچلا حصّہ چمکدار ٹائلوں سے مزّین ہے۔ بڑی محراب کے کنارے ۳۵ میٹر اونچے مینار ہیں۔ مسجد کا صحن کافی وسیع ہے۔ اصل مسجد کے گوشے میں عہدِ طہماسپ کے ایک شیعہ عالم کی قبر ہے۔ جہاں تک یادداشت کام کر رہی ہے، یہ قبر شیخ بہائی کی ہے۔ یہ قدیم مسجدِ جامع ایک عالی شان لیکن زیب و آرائش سے عاری ایک عمارت ہے۔ اصفہان کی اصل رونق شاہ عباس کی مرہون منّت ہے۔ اس بادشاہ کے زمانے کی بنی ہوئی عمارتیں ایک چوکور حصار میں جو میدانِ شاہ کہلاتا ہے اب تک موجود ہیں۔ یہی شہر کا قدیم بازار بھی ہے جہاں اصفہان کی مختلف قسم کی دستکاریوں کے نمونے ملتے ہیں۔ یہاں ہمارے ساتھ ایک لطیفہ پیش آیا۔ میں اور شریف حسین قاسمی صاحب اس بازار میں گھوم رہے تھے۔ ہم

دونوں نے ایک دوکان سے تانبے کی ایک ایک منقش پلیٹ خریدی۔ ایک دوسری دوکان پر بھی ویسی ہی پلیٹیں دیکھیں۔ دام پوچھے جو دوکاندار نے زیادہ بتائے۔ ہم لوگوں نے جس قیمت پر انھیں خریدا تھا وہ بتادی۔ دوکاندار نے کہا کہ وہ انھیں دو تومان زیادہ پر خریدنے کو تیار ہے۔ ہم نے پلیٹیں فوراً اسے دے دیں۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اسی حصار کے کونے پر ۱۶۳۰ء کی تعمیر شدہ مسجدِ شاہ (یا مسجدِ امام) واقع ہے۔ اصفہان میں چمکدار رنگین ٹائلس ایک خاص فنکاری ہے اور اس کا بہترین نمونہ یہ مسجد ہے۔ مسجد مکمل طور سے اندر اور باہر خوبصورت ٹائلوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اسی حصار میں اس مسجد کی مخالف سمت ایک دوسری چھوٹی مسجدِ شیخ لطف اللہ ہے جو ٹائلس کے علاوہ نقاشی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کی تعمیر ۱۸-۱۶۰۳ء میں ہوئی تھی۔ اسی میدانِ شاہ میں شش منزلہ شاہی محل علی قاپو بھی ہے جس میں لکڑی پر مصوّری کے بہترین نمونے آج تک محفوظ ہیں۔ قدیم جامع مسجد کے قریب ایک دوسرا محل چہل ستون بھی ہے۔ جسے عباس ثانی نے بنوایا تھا۔ زائندہ رود کا قدیم پل جس کا ذکر کر چکا ہوں خود ایک عمارت سازی کا شاہکار ہے۔ اس دریا پر دو قدیم پل ہیں پل الہ وردی اور پل خواجو۔ اصفہان کے سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ روانگی سے ایک روز قبل جب ہم لوگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملنے گئے تو باتوں باتوں میں میری اکنامکس کی پوسٹ گریجویٹ ڈگری کا ذکر آ گیا۔ وائس چانسلر صاحب نے دریافت کیا کہ کیا میں اصفہان یونیورسٹی میں بحیثیت اکنامکس استاد کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے بات کو غیر سنجیدہ سمجھتے ہوئے جواب دیدیا کہ ممکن ہے میں ایسی پیش کش کو قبول کرلوں۔ اصفہان سے شیراز جانے کے بعد جب ہم تہران واپس آئے تو معلوم ہوا کہ اصفہان یونیورسٹی سے ٹیلی فون آیا تھا کہ میں آکر نوکری کے شرائط طے کرلوں۔ ٹیلی فون آئے ہوئے کئی روز ہو چکے تھے۔ میں سمجھا کہ بات ختم ہوگئی ہوگی۔ دو تین روز کے بعد

ہم لوگ مشہد چلے گئے۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ اصفہان یونیورسٹی سے کوئی صاحب خاص طور سے مجھ سے بات چیت کے لیے بھیجے گئے تھے اور مجھے نہ پا کر ناامید ہو کر چلے گئے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ خدا جو کچھ کرتا ہے وہ ہمارے حق میں ہوتا ہے۔ ممکن تھا کہ میں پیش کش قبول کر لیتا لیکن دو تین سال کے بعد پس از انقلاب کیا ہوتا۔ میرے سمدھی اطہر کلیم جعفری صاحب کے دو بڑے بھائی تہران میں تھے۔ ایک کو جان بچا کر افغانستان کے راستے پاکستان بھاگنا پڑا اور دوسرے امریکہ چلے گئے۔ پتہ نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔

اصفہان کے بعد میری دوسری منزل شیراز تھی جو کبھی حضرت سلمان فارسی، شیخ سعدیؔ، حافظؔ شیرازی، عرفیؔ، ملا صدرا اور جہانگیر خاں، مدیر صور اسرافیل کا وطن رہ چکا ہے۔ بس سے سفر کا آغاز ہوا۔ راستے میں ساسانی دور اور اس سے بھی پہلے مادی دور کی سنگ تراشی کے نمونے نقشِ رجب اور نقشِ رستم کی شکل میں نظر آئے جنھیں دیکھ کر ہندوستان میں سانچی اور بھوپال کے قریب شہنشاہ اشوک کے ننہیال ودیشا میں دامنِ کوہ میں سنگ تراشی اور بُت سازی کے نمونے یاد آ گئے۔ الورا اور اجنتا کی طرح یہ پہاڑ کاٹ کر ان کے اندر بنائی ہوئی عمارتیں اور ان میں ترشے ہوئے بت نہیں ہیں بلکہ بالکل سامنے پتھر کاٹ کر مورتیاں بنا دی گئی ہیں۔ نقشِ رجب میں ایک بادشاہ کی شکل پتھر پر ترشی ہوئی ہے جس کے اوپر عنایت خداوندی کا سایہ ہے۔ یہ غالباً ساسانی عہد کا سنگ تراشی کا نمونہ ہے اور بادشاہ غالباً شاپور اوّل ہے۔ نقشِ رستم کی سنگ تراشی ہخامنشی عہد سے بھی قدیم کہی جاتی ہے۔ یہاں دو ہزار سال قبلِ مسیح سے ساسانی عہد تک کی انسانی اور دیوتائی شکلیں پرسی پولس کے شمال میں کوہِ حسین کی جنوبی ڈھال کے دامن میں نظر آتی ہیں۔ ہخامنشی دور سے قبل ایک تراشی ہوئی شکل میں ساسانی دور کا ایک سین بنا دیا گیا ہے۔ قریب ہی کچھ بلندی پر پہاڑ کاٹ کر ان میں غار بنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن کے متعلق بتایا گیا کہ

وہ دارا اوّل اور اس کے تین جانشینوں کے مزار ہیں۔ (ہخامنشی دور کے بعد کے بادشاہوں کے مزار پرسی پولس میں ہیں)۔ مزاروں کے قریب ہی میدان میں ایک چوکور بارہ عشاریہ پچاس میٹر بلند مینار نما عمارت ہے جسے کعبۂ زرتشت کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ساسانی عہد کی کچھ تراشیدہ شکلیں ہیں جن میں سب سے قدیم میں اردشیر اوّل کی اہورامزدا کے ہاتھوں تاجپوشی کا منظر ہے۔ ان کے قدموں کے نیچے اشکانی بادشاہ اردوان اور اہرمن پڑے ہیں۔ دوسرا منظر شاپور اوّل کا ہے جس میں رومن شہنشاہ ولیرین اس کے قدموں میں جھکا ہوا ہے۔ یہ منظر دارا کی قبر کے قریب ہے۔ ساسانی عہد کے یہ مناظر جن کی تعداد گیارہ ہے اور جو سب ہخامنشی بادشاہوں کی قبروں کے قریب ہی میں اسی عہد کے ایک حصار کے اندر محفوظ ہیں۔ شیراز سے پہلے پرسی پولس یعنی دارا اوّل (B.C 522 - 455) کے دارالسلطنت اصطخر کے کھنڈرات ہیں اور اس سے بھی کچھ پہلے یعنی شیراز سے تقریباً ۸۰ کلومیٹر پہلے ایرانی شہنشاہیت کے بانی کروش (سائرس) کا مقبرہ ہے جو گزرتی ہوئی بس سے نظر آتا ہے۔ پاسر گاد کبھی ایک عظیم الشان سلطنت کا دارالحکومت تھا جس کی بنیاد ۵۴۶ء قبل مسیح پڑی تھی۔ اس میں اب تک ایک بلند پلیٹ فارم پر جس تک پہنچنے کے لیے زینے ہیں، ایک بلند **Rectangular** عمارت درست حالت میں موجود ہے جسے **Cyrus** کا مقبرہ بتایا جاتا ہے۔ اس شہر کے معمولی کھنڈرات جن میں مقبرہ کا پھاٹک بھی شامل ہے، مقبرے کے قریب میدان میں نظر آتے ہیں۔ جدید کھدائی کے دوران دیوانِ عام اور خاص محل کی دیواروں اور کھمبوں کے حصّہ اور ایک باغ کے نشانات بھی پائے گئے ہیں۔ قریب ہی ایک مینار نما عمارت ہے جسے زندان سلیمان بتایا جاتا ہے۔ وہیں پر ایک بڑا چبوترا ہے جسے تخت سلیمان کہتے ہیں۔ پرسی پولس (اصطخر یا تختِ جمشید) ہخامنشی خاندان کی دوسری شاخ کے اور اس خاندان کے تیسرے حکمران دارا، اور اس کے جانشینوں کا دارالحکومت

تھا جسکی بنیاد دارا اول نے ڈالی تھی اور اس کے جانشینوں خشایارشا (Xerxes) اور اردشیر (Artaxerxes)(241-224 B.C) اور بہت بعد کو اردشیر سوم Artaxerxes نے اس میں اضافے کئے تھے۔ یہ قدیم دارالحکومت شیراز سے ۶۰ کلومیٹر شمال میں ہے۔ اصل عمارتیں ایک 450x300 میٹر چبوترے پر بنی ہیں جس تک پہونچنے کے لیے زینے بنے ہوئے ہیں۔ اس شاندار پلیٹ فارم پر خشایارشا کا شاندار پھاٹک ہے جس کے دونوں طرف پر رکھنے والے بیلوں کے مجسّمے ہیں۔ اس پھاٹک سے غالباً Apodana اپادنا اور ہزارستون محل کو راستہ جاتا ہے جو دارا اور اس کے بیٹے کے بنوائے ہوئے تھے۔ اپادنا کے جنوب ومشرق میں دیوانِ خاص کی عمارت تھی۔ قریب ہی Tachara یعنی دارا کا خاص محل ہے جس میں خود دارا کا مجسمہ بھی ہے۔ اپادانا کے جنوب میں خشایارشا کا محل ہے۔ پلیٹ فارم کے جنوب ومغرب میں بالکل آخر میں اردشیر کا محل تھا جو تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ خشایارشا کے محل Hadish کے جنوب میں ملکہ کا محل تھا۔ یہاں ہی خشایارشا کا کتبہ بھی موجود ہے۔ محلوں میں سب سے بڑا دارا کا بنوایا ہوا سو کھمبوں کا ہال تھا جو سکندر کے حملے میں سب سے زیادہ تباہ ہوا۔ ان شاہی عمارتوں کے کھنڈروں کے علاوہ اور بھی بہت سی عمارتوں کے آثار ملتے ہیں۔ افسوس ہے کہ عمارت سازی اور سنگ تراشی کا یہ شاہکار سکندر کے ہاتھوں بالکل تباہ ہو گیا۔

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ

آثار پدید است صنا دیدِ عجم را

پرسی پولس میں چند گھنٹے قیام کر کے ۶۰ کلومیٹر کا سفر طے کر کے ہم لوگ صوبۂ فارس کے دارالحکومت شیراز پہنچے۔ شہر میں داخلہ دروازۂ قرآن سے ہوتا ہے اور اس دروازے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس پر آنے جانے والوں کی حفاظت اور برکت کے لیے قرآن مجید کا ایک خوبصورت نسخہ

رکھا رہتا تھا جواب تہران میں محفوظ ہے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی داہنی جانب دامنِ کوہ میں خواجو کرمانی کی قبر ہے جس کے قریب ہی سے پہاڑ سے نکلتی ہوئی چھوٹی سی نہر ہے جس کے متعلق بتایا گیا کہ وہی ''آبِ رکناباد'' ہے جس کے حافظ مدّاح تھے۔ اسے ۹۵۰ء میں رکن الدولہ نے بنوایا تھا۔ ہم لوگوں کا قیام دانش گاہِ شیراز کے ایک ہوسٹل میں تھا۔ دوسری صبح کو ہم لوگ باغِ ارم لے جائے گئے جو شیراز کا ایک بہت ہی خوبصورت باغ ہے۔ وہاں سے ہم لوگ شیراز یونیورسٹی گئے لیکن اسے بند پایا۔ معلوم ہوا کہ وہاں بھی شعبۂ ریاضی (Mathematics Deptt.) میں تین ہندوستانی استاد تھے اور انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ایران میں ایک اور تعلیمی طریقہ نظر آیا۔ مختلف یونیورسٹیوں کے استاد ایک شہر کی یونیورسٹی سے دوسرے شہر کی یونیورسٹی میں جا کر درس دیا کرتے تھے۔ شہر میں گردش کے دوران سیبویہ کی قبر پر بھی پہنچ گئے۔ اس نے ۷۹۰ء میں عربی گرامر کی تدوین کی تھی۔ ایک دوسرے موقع پر شیخ سعدی کے مزار کی بھی زیارت کی۔ ان کا انتقال ۱۲۹۱ء میں ہوا تھا اور خود اپنے باغ میں جس کے قریب ایک کنواں تھا دفن ہوئے تھے۔ اس پر محمد رضا شاہ کے دور میں ایک جدید انداز کا خوبصورت مقبرہ تعمیر کر دیا گیا ہے جس کے گرد ایک خوبصورت باغ ہے۔ حافظ (۱۳۸۸۔۱۳۱۰ء) کا قیام باغ مصلیٰ میں رہتا تھا اور وہی ان کی ابدی آرامگاہ بنا۔ ان کا مقبرہ ۱۹۲۶ء میں جدید انداز میں تعمیر ہوا اور وہ انکے تخلص کی مناسبت سے حافظیہ کہلاتا ہے۔ یہ جگہ شمالی شیراز میں ہے اور ایک زیارت گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے بھی وہاں فاتحہ خوانی کا شرف حاصل ہوا۔ حافظیہ کے قریب گردش کرتے ہوئے میں ایک حصار میں پہنچ گیا جو چہل تناں کہلاتا ہے۔ اس میں قدیم عہد کے کچھ درویشوں کے مزار ہیں۔ حصار میں کریم خاں زند نے ایک بارہ دری تعمیر کروا دی ہے۔ گردش کے دورانِ حصار میں ایک پیر مرد سے ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ ہندوستان میں مسلمان ہیں؟ میں نے

فخر کے ساتھ بتلایا کہ ایران کی کل آبادی سے کہیں زیادہ ہندوستان میں مسلمان ہیں۔ وہ حضرت بہت خوش ہوئے لیکن قریب کھڑی ہوئی ایک خاتون نے ان الفاظ میں میری تکذیب کی ''نہ نہ ایشان مسلمان نیستند، سنّی ہستند، کافر ہستند، علی را خلیفہ ندانند۔'' مجھے تعجب ہوا لیکن نورالحسن انصاری مرحوم سے بعد کو معلوم ہوا کہ اس وقت تک عام روش یہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مشہد میں اپنے دورانِ تعلیم کا اپنا ایک واقعہ بیان کیا تھا کہ ۲۱ر رمضان کو ان کی ایک ہمدرس نے انھیں فون پر مبارکباد دی تھی۔ انھوں نے مبارکباد کا سبب پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ یوم شہادتِ علی ہے اس لیے تمہاری عید ہوگی اس لیے مبارکباد دی ہے۔ انھوں نے فون رکھ دیا اور دوسرے روز اس سے بات نہیں کی اور جب اس نے ناراضگی کا سبب پوچھا تب انھوں اسے کل بات سمجھائی جس پر وہ بہت شرمندہ ہوئی اور بولی ''آغا چکنم، اخوند بمن ہمین طور گفتہ''۔ اور اخوندوں کی اس تعلیم کا سلسلہ دورِ صفویہ کی سیاسی مصلحتوں کے تحت شروع ہوا۔ انہیں ازبکوں اور ترکوں سے لڑنا تھا اور اس کے لیے سنّیوں سے منافرت پیدا کرانا ضروری تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد نفرت کی اس فضا کو ختم کیا جارہا ہے۔ اس گردش کے دوران مختلف دنوں میں مختلف لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ایک اسکول ٹیچر جن کا کسی خانقاہ سے تعلق تھا مجھے اور قاسمی صاحب کو اپنے گھر لے گئے۔ رہن سہن کے انداز بالکل ہماری تہذیب کے مطابق تھے۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ کسی نے اندر سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ صاحب اٹھے اور اندر جا کر چائے لے آئے۔ عرفی پر تحقیق کے زمانے میں کہیں پڑھا تھا کہ وہ محلہ سختویہ کا رہنے والا تھا چنانچہ شوق ہوا کہ اس جگہ کا پتہ لگایا جائے۔ ایک بزرگ آقای مرادی ملے۔ انھوں نے بتایا کہ محلّہ قصاب خانہ کے قریب اس نام کا کبھی کوئی محلّہ تھا۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ شاندار مکان تھا چلتے وقت جب میں نے ان سے ان کا پتہ لکھ دینے کو کہا تو معلوم ہوا کہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ بڑی مشکل

سے اپنے نام کا پہلا حصہ ''ید اللہ'' لکھ سکے۔ان کے خط کا یہ نمونہ اب تک میرے پاس محفوظ
ہے۔شیراز کی قدیم عمارتوں میں سب سے اہم مسجدِ جامع ہے جسے صفّاری حکمراں عمرولیث نے
۲۸۱ ہجری مطابق ۸۷۰ء کے لگ بھگ تعمیر کرایا تھا۔اس قدیم مسجد کی ساخت بھی اصفہان کی
قدیم مسجد کی طرح ہے۔شیراز کی سب سے اہم زیارت گاہ حضرت شاہ چراغ کا مقبرہ ہے۔ان
کا اصل نام احمد بن موسیٰ ہے۔وہ تیسری صدی ہجری میں شیراز تشریف لائے تھے۔ان کی قبر کی
نشاندہی ۱۲۸۱ء میں امیر مقرب الدین نے کی تھی جو ابوبکر بن سعد کا وزیر تھا اور ۱۲۸۲ء میں اس پر
مقبرہ تعمیر ہوا تھا۔ یہ مقبرہ بھی شیشہ کاری کا بہترین نمونہ ہے۔جنوبی شیراز میں ایک مقبرہ نظر آیا
جسے سید علاء الدین ، برادر حضرت امام رضا کی آرامگاہ بتایا گیا۔قریب ہی ایک دوسرا ویسا ہی
مقبرہ نظر آیا جو غالباً ان کے بھائی کا ہے۔انھیں مقبروں کے قریب پہلی مرتبہ قدیم طرز کے
زورخانے (Gymnasium) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔حافظ شیرازی کے سلسلے میں بابا کوہی کا ذکر
پڑھنے کو ملا کرتا تھا۔ان کے مزار کی زیارت کا شوق ہوا اور میں تنہا چل پڑا۔ یہ بزرگ پانچویں
صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ان کا مزار دامنِ کوہ میں کافی بلندی پر ہے۔چھوٹے سے مقبرے
میں دو قبریں ہیں جن میں سے ایک بابا کوہی کی ہے اور دوسری ان کے کسی خلیفہ کی۔تہران کے
بازار میں میں نے دیوان بابا کوہی بھی دیکھا۔ پتہ نہیں کس حد تک وہ خود بابا کوہی کا دیوان ہے۔
شیراز کے آثارِ قدیمہ میں مسجد وکیل ایک قابلِ دید عمارت ہے۔۱۱۸۷ء میں کریم خان زند نے
اسے تعمیر کرایا تھا۔مسجد کے جنوب میں ۴۸ سنگ مرمر کے کھمبوں پر کھڑا ایک وسیع سنگ مرمر کا
تعمیر شدہ ہال ہے۔ ہر مینار سنگِ مرمر کے صرف ایک ٹکڑے سے بنایا گیا ہے۔مسجدِ شہداء یا مسجدِ نو
،شاہ چراغ کے علاقے میں ایک بڑی مسجد ہے جس کی تعمیر وتوسیع ۱۱۹۹ء سے ۱۳۳۰ء تک ہوتی
رہی۔ پرانی عمارت ایک زلزلے کی نذر ہوگئی تھی۔وہ بعد کو دوبارہ تعمیر کی گئی۔شیراز کے بازاروں

میں بازارِ وکیل تہران کے بازارِ بزرگ کی طرح مسقف بازار ہے۔ اسی بازار سے میں نے اور ڈاکٹر قاسمی صاحب نے کچھ سوئیٹر خریدے تھے جن میں سو تومان کا خریدا ہوا ایک سوئیٹر میرے پاس اب تک موجود ہے اور اس بازار کی یادگار ہے۔ دانشمندانِ شیراز کے سلسلے میں یہ ذکر کر دینا مناسب ہے کہ اس شہر میں شیخ روز بہان (۱۲۰۹ء۔۱۱۲۸ء) نے اپنا متصوفانہ سلسلہ جاری کیا۔ یہاں ہی مشہور فلسفی ملا صدرا کو لا مذہبی کے الزام میں ۱۶۳۴ء میں سزائے موت ملی، یہاں ہی جلال الدین دوّانی نے اپنے فلسفیانہ خیالات کی تبلیغ کی اور یہاں ہی سے علی محمد باب نے ۱۸۴۴ء میں اپنے بابی مذہب کی ابتدا کی، یہاں ہی مشروطیت کے زبردست علمبردار مرزا جہانگیر خاں، مدیرِ صورِ اسرافیل، کو سزائے موت دی گئی جن کی یاد میں مہدی حمیدی نے اپنی مشہور نظم ''یاد آر زِ شمع مردہ یاد آر'' لکھی۔

شیراز میں دس روز قیام کے بعد ہم لوگ تہران واپس آ گئے اس لیے کہ ہمارے میز بانوں نے صرف چند روز کے بعد ہمارے خراسان بھیجنے کا پروگرام بنا دیا تھا۔ ہمیں سب سے پہلے بس سے مشہد جانا تھا۔ کوہِ دماوند کے برابر سے شمالی راستے سے دشت، گنبدِ قابوس، بوجنورد، قوچان وغیرہ چھوٹے شہروں سے گزرتے ہوئے دوسرے روز مشہد پہنچے۔ تہران کے برخلاف مشہد ایک پسماندگی کی حد تک مشرقی شہر نظر آیا۔ سڑکوں کے کنارے ٹھیلوں پر کھانے کا سامان بکتا تھا۔ بکری کے تلے ہوئے گردے اور کلیجی عام طور سے ان ٹھیلوں پر بکتی نظر آئی۔ مشہد ہی میں ہمیں خالص ایرانی غذا ''خورش'' کھانے کو ملی۔ مختلف دالیں، گیہوں، جو وغیرہ ہانڈیوں میں رکھ کر تنور میں پکا لیا جاتا ہے اور یہ ہانڈیاں پکنے کے بعد مہمانوں کے سامنے رکھ دی جاتی ہیں اور ہاون دستے کے دستے کی قسم کی ایک ہتھوڑی دے دی جاتی ہے۔ اس سے ہانڈی میں پکی ہوئی اشیاء کو کچل کر کھایا جاتا ہے۔ تہران کے ذکر میں ایرانیوں کی عام غذا کا ذکر کرنا بھول گیا۔ گائے

کے گوشت کے دو طرح کے کباب تیار کئے جاتے ہیں جنھیں کو بیدہ اور برگ کہتے ہیں۔ کو بیدہ گائے کے گوشت کے بڑے سائز کے کباب ہوتے ہیں۔ اور برگ گوشت کی پرتیں اتار کر بنائے جاتے ہیں۔ انھیں ایک قسم کے پسندے سمجھنا چاہیے۔ چلو کے معنی چاول ہوتے ہیں۔ فیشن ایبل اور تعلیم یافتہ لوگوں کی غذا چلو کباب ہوتی ہے۔ یعنی چاول کی پلیٹ پر کباب اور اس پر مکھن کی ایک ٹکیا رکھ دی جاتی ہے۔ یہی Dish ہوگئی۔ روٹیاں مختلف قسم کی ہوتی ہیں اور صرف تنوروں میں کنکریوں (Pebbles) پر ہیٹروں سے پکتی ہیں۔ گھر میں روٹی پکانے کا رواج نہیں ہے۔ زیادہ فیشن ایبل علاقوں میں ہیم برگر مرغوب غذا تھی لیکن مذہبی حلقے اس سے محترز تھے۔ ان کے خیال میں اس میں سور کا گوشت شامل ہوتا تھا۔ مشہد میں بھی ہمیں انھیں سب غذاؤں سے سابقہ پڑا۔ میرے پہلے سفر کے وقت مشہد اس حد تک پسماندہ تھا کہ گوشت کھلی حالت میں فٹ پاتھ پر بکا کرتا تھا۔ شہر ہر حالت میں مشرقی تھا۔ مجھے مدرسہ کے ایک جلسۂ دستار بندی میں جانے کا موقع ملا۔ جلسہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہمارے یہاں ہوتا ہے۔ اگلی صفوں میں علماء بیٹھتے تھے، ان کے بعد حکومت کے اراکین اور ان کے بعد مہمانانِ خصوصی اور سب کے آخر میں طلباء۔ تہران کے برخلاف تقریباً ہر خاتون چادر پوش نظر آئی۔ ہمارے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ الہٰ آباد یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر ضامن حسین صاحب کی صاحبزادی ناصرہ شرما (شرما صاحب ان کے شوہر تھے) جو جواہر لال یونیورسٹی کی طالبعلم تھیں اور ہمارے ساتھ بحیثیت طالبہ ایران گئی تھیں، اس وقت میرے ساتھ تھیں اور نادر شاہ کے مقبرے کے سامنے ہم لوگ بس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ جگہ حضرت امام رضا کے مقبرے کے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک چادر پوش خاتون آئیں اور ناصرہ شرما کا بازو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا اور بولیں ''شما از امام رضا شرم نداری ولی ایشان از شما شرم دارند۔ چرا چادر نمی پوشی'' (تمھیں امام

رضا سے شرم نہیں آتی لیکن انہیں تم سے شرم آتی ہے۔تم چادر کیوں نہیں اوڑھتیں)۔ یہ کہہ کر وہ چل دیں اور ہم لوگ ہکا بکا کھڑے رہ گئے۔ جتنے روز بھی ہم لوگ مشہد میں رہے زیادہ وقت روضۂ اقدس میں گزرتا تھا۔ روضہ سے ملحق کتابخانۂ آستانۂ قدس ہے، جو لاجواب قلمی نسخوں، خصوصاً قرآن مجید کے مرصع ومذّہب نسخوں، کا خزانہ ہے۔ میرا بہت کافی وقت وہاں گزرتا تھا اور چاہتا تھا کہ جتنے دن بھی مشہد میں ہوں اس کتابخانے سے فیض حاصل کرلوں۔ روضہ سے متصل شاندار مسجدِ گوہر شاد ہے جسے تیمور کے بیٹے اور جانشین شاہ رُخ کی بیوی گوہر شاد نے بنوایا تھا۔ دینا بھر میں مشہد کی شہرت حضرت امام رضا کے روضۂ مبارک کی وجہ سے ہے۔نویں صدی تک مشہد توس کا ایک نواحی گاؤں تھا جس کا نام ثناباد تھا۔جس جگہ آج امام رضا کا روضۂ مبارک ہے وہ ایک عرب کا باغ تھا جس میں ہارون رشید کی تدفین ہوئی تھی۔ امام رضا کے انتقال کے بعد انھیں بھی وہیں دفن کردیا گیا۔ بعد میں دونوں قبروں پر چھت بنادی گئی اور اس کے بعد ایک ایرانی نے گنبد تعمیر کروادیا۔ بعد کو ہر بادشاہ نے اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ کیا اور آج یہ مقبرہ دُنیا کی عظیم الشان عمارتوں میں سے ایک ہے جس کے گنبد اور میناروں پر سونا چڑھا ہوا ہے اور روضۂ مبارک کے اندر آئینہ کاری ہے۔ روضہ بظاہر ایک وسیع وعریض چبوترے پر بنا ہوا ہے لیکن ایک دوسرے سفر کے دوران مجھے پتہ چلا کہ وہ چبوترا ایک بڑے قبرستان کی چھت ہے۔ مقبرے میں ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ مشہد کے باہر ایک قدیم عمارت ہے جسے عموماً زندانِ ہارون کہا جاتا ہے جو غلط ہے۔ یہ عمارت ہارون کے عہد کے کافی بعد ۱۲۳۹ء کی تعمیر شدہ ہے اور حقیقتاً امام غزالی کا مقبرہ ہے لیکن ان کی قبر کا پتہ نہیں چلتا۔ علامتی طور پر صحن میں قبر بنادی گئی ہے۔ کسی زمانے میں یہ عمارت عظیم شہر توس میں تھی لیکن اس کی نشانی اب اس کی پشت کی دیوار میں ایک قدیم مسجد کی شکستہ محراب اور کچھ حصّہ شامل ہے جس کی طرف

عموماً لوگوں کی نظر تک نہیں جاتی۔ مشہد سے تقریباً تیس میل شمال و مشرق میں توس کا ویران شہر ہے جس کی حدیں کبھی موجودہ مشہد سے ملتی تھیں اور اب جس کا نشان مٹی کی بنی ہوئی شہر پناہ کا کچھ حصّہ ہے۔ یہ ویرانہ وہی شہر ہے جو کبھی دقیقیؔ، فردوسیؔ، امام غزالیؔ، نظام الملک طوسیؔ، اور محقق طوسیؔ جیسی عظیم شخصیتوں کا زادگاہ تھا۔ مشہد سے اس شہر پناہ تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک خوبصورت باغ میں فردوسیؔ کا جدید طرز کا اور اس کے شایانِ شان شاندار مقبرہ ہے۔ اس کی بھی حیثیت ایک زیارت گاہ کی ایسی ہوگئی ہے۔ نظامیؔ عروضی سمرقندی کے بقول فردوسیؔ شہر کے باہر اپنے باغ میں دفن ہوا تھا۔ پتہ نہیں موجودہ قبر وہی باغ ہے یا یہ بھی محض ایک علامتی قبر ہے۔ ایران کے سفروں کے دوران میں تین مرتبہ مشہد گیا۔ پہلی مرتبہ بس سے، دوسری مرتبہ ہوائی جہاز سے اور تیسری مرتبہ ریل سے۔ ایران میں یہ میرا پہلا اور آخری ریل کا سفر تھا۔ ہندوستان میں حضرت جہانگیر اشرف سمنانی کے کچھوچھے میں مزار کی وجہ سے اکثر لوگوں نے سمنان کا نام سنا ہوگا۔ ریل کے سفر کے دوران میں سمنان سے گزرا اور نمازِ عصر کے لیے کافی دیر تک ٹرین سمنان اسٹیشن پر کھڑی رہی۔ ہر سفر میں مَیں نے مشہد کو بدلا ہوا پایا۔ جس جگہ فٹ پاتھ پر میں نے کبھی گوشت فروخت ہوتے ہوئے دیکھا تھا اب وہ پورا علاقہ روضۂ اقدس میں شامل کرلیا گیا ہے۔ آخری سفر میں روضہ کے قریب جس ہوٹل میں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا وہ ایک نہایت شاندار ہوٹل ہے۔ اس کے علاوہ اب مشہد میں اور بھی شاندار ہوٹل ہیں۔ شہر میں کچھ بہت بڑے اور قاعدے سے ترتیب دیے ہوئے بازار ہیں جن میں بازارِ رضا خاصہ بڑا ہے۔ الغرض ۱۹۷۶ء کے قدیم مشہد سے ترقی کر کے موجودہ مشہد اب ایک قرینے سے بسا ہوا جدید شہر ہے جس میں اسلامی قدریں بھی برقرار ہیں۔

خراسان کا دوسرا شہر (توس اب شہر نہیں ہے)۔ جس کی زیارت مجھے نصیب ہوئی نیشا

پور ہے جو کبھی دنیا کا سب سے بڑا شہر اور عمر خیامؔ، فرید الدین عطارؔ اور آخری دور میں نظیریؔ نیشا پوری کا وطن تھا۔ مشہد سے سبزوار کے راستے پر موجودہ شہر نیشا پور مشہد سے تقریباً ایک سو دس کلومیٹر کے فاصلے پر آباد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ساسانی بادشاہ شاپور اوّل نے اسے بسایا تھا لیکن وہ رونق پذیر سلجوقیوں کے دور میں ہوا جب انھوں نے اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس وقت اس شہر کی آبادی دس لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔ ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک نے بغداد کے علاوہ یہاں بھی مدرسۂ نظامیہ قائم کیا تھا جس کا کتابخانہ اسلامی دُنیا کا اپنے وقت کا سب سے بڑا کتابخانہ تھا۔ چنگیزی حملے میں اس عظیم شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور تقریباً تمام آبادی تہہ تیغ ہو گئی۔ شیخ عطار بھی ایک مغل کے ہاتھوں گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔ شہر بعد کو کبھی رونق پذیر نہ ہو سکا اور موجودہ نیشا پور محض پچاس ہزار لوگوں پر مشتمل ایک معمولی قصبہ ہے۔ عہدِ آلِ سلجوق کی یادگار عطار کے مقبرے کے سامنے سے کافی دور پر ایک کچی دیوار کی شکل میں نظر آتی ہے۔ شہر کی سب سے قدیم عمارت شیخ عطار کا چھوٹا سا مقبرہ ہے جسے علی شیر نوائی نے تعمیر کروایا تھا۔ عطارؔ کے مقبرے کے قریب ہی جدید طرز کا تعمیر شدہ عمرِ خیامؔ کا مقبرہ ہے اور اس کے برابر ہی موجودہ دور کے ایک عظیم مصوّر کمال الملک کی قبر بھی ہے۔ اس سے چند گز کے فاصلہ پر امام زادۂ محروق کا مقبرہ ہے۔ بظاہر شہر میں کوئی قرینہ کا ہوٹل بھی نہیں ہے۔ ایک سفر کے دوران ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا ایک ایسے ہوٹل نما گھر میں کھایا جس کی خواتین کھانا تیار کرتی تھیں اور مرد مہمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ نیشا پور ۱۹۹۴ء کے دوسرے سفر میں جب پروفیسر اظہر بھی میرے ساتھ تھے وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی ۱۹۷۶ء میں اصفہان یونیورسٹی میں ملنے والے شاعر کی آخری ملاقات جب وہ بسترِ مرگ پر تھے۔ نیشا پور فیروزہ کے لیے مشہور ہے۔ اس کی کان شہر سے قریب ہی ہے۔ نگینوں کی تراش اور درستی تہران میں ہوتی ہے اور بازارِ فیروزہ اس

کی فروش گاہ ہے۔ موجودہ نیشاپور میں جامع مسجد تنہا دیکھنے کے لائق عمارت ہے جس کے میناروں کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ عہدِ سلجوقی کی یادگار ہیں۔ ہم لوگوں کی نیشاپور سے تہران کی واپسی میں سبزوار، شاہ رود، دامغان اور سمنان سے گزر ہوا۔ اب یہ سب چھوٹے چھوٹے قصبے ہیں۔ دامغان محمود غزنوی کے عہد کے مشہور شاعر منوچہری کا وطن تھا اور سمنان مشہور صوفی بزرگ حضرت جہانگیر اشرف کی زادگاہ تھا جو عہدِ تیمور میں ہندوستان آ گئے تھے اور کچھوچھے میں جن کا مزار ایک اہم زیارت گاہ ہے۔

ایران کے اپنے آخری سفروں میں سے ایک میں (غالباً ۱۹۹۴ء میں) صوبۂ آذر بیجان میں تبریز کی زیارت کا موقع ملا۔ آذر بیجان ایرانی تہذیب کا بہت ہی قدیم مرکز ہے۔ یہاں ہی Medes نے آشوریوں کو ۶۰۶ قبل مسیح میں شکست دے کر اپنی سلطنت قائم کی اور اسی صوبے کو زرتشت کی زادگاہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ شہر تبریز وہی ہے جہاں شمس تبریزی پیدا ہوئے جنھوں نے رومی کے ایسے مفکر کو متاثر کیا۔ یہ وہی شہر ہے جہاں سبکِ ہندی کا آخری سب سے بڑا شاعر صائبؔ پیدا ہوا اور جہاں کا موجودہ صدی کا سب سے بڑا شاعر شہریار باشندہ تھا۔ یہ وہی شہر ہے جہاں کے مزارِ شعراء میں ایران کے کچھ عظیم ترین شاعر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ دو لاکھ پچاس ہزار لوگوں پر مشتمل یہ شہر تہران سے ۶۴۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اور ہوا پیما، ریل، اور بس سے وہاں جایا جا سکتا ہے۔ تہران یونیورسٹی کے استاد پروفیسر جلیل تجلیلی صاحب جن کا وطن تبریز ہے، کے ساتھ مجھے اسلم خان مرحوم کو اور اظہر صاحب کو ایک روز کے لیے تبریز بھیجا گیا۔ مہر آباد ایرپورٹ سے روانہ ہو کر تقریباً ایک گھنٹہ کی پرواز کے بعد ہم لوگ تبریز پہنچے اور تبریز یونیورسٹی کے ایک ادارہ میں لے جائے گئے لیکن یونیورسٹی بند ہونے کی وجہ سے ہم اس کی زیارت نہ کر سکے۔ وہاں سے ہم کو پہاڑ کی ایک چوٹی پر تبریز کے

Planetorium (سیارہ نما) لے جایا گیا۔ سیاروں کا جو مشاہدہ کرنا تھا وہ تو کیا ہی، لیکن اس بلندی سے پورا شہر تبریز نظر آیا جو بظاہر دو حصّوں میں بٹا ہوا ہے، شمالی اور جنوبی۔ قراقوینلو خاندان کے حکمران قرا یوسف کی شاندار مسجد ہی غالباً تبریز کی تنہا قدیم یادگار ہے۔ ہمیں وہ مکان بھی دکھایا گیا جہاں سے اہلِ تبریز کی رہنمائی میں تحریک مشروطیت کی ابتدا ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی جس کے نتیجہ میں کچھ خونریزی کے بعد ایران Constitutional Monarchy بن گیا تھا اور مظفر الدین شاہ کو ''مجلس'' بنانا پڑی تھی لیکن ایک ہی سال کے بعد جنوری ۱۹۰۷ء میں محمد علی شاہ نے اس تحریک کو دبا دیا اور پارلیمنٹ پر بمباری کر کے اسے ختم کر دیا۔ تبریز میں میری دلچسپی کا سب سے بڑا مرکز مزارِ شعراء تھا۔ ہم لوگ وہاں گئے لیکن کسی قدیم عمارت کے بجائے ایک بالکل نئے طرز کی نئی عمارت نظر آئی۔ ظہیر فاریابی، خاقانی یا کسی بھی دوسرے عظیم شاعر کی قبر کے نشانات نظر نہ آئے۔ صرف چند غیر معروف اور نسبتاً بعد کے عہد کے شاعروں کی قبروں کے نشان دیکھے۔ بہر حال موجودہ عہد کے بڑے شاعر شہریار کی آرامگاہ کی زیارت ہوگئی۔ شام کی فلائٹ سے ہم تہران واپس آگئے۔ اسی سفر کے دوران میں ایک ہندوستانی طالبعلم اور میرے ہمکار خان محمد عاطف کے صاحب زادے نے مجھے اپنے کسی استاد سے ملوانے قزوین لے جانا چاہا تھا لیکن اس سفر کے لیے میری ہمّت جواب دے گئی۔

خوزستان کے ذکر کے بغیر میرا ایران کا یہ سفر نامہ نامکمل رہے گا۔ ۱۹۷۶ء میں اپنے پہلے سفر ایران کے دوران ہمیں تیل کے شہر ابادان لے جایا گیا۔ یہ جگہ شمالی ایران سے بالکل مختلف ایک گرم ریگستانی علاقہ ہے۔ تمازت اس حد تک تھی کہ دس بجے کے بعد ہوٹل سے نکلنے کی ہمّت نہ پڑتی تھی۔ شہر صرف پالائش گاہ (ریفائنری) میں کام کرنے والوں پر مشتمل تھا۔ دیہاتوں کے بازاروں کے قسم کا ایک چھوٹا سا بازار تھا جس میں ترکاریوں وغیرہ کے علاوہ بالکل

تازہ توڑی ہوئی کھجور گچھوں کی شکل میں ملتی تھی۔ مشہد میں میری غذا کا بڑا حصّہ انگور تھے اور اباداں میں کھجور۔ اباداں میں دو روز ہمارا قیام رہا اور ریفائنری کو خوب اچھی طرح سے دیکھا اور سمجھا۔ آسمان پر ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ اباداں کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ ہم لوگ دولتی مہمان تھے اس لیے ہوٹل کا پورا خرچ حکومت ادا کرتی تھی۔ ہمارے ایک ساتھی پینے کے شوقین تھے۔ ان کے ساتھ بیئر نوشی میں ایک دوسرے صاحب بھی شریک ہو گئے۔ ہوٹل چھوڑتے وقت اس کا الگ سے بل پیش کر دیا گیا۔ دونوں حضرات کی جیبیں خالی تھیں۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح Payment کیا گیا۔ ان ہی صاحب کے متعلق ان کے ساتھ کمرے میں رہنے والے ایک دوسرے صاحب نے ایک دلچسپ قصّہ سنایا۔ وہ حضرت دیر میں اٹھنے والے تھے اس لیے جب کبھی ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لیے سویرے اٹھنا پڑتا تھا تو وہ رات ہی کو شیو کر کے پورے کپڑے اور جوتے پہن کر سوتے تھے تاکہ سویرے پریشانی نہ ہو۔ بندر شاپور، اباداں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ایک بندرگاہ ہونے کے علاوہ یہ ایک کارخانوں کا شہر بھی ہے۔ کیمیکل کے ایک کارخانے میں ہماری ملاقات کیرالا کے چند انجینئروں سے ہوئی۔ ہمیں انگریزی میں بات کرتے ہوئے دیکھ کر ہمارے ایرانی ساتھی حیران تھے۔ ان بیچاروں کو نہیں معلوم تھا کہ ہندوستان میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے لیے آپسی گفتگو میں انگریزی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بندر شاپور سے ہم لوگ دریائے کارون کو پار کر کے خُرّم شہر گئے۔ وہ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا۔ وہاں سے شطِ عرب کے اس پار بصرہ کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ اباداں کی طرح خرم شہر بھی عراق ایران جنگ میں بالکل برباد ہو گیا تھا اور اس کا نام خونیں شہر پڑ گیا تھا۔

ایران کے سات سفروں کے دوران یہ مشاہدات تھے جو سپرد قلم کر دیئے گئے۔ اس

کے علاوہ سلمانؔ ساوجی پر سیمینار میں شرکت کی دعوت ملی تھی لیکن کچھ وجوہ سے میں نہ جاسکا ورنہ ساوہ کی بھی زیارت ہو جاتی۔ ایک مرتبہ مولانا روم پر بین الاقوامی سیمینار کے لیے قونیہ (ترکی) میں بھی بلایا گیا تھا لیکن کچھ خانگی مسائل کی وجہ سے وہاں بھی نہ جاسکا تھا اور میرے ہمکار اُردو کے پروفیسر شبیہ الحسن صاحب میرے بجائے وہاں چلے گئے تھے۔

''لذید بود حکایت دراز برگفتم''

سترہواں باب

میرا سفر حجِ بیت اللہ

مبارک ہو ولی جاگی ہے قسمت
کیا ہے یاد تم کو مصطفیٰؐ نے

۳۰ / جون ۱۹۸۸ء کو میں یونیورسٹی سے رٹائر ہوا اور دوسرے ہی روز اپنی اہلیہ ڈاکٹر ہاجرہ مرحومہ، اپنے بھائی انجینئر عبدالوہاب اور ان کی بیوی صفیہ اور اپنی بہنوں شاہدہ اور شمیم کے ساتھ اس سفرِ مبارک کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس زمانے میں میرے ایک بھائی ڈاکٹر زبیر رشید الحق جدّہ میں تھے۔ ان کے علاوہ دو پھوپھیوں کی اولادیں مصطفیٰ قدوائی کی سربراہی میں جدّہ میں مستقل طور سے رہ رہی تھیں۔ ان سب کا وہاں ساتھ ہوا۔ میرا یہ سفر کوئی تفریحی سفر نہ تھا جس میں مختلف جگہوں کا حال بیان کیا جائے۔ میں اپنی اس سوانح حیات میں مختلف جگہوں پر اپنے تاثرات بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سفر میں میرے جو تاثرات تھے ان کے بیان کے لیے الفاظ نہیں ہیں تو کیا بیان کروں۔ بہر حال حرمینِ شریفین، مسجد قبا، میدان اُحد کی تصویریں آج تک نظروں کے سامنے پھرا کرتی ہیں۔ ان تاثرات کا اندازہ میری کچھ ان نعتوں سے ہوسکتا ہے جو اس سفر سے واپسی کے بعد کہی گئیں اور جو میرے ایک مجموعۂ کلام ''گلزار'' میں شامل ہیں۔

بہر حال ''ایک مرتبہ دیکھا ہے اور پھر دیکھنے کی ہوس ہے''۔

اس سفر مبارک کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جسے تحریر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ مکّہ معظّمہ سے ہم لوگ مدینہ منورہ جا رہے تھے۔ بیگم ڈاکٹر اخلاق الرحمان بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ وہ اور میرے ساتھ کی سب خواتین بس کی پیچھے کی سیٹوں پر بیٹھی تھیں اور مجھے بالکل آگے کی بائیں طرف کی سیٹ ملی تھی۔ پینے کا پانی میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ بس ہوا کی رفتار سے جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بیگم اخلاق صاحبہ یکا یک اپنی سیٹ سے اٹھیں اور آگے آنے لگیں۔ میں سمجھا کہ انھیں پانی کی ضرورت ہے اور وہ میرے پاس آ رہی ہیں لیکن بالکل آگے آنے کے بعد بائیں طرف مڑ کر مجھ تک پہنچنے کے بجائے وہ داہنی جانب دروازے کی طرف مڑ گئیں اور میں نے دروازہ کھولنے کے لیے ان کا داہنا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر دیکھا۔ میں بجلی کی طرح اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے انھیں دبوچ کر بس کے فرش پر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی دروازہ کھلنے کے بعد ہوا کا اتنا تیز جھونکا بس میں آیا کہ اگر ہم بیٹھے نہ ہوتے تو یقیناً ہوا سے باتیں کرتی ہوئی بس کے باہر ہوتے۔ بس فوراً روکی گئی لیکن وہ یہ نہ بتا پائیں کہ انھوں نے بس کو رکا ہوا کیسے سمجھ لیا تھا اور کیوں اترنا چاہتی تھیں۔ الغرض ہم لوگ اس حادثے سے بچ گئے ورنہ حج کی سعادت کے بغیر ہی دنیا سے چلے گئے ہوتے۔

حج ہی کے سلسلے کا ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ منیٰ میں جب ہم لوگ رمی کرنے گئے تو مجمع کم تھا لیکن جب کنکریاں ماری جا رہی تھیں تو یکا یک پیچھے سے زبردست ریلا آیا اور لوگ گرنا شروع ہو گئے۔ جو گر جاتا تھا اس کا اٹھنا محال ہوتا تھا اور وہ قدموں سے روند دیا جاتا تھا۔ بہ ہزار خرابی ہم لوگ مجمع سے باہر آ سکے لیکن معلوم ہوا کہ برادرم عبدالوہاب ہم میں نہ تھے۔ سخت پریشانی کے عالم میں جو چند منٹ گزرے وہ آج تک نہ بھلائے جا سکے۔ کچھ منٹ کے بعد

وہاب مجمع سے نکلتے معلوم ہوئے لیکن جب قریب آئے تو کپڑے خون میں تر بتر تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ریلے میں گر گئے تھے لیکن ان کے سامنے کوئی شخص پڑا ہوا اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے اور ان کے ہاتھ اس کی پیٹھ پر ٹک گئے اور اس کے سہارے وہ سیدھے ہو گئے۔ ان کپڑوں پر اسی بے چارے کا خون تھا۔

رسیدہ بود بلائے ولی بخیر گذشت

اٹھارہواں باب

میری سخن سنجی

''نہ ہوتا شعرا گر ہمدم تو کب کا مر چکا ہوتا''

میرا ایک علمائے دین کے خاندان سے تعلق ہے اور اس طبقے میں عام طریقے سے شعروشاعری کو لہو و لعب میں شمار کیا جاتا ہے اور شاعروں کو شیطان کا پیرو سمجھا جاتا ہے لیکن حضرت حسّان بن ثابت کی فخرِ دو عالم کی مدح سرائی سے اس خیال کی تکذیب ہوتی ہے۔ البتہ وہ شعر جن کی بنیاد جھوٹ اور فحاشی پر ہو وہ یقیناً شیطانی کارنامے ہوتے ہیں۔ میرے اجداد میں صرف دو حضرات کا پتا چلتا ہے جن کا شعر گوئی سے تعلق تھا۔ اس سلسلے میں پہلا نام تقریباً پچیس نسل پہلے حضرت خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کا ہے جو اپنی مناجاتوں کے لیے مشہور ہیں اور انھیں مناجاتوں میں وہ بلند پایہ رباعیاں ملتی ہیں جن کی وجہ سے ان کا شمار فارسی کی صفِ اوّل کے عظیم رباعی گو شعراء میں ہوتا ہے۔ دوسرے بزرگ جن کا تعلق شاعری سے بھی بتایا جاتا ہے میرے پردادا مولانا امان الحق صاحب تھے۔ ان کے معاصر فرنگی محل کے مستند عالم مولانا محمد نعیم صاحب کی یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ باوجود زبردست صوفی بزرگ اور عالم دین ہونے کے وہ چوک میں ایک معمولی سے مدرسے میں درس دیا کرتے تھے اور بہت معمولی حلال کی کمائی سے

گذر بسر کرتے تھے۔ مولانا نعیم صاحب ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف فارسی میں شعر کہتے تھے اور ایک فارسی لغت بھی لکھ رہے تھے۔ مولانا امان الحق صاحب کے فرنگی محل کے معاصرین میں مولانا غضنفرؔ، مولانا عبدالاحد شمشادؔ، مولانا برکت اللہ رضاؔ اور مولانا محمد حسین متینؔ اُردو میں سخن سرائی کرتے تھے۔ مولانا شمشادؔ اور مولانا رضاؔ کے دواوین شائع ہو چکے تھے۔ مولانا امان الحق صاحب کے اشعار کے نمونے مجھے نہ مل سکے۔ میرے ہوش سنبھالتے وقت میرے چھوٹے چچا ظہور الحق صاحب مرحوم باقاعدہ اُردو شعر کہتے تھے۔ لیکن ۱۹۴۶ء میں اورنگ آباد میں ان کے انتقال کے بعد جوان کا تھوڑا بہت سامان ان کے بڑے بھائی وحید الحق صاحب بیدر لے گئے اور بعد کو لکھنؤ بھیجا اس میں ان کی کوئی بیاض نہ تھی۔ اس غیر شاعرانہ مذہبی ماحول میں میں شعر کی طرف کیسے راغب ہوا اس پر غور کرنے سے تین اسباب سمجھ میں آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ بچپن میں بالکل تنہا ہونے کی وجہ سے جس کے ساتھ کوئی بھی کھیلنے والا بچّہ نہ تھا، میں اپنے تصوّرات کی دنیا میں گم رہنے والا بچّہ بن گیا جس سے میری قوت متخیّلہ ارتقا پذیر ہوئی۔ ساتھ ہی ماں کی غیر موجودگی میں میرے احساسات انتہائی نازک ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ کم عمری میں، جیسا کہ لکھ چکا ہوں، اپنے چچاؤں منظور الحق اور ظہور الحق صاحبان کے ساتھ حکیم آشفتہ صاحب کے مطب میں جا کر حکیم صاحب کے دوستوں کے اشعار سنا کرتا تھا۔ اس بات نے بھی مجھ میں خود شعر کہنے کی امنگ پیدا کر دی۔ تیسرے یہ کہ کچھ اور بڑے ہو کر مولانا اختر علی تلہری صاحب کے درجے میں بیت بازی کے سلسلے میں شعراء کے دواوین کے مطالعے کی ضرورت پیش آئی۔ مطالعہ کا یہ شوق آئندہ بھی جاری رہا۔ ان تمام باتوں کے نتیجے میں ہائی اسکول ہی میں میر تقی میرؔ کے اس شعر کا مصداق ہو گیا:

مصرعہ کبھو کبھو کوئی موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

انٹر میڈیٹ میں پہنچ کر باقاعدہ شعر کہنے لگا اگر چہ ان میں زیادہ تر اشعار محض تفریحاً اور اپنے کچھ ہمدرسوں میں ہوحق کرنے کے لیے ہوتے تھے لیکن ان سے مجھے ایک فائدہ بھی ہوا۔ جب سنجیدگی سے شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوا تو اچھی خاصی مشق سخن ہو چکی تھی اور خیالات کو موزوں کرنے میں کوئی دقّت نہ ہوتی تھی۔ اس تفریحی شاعری کے دور میں بھی میں نے کچھ اچھی غزلیں کہی تھیں اور ڈاکٹر احسن فاروقی کی ہمّت افزائی سے وہ شائع بھی ہوئی تھیں۔ یہ تفریحی شاعری کا دور ۱۹۴۷ء میں والدِ مرحوم کے انتقال کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس لیے کہ اس وقت دو وقت پیٹ بھرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ (اس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں) اور ان حالات میں: ''کہاں کی رباعی کہاں کی غزل''۔ عملی طور سے پیٹ کے مسائل کے آگے ہر چیز ختم ہو جاتی ہے اور بقولِ شیخ سعدیؔ

چنان قحط سالی در اندر دمشق　　　که یاران فراموش کردند عشق

جب قحط سالی میں عشق ہی کو لوگ بھول جاتے ہیں تو اس کی پیداوار غزل گوئی کی کہاں گنجائش باقی رہتی ہے۔ جب ان نازک حالات پر کچھ قابو پایا تو طبیعت کھیل کود، جسم سازی، پیراکی وغیرہ کی طرف زیادہ مائل رہی اگر چہ شعر گوئی کا سلسلہ بھی منقطع نہ ہوا۔ اس دور کی میری شاعری تفریحی موزوں طبعی نہ تھی۔ میں باقاعدہ سنجیدہ شعر کہتا تھا لیکن اپنی کم آمیز فطرت کی وجہ سے اس کے سامع کچھ عزیز اور بے تکلف دوستوں کا محدود حلقہ تھا۔ یونیورسٹی میں آنے کے بعد اس حلقے میں فارسی۔ اُردو ڈیپارٹمنٹ کے اساتذہ بھی شامل ہو گئے اور رفتہ رفتہ شعر گوئی اور شعر خوانی کے سلسلے میں جھجک بالکل ختم ہو گئی اور میں شہر کی مخصوص اور معیاری نشستوں میں شرکت کرنے لگا۔ مجھے شعر کہنا اور اچھا شعر کہنا آتا تھا لیکن پڑھنا نہ آتا تھا (تحت الفظ پڑھنا خود ایک فن ہے)۔ چنانچہ ایک لطیفہ عرض ہے۔ جمیل مہدی مرحوم، ایڈیٹر عزائم، لکھنؤ میں وارد ہونے

کے بعد بزمِ شعراء کی ایک نشست میں شریک تھے اور اس وقت تک مجھے پہچانتے نہ تھے۔ میں جب شعر سنا رہا تھا تو انھوں نے عمر انصاری مرحوم سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں جو اپنے اچھے اشعار کو بری طرح پڑھ کے برباد کر رہے ہیں۔ (یہ واقعہ عمر انصاری نے مجھ سے بیان کیا تھا)۔ میں ترنم سے بھی شعر پڑھ سکتا تھا لیکن کبھی نہ پڑھے اور تحت میں پڑھنے کا انداز ٹھیک نہ تھا۔ اس کے باوجود بھی مجھے کچھ عوامی مشاعروں میں جانا پڑتا تھا جن میں مدراس کے پنجاب ایسوسی ایشن کے مشاعرے بھی شامل تھے۔ میرے بچپن تک ایسے عوامی مشاعرے جن میں سامعین محض جاہل اور اُردو نابلد ہوتے ہیں اور محض خوش نوائی سے محظوظ ہونے آتے ہیں، وجود میں نہ آئے تھے۔ اس قسم کے سامعین نے مشاعروں کو ادبی محفلوں کے بجائے کلچرل اجتماعات بنا دیا جس میں طوائفوں کی جگہ خوش گلو شاعروں نے لے لی اور وہی پسندیدۂ عوام ہو گئے۔ جب ان کی مانگ بڑھی تو ان کی فیس بھی مقرر ہونے لگی۔ مشاعروں میں بھی اکنامکس کا قانون ''گریشم لا'' نافذ ہو گیا یعنی خراب کرنسی اچھی کرنسی کو بازار سے باہر کر دیتی ہے۔ یہی حال مشاعروں کا ہوا۔ ترنم سے پڑھنے والوں کا بول بالا ہوا جن میں متشاعر اکثر دوسروں کے شعر پڑھا کرتے تھے اور اصل شعر کہنے والے ٹاٹ باہر ہو گئے۔ ابتدا میں مشاعروں میں شرکت کرنے کے لیے شعراء کرایہ تک لینا معیوب سمجھتے تھے لیکن اس دور میں باقاعدہ سودے بازی ہونے لگی۔ اس بدعت کا آغاز جہاں تک مجھے علم ہے جگر مرادآبادی مرحوم نے کیا۔ غریب شعراء پھر بھی قابلِ درگذر تھے اور ہیں لیکن خوشحال اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے بھی پیشہ کرنے لگے اور استادوں کی سب سے اونچی صف نشینوں کے لیے باعثِ ننگ بن گئے۔ ان پیشہ وروں کے باقاعدہ گروہ بن گئے اور میلے ٹھیلے کے عوامی مشاعروں میں جن میں سامعین عموماً اُردو نابلد ہوتے ہیں، ان کی شرکت مشاعروں کی کامیابی کی ضامن بن جاتی ہے۔ میں ایسے مشاعرے باز شاعروں سے بھی

واقف ہوں جو دوسروں سے شعر کہلوا کر مشاعروں میں گا تے ہیں اور واپسی پر ملنے والی رقم شعر کہنے والوں اور شعر پڑھنے والوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی شاعروں میں کچھ بین الاقوامی شہرت کے مالک بھی ہیں۔ لیکن میں ان کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔ ایک عوامی مشاعرے میں جس میں بدقسمتی سے میں بھی شریک تھا، کانپور کے مستند استاد شاعر کوثر جائسی اور ان کے بیٹے کمالؔ بھی مدعو تھے۔ کوثرؔ نے ایک استادانہ غزل جو کئی بحروں میں پڑھی جا سکتی تھی، سنائی اور ہوٹ ہو گئے۔ کمالؔ نے ایک ہلکی پھلکی غزل گا دی اور مشاعرہ لوٹ لیا۔ (ایسے مشاعروں میں میں ''پروفیسر'' اور ''ڈاکٹر'' کے الفاظ اپنے نام کے ساتھ لگے ہونے کی وجہ سے ہوٹنگ سے بچ جایا کرتا تھا)۔ ان پیشہ ور گویّے شاعروں کے ساتھ ساتھ رونقِ محفل بڑھانے کے لیے کچھ شاعرات بھی وجود میں آگئیں جن میں زیادہ تر کسی نہ کسی شاعر کے ساتھ بطورِ شاگرد آویزاں رہتی تھیں۔ پیشہ ور مشاعرہ کرانے والے بھی وجود میں آ گئے۔ ان میں کچھ تو ایسے تھے جو عوامی چندہ اصول کر کے مشاعرے کراتے تھے لیکن زیادہ تر وہ تھے اور ہیں جو اُردو کے خدمتگار کی حیثیت سے حکومتوں سے استمراری طور پر لاکھوں روپیہ وصول کر کے اپنی خدمت کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اچھے اچھے شاعر اِن اردو فروشوں کے سامنے گڑگڑایا کرتے ہیں۔ ان گلو باز شاعروں سے البتّہ ایک فائدہ یہ ضرور ہے کہ اُردو کا رشتہ ان لوگوں سے بھی قائم ہے جو اس سے نابلد ہیں۔

میں پھر کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ بات کرنا تھی مجھے صرف اپنی اور ذکر لے بیٹھا عوامی مشاعروں اور پیشہ ور شاعروں کا۔ اپنی شاعری کے اس دوسرے دور میں یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو کے ساتھ ساتھ میں نے فارسی زبان میں بھی شعر کہنا شروع کر دیئے تھے لیکن مجھے انہیں کسی واقعی فارسی داں کے سامنے پیش کرنے کی ہمّت نہ ہوتی تھی اور وہ عموماً ضائع ہو جاتے تھے۔ یہی

کچھ حال اردو شاعری کا تھا۔ اس وقت تک میری شاعری صرف غزل تک محدود تھی۔ یہ تعلّی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اس دور میں بھی مجھے اردو کے بہ نسبت فارسی زبان میں شعر کہنا آسان معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ اس میں نہ تذکیر و تانیث کا مسئلہ ہوتا ہے اور نہ حروف عطف کا چکر۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران کبھی کبھی شعبۂ اردو میں بھی شعر خوانی ہوتی تھی۔ میرے علاوہ خود ہاشمی صاحب اور عبدالاحد خان خلیل صاحب بھی شعر کہتے تھے۔ اس وقت نورالحسن ہاشمی صاحب نے یہ محسوس کیا کہ میں مشکل زمینوں میں آسانی سے شعر کہہ لیتا تھا اور اس طرف انھوں نے میری توجہ مبذول کرائی اور اپنے اشعار کو ضائع ہونے سے بچانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ کاغذ کے پرزوں کے بجائے اب میں نے ایک ڈائری پر اپنی غزلیات لکھنا شروع کیں۔ اس وقت لکھنؤ کے تمام شعراء سے جن میں عموماً زیادہ تر مجھ سے عمر میں بڑے تھے میری دوستی تھی۔ میرے مکان کے باہر وکٹوریہ اسٹریٹ (اب تلسی داس مارگ) پر کاظم صاحب کا چائے خانہ تھا۔ اس کے آگے بہت کافی چوڑا فٹ پاتھ تھا۔ کاظم صاحب کا یہ چائے خانہ مغربی لکھنؤ کے شعراء کا مرکز تھا۔ دن کے علاوہ شام کو فٹ پاتھ پر کرسیاں ڈال دی جاتی تھیں اور علاقے کے شاعر جمع ہونے لگتے تھے۔ کاظم ہوٹل سے تھوڑے جنوب میں موجودہ شیعہ کالج کے سامنے حیدر رضا کا چائے خانہ تھا۔ وہ خود شعر کہتے تھے اور رضاؔ تخلص کرتے تھے اور میرے اچھے شناسا تھے۔ ان کا چائے خانہ بھی شاعروں کا مرکز تھا لیکن ان کے مشرقی پاکستان جانے کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

کاظم ہوٹل میں شام کو مستقل آنے والوں میں سراجؔ لکھنوی، سالکؔ لکھنوی، نہال رضوی، شاربؔ لکھنوی، ماہرؔ لکھنوی وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ کبھی کبھی منظرؔ لکھنوی، شفقؔ شاہانی وغیرہ بھی آجاتے تھے۔ سید نواب افسرؔ صاحب کی امین آباد میں کتابوں کی دوکان تھی۔ جمعرات کو دوکان بند ہوتی تھی اور وہ بھی آجایا کرتے تھے۔ ان حضرات کے علاوہ ایک عجیب وغریب

شخصیت بھی وہاں نظر آتی تھی۔ ان کا نام تھا رضیؔ اور سر اور گردن میں بیسوں تسبیحیں ڈالے رہتے تھے جس کی وجہ سے انھیں شاعرِ تسبیح پیکر کہا جاتا تھا۔ کھیل سے جب فرصت ہوتی تھی تو میں بھی اس گروہ میں شامل ہو جاتا تھا۔ اس وقت حال یہ تھا کہ جب بھی کسی دوسری یونیورسٹی کا میرا کوئی مہمان آ جاتا تھا تو پندرہ منٹ میں نشست کا انتظام ہو جایا کرتا تھا۔ متذکرۂ بالا شاعروں کے علاوہ ان سے نسبتاً کم عمر شاعر بھی لکھنؤ کی شاعرانہ فضا پر چھانے لگے تھے۔ ان میں کرشن بہاری نورؔ، حیات وارثی، تسنیمؔ فاروقی، بشیرؔ فاروقی، ساحرؔ لکھنوی وغیرہ تھے۔ شہر میں شعری نشستوں کا مسلسل انعقاد ہوتا رہتا تھا جس میں یہ تمام حضرات دل کھول کر حصّہ لیا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے اسٹاف کلب میں بھی مختلف خاص موقعوں پر ایسی نشستیں ہوتی تھیں جن کا انتظام عموماً مجھے سونپا جاتا تھا اور شہر کا ہر شاعر ان میں شرکت کرنا باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ مشرقی لکھنؤ میں عمرؔ انصاری کا ڈرائنگ روم شعراء کی نشست گاہ اور نسیم صاحب کا دانش محل ادباء کا سنٹر بنا رہتا تھا۔ بعد میں لکھنؤ آ کر یہاں آباد ہونے والوں میں عرفانؔ صدیقی اور محسنؔ زیدی کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ دونوں حضرات بھی مجھے بڑے بھائی کی طرح سمجھتے تھے۔ اس عہد میں لکھنؤ کے متذکرۂ بالا شعراء کے علاوہ کچھ بیرونی شعراء سے بھی میرے تعلقات بہت گہرے تھے۔ باہر کے بعض خوش لحن شعراء میں ایازؔ جھانسوی، وسیمؔ بریلوی، کمالؔ جائسی وغیرہ کا لکھنؤ میں قیام میرے ہی مکان پر ہوتا تھا۔ کیفیؔ اعظمی، نشورؔ واحدی، کوثرؔ جائسی اور نازشؔ پرتاپ گڑھی وغیرہ سے میرے دوستانہ تعلقات تھے اور آخر میں مجروحؔ سلطانپوری میرے بہت ہی قریبی دوست ہو گئے تھے لیکن بقول ان کے ہم لوگ بہت دیر میں ملے۔ اب ان میں سے زیادہ تر ختم ہو چکے ہیں اور لکھنوی شاعروں میں صرف تسنیمؔ فاروقی اور بشیرؔ فاروقی اور باہر والوں میں صرف وسیمؔ بریلوی اور کمالؔ جائسی باقی بچے ہیں۔ خدا انھیں عمرِ دراز عطا فرمائے۔

اپنی شعری برادری کے متذکرۂ بالا دوستوں کے علاوہ کچھ دوسرے حضرات کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں ۔ ان تمام حضرات کا تعلق سرکاری ملازمت کے اعلیٰ عہدوں سے تھا۔ شاید کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ بزمِ شعراء کی بنیاد ڈالنے والے یہی حضرات تھے اور ان میں سب سے پہلا نام مرحوم سید صدیق حسن آئی۔سی۔ایس کا ہے۔ موصوف بہت اچھا شعر کہتے تھے لیکن ان کا کوئی مجموعۂ کلام نہ شائع ہو سکا۔ جس کے کئی اسباب بتائے جاتے ہیں۔ انھیں کے ساتھی حبیب احمد صدیقی، آئی۔اے۔ایس انتہائی پختہ مشق شاعر تھے جو پاکستان چلے گئے۔ تیسرے آئی۔اے۔ایس افسر ذوالنورین صاحب تھے۔ ان کی مشق سخن بھی کامل تھی۔ ان حضرات کے بعد والے آئی۔اے۔ایس شاعروں میں سید حامد اور سید اطہر حسین صاحبان قابلِ ذکر ہیں۔ سید حامد صاحت رٹائر ہو کر ہمہ تن قومی خدمات میں مصروف ہیں اور اس وقت جامعہ ہمدرد کے چانسلر ہیں۔ اطہر حسین صاحب نے شاعری بہت بعد کو شروع کی لیکن کئی مجموعوں کے مصنّف ہو گئے۔ عرصہ ہوا وفات پا گئے۔ موجودہ دور میں انیسؔ انصاری اور عنبرؔ بہرائچی افسروں کے طبقے کی اُردو شاعری میں نمائندگی کر رہے ہیں۔ بزمِ شعراء نے اعلیٰ درجے کے سامعین کا بھی ایک طبقہ پیدا کر دیا جس میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے اساتذہ کے علاوہ غلام حسین آئی۔اے۔ ایس، سبطین آئی۔ایف۔ایس اور ڈاکٹر رضوی صاحبان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو کے خاتمے کے ساتھ ساتھ شاعروں کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ جو شاعر چلا جاتا ہے اس کی جگہ خالی رہ جاتی ہے پھر بھی کچھ لوگ ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں نسیمؔ اختر صدیقی، کیفؔ رضوی، سعیدؔ اختر نظامی، معراجؔ ساحل، راہیؔ پرتاپ گڑھی، معراجؔ فیض آبادی قابلِ ذکر ہیں اور میرے خاص کرم فرما ہیں۔ سلّی گوڑی سے یہ امید لے کر آیا تھا کہ یہاں کی علمی اور شاعرانہ فضا میں احساس تنہائی دور ہو جائے گا لیکن جن سے ملنے کی امیدیں لے کر آیا تھا وہ تو

جا چکے۔ عمر انصاری باقی رہ گئے تھے وہ بھی روانہ ہوگئے۔ سبطِ محمد نقوی صاحبِ قلم اور میرے خاص کرم فرما تھے۔ وہ بھی گئے۔ عنایت زید پوری میرا بیحد خیال کرنے والے تھے۔ وہ ان دونوں سے پہلے ہی روانہ ہوگئے۔ عثمان غنی مثل میرے چھوٹے بھائی کے تھے۔ چند روز قبل کینسر کا شکار ہو کر وہ بھی چلے گئے۔ علی جواد زیدی سے میرا رشتۂ اخوت تھا۔ وہ ان سبھوں سے پہلے گئے۔ عرفان اور محسن بھی کینسر کا شکار ہوگئے۔ میں جیسا تنہا سلّی گوڑی میں تھا ویسا ہی تنہا لکھنؤ میں ہوں۔ دو چار غیر ادبی دوست موجود ہیں لیکن ان سے بھی ملاقات نہیں ہوتی۔ چھوٹے مخلصوں میں پروفیسر فدا عباس، ڈاکٹر احسن الظفر اور پروفیسر نیر مسعود ہیں لیکن آخر الذکر اس حالت میں ہیں کہ بغیر چھڑی کے چند قدم بھی نہیں چل سکتے۔ ان استادوں کے علاوہ کچھ دوسرے حضرات کا ذکر کرنا بھی مناسب ہے۔ ان میں چودھری شرف الدین خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے دولت خانہ کا دروازہ ہمیشہ شعری نشستوں کے لیے کھلا رہتا ہے اور انجمنِ ترقی اُردو بھی لکھنؤ میں انھیں کے دم سے فعّال ہے۔ ارم اسکولوں کے مالک خواجہ یونس جو میرے شاگرد بھی رہ چکے ہیں اردو کی خدمت کے سلسلے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اسی طرح چودھری عبد الستار بیدلؔ اور معراجؔ ساحل شعر گوئی کے علاوہ بزمِ صفی اور بزمِ شمس کی ماہانہ نشستیں منعقد کر کے شعر کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حیات اللہ صاحب کی بہو بیگم شہناز سِدرت ان کے اردو مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

میرے اُردو کلام کا پہلا مجموعہ غزالانِ خیال کے نام سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ قدیم دیوانوں کے الفبائی انداز میں ترتیب دیا گیا تھا اور تمامتر غزلیات پر مشتمل ہے۔ آخری میں کچھ فارسی کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ میرا دوسرا مجموعۂ کلام، فروغِ شعلۂ دل کے عنوان سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرے کشمیر کے چکّر لگا کرتے تھے اور ہر سفر کے دوران کشمیر سے متعلق کوئی نظم کہا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں مجھے اندازہ ہوا کہ میری شعر گوئی کا اصل میدان نظم ہے نہ

کہ غزل اور اسی خیال کا اعادہ برادرِ محترم علی جواد زیدی صاحب نے بھی اس کے پیشِ لفظ میں کیا ہے
۔ چنانچہ فروغِ شعلۂ دل تقریباً تمام کشمیریات کے علاوہ دوسری نظموں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے
کے آخر میں بھی فارسی نظموں کے اُردو منظوم ترجمے شامل ہیں۔ تیسرا مجموعہ شاہدانِ معانی، جو تمام تر
غزلیات پر مشتمل ہے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں بھی فارسی اشعار کے تراجم ہیں۔
چوتھا مجموعہ نعتوں اور تاریخوں پر مشتمل ہے اور ۱۹۸۹ء میں گلزار کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔
پانچواں مجموعہ نقوش زیبا ہے جو تمام تر اُردو غزلوں پر مشتمل ہے اور ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ اُردو کلام کا
چھٹا اور آخری مجموعہ کہکشاں کے عنوان سے حال ہی میں ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا ہے اور شاید میرے
اُردو کلام کا آخری مجموعہ ہو۔ یہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ (۱)۔ حمد و نعت و
منقبت (۲)۔ غزلیاتِ طبع زاد (۳)۔ اساتذہ کی زمینوں میں غزلیں (۴)۔ طبع زاد نظمیں
(۵)۔ اردو نظموں کے فارسی اور فارسی نظموں کے اُردو ترجمے (۶)۔ تاریخہائے وفات (۷)۔
اضافات جو مجموعہ کے ترتیب دینے کے بعد کی نظموں پر مشتمل ہے۔

ان مجموعوں کے علاوہ ابتدائی دور میں میرے بزرگ اور آخری دور میں انتہائی بے
تکلف دوست صباح الدین عمر اور علی جواد زیدی صاحبان میرے انتہائی سنجیدگی سے کہے ہوئے
کچھ غیر سنجیدہ کلام کو جمع کر کے میری مرضی کے خلاف اَنفاسِ گرم کے نام سے شائع کرنا چاہتے
تھے لیکن موت نے ان دونوں کو اِس کی فرصت نہ دی۔ صباح الدین صاحب کے ترتیب دیئے
ہوئے اور اس پر علی جواد صاحب کے پیشِ لفظ کے ساتھ اس مجموعے کا مسودہ صباح الدین
صاحب اور خود میرے بھی ایک دوست محمود علی رضوی صاحب کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور انہوں
نے میری مرضی کے خلاف اسے شائع کرا دیا۔ یہ مجموعہ انتہائی طولانی نظموں ہجویات اور ایک
شاعرانہ معرکہ کی نظموں پر مشتمل ہے جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ اس طرح یہ میرے اردو کلام کا

ساتواں مجموعہ ہے۔اردو کلام کے ان مجموعوں کے علاوہ میرے فارسی کلام کے بھی تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ شعلۂ ادراک کے نام سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔اس میں مختلف اقسامِ نظم مثلاً غزل، رباعی، قطعہ، قصیدہ اور جدید نظمیں شامل ہیں۔اس کی ترتیب کے سلسلہ میں کہیں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ اس کی اشاعت میں دوستِ محترم کے۔کے۔بخشی۔آئی۔اے۔ ایس کی ہمّت افزائی شامل تھی۔ موصوف ایک بہت بڑے آئی۔اے۔ایس افسر ہونے کے باوجود مطالعہ کے بیحد شوقین ہیں۔ فارسی سے ان کو عشق ہے اور یہی بات انھیں میرے قریب لائی۔اب رٹائر ہو کر اپنے وطن کلکتہ میں مقیم ہیں۔ دوسرا مجموعہ خرمنِ گل کے عنوان سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا۔اصل میں یہ تاریخوں کا مجموعہ ہے جس میں کچھ غزلیں بھی شامل ہیں۔تیسرا مجموعہ شبچراغ کے عنوان سے حال ہی یعنی ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا ہے اور غزلوں کے علاوہ مختلف قسم کی نظموں پر مشتمل ہے۔ میرے دو ابتدائی مجموعوں میں شامل منظومات کا ایک انتخاب ایران کلچرل ہاؤس سے شائع ہو چکا ہے اور وہاں سے نکلنے والے رسالے قند پارسی کے تقریباً ہر شمارے میں میری کوئی نہ کوئی نظم شائع ہوتی رہتی ہے۔اس کے علاوہ معارف، اعظم گڑھ اور ایرانی رسائل میں بھی میرے منظومات شائع ہوتے رہتے ہیں۔فارسی کلام کی اشاعت کے سلسلے میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ اس کا سلسلہ میرے عزیز شاگرد ڈاکٹر رئیس نعمانی کے رسالہ عبارت سے شروع ہوا تھا۔ان مطبوعہ مجموعوں میں شامل اشعار کے علاوہ مختلف موقعوں پر میری دو بیاضیں کھو گئیں۔ان میں ایک میرے ڈرائنگ روم سے غائب ہوئی اور دوسری یونیورسٹی سے واپسی کے وقت میرے ہمکار شجاعت علی سندیلوی صاحب کی تھوڑی سی بے توجہی کی وجہ سے مع اس تھیلے کے جس میں وہ رکھی تھی کہیں راستے میں گر گئی۔

اپنی شاعری کے بارے میں ایک بات اور عرض کر دوں۔ مجھے کسی معاصر شاعر کے

سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ میرے اساتذہ سعدیؔ، حافظؔ، عرفیؔ، نظیریؔ میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، اور ڈاکٹر اقبالؔ وغیرہ ہیں۔ میں نے ان سبھوں کے کلام کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس سے بہت کچھ سیکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مَیں نے ان شعراء کی غزلوں کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ یہ مقابلہ کی نیت سے نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد انھیں نذرانۂ عقیدت پیش کرنا ہے۔ میں نے کسی کو باقاعدہ شاگرد بھی نہیں بنایا پھر بھی جو حضرات مجھ سے مشورہ کرنے آتے ہیں ان کی مدد کرنے سے دریغ بھی نہیں کرتا۔ ایسے حضرات لکھنؤ اور ہندوستان کے باہر کے بھی رہ چکے ہیں۔ لکھنؤ کے شاعروں میں مجھ سے سینئر اور عمر میں زیادہ صرف عمر انصاریؔ تھے لیکن وہ بھی سال گذشتہ خدا کو پیارے ہوگئے۔ لے دے کر میرے برابر والوں میں عبدالستار بیدلؔ رہ گئے ہیں جن کا اصل کارنامہ بزمِ صفی کو چلانا ہے۔ صفیؔ کا لکھنوی شاعری پر احسان ہے اور بیدلؔ کا صفیؔ پر احسان ہے کہ ان کے نام کو مدّت سے زندہ کئے ہوئے ہیں۔

۱۸/ اپریل ۲۰۰۰ء کو میری زندگی کے رتھ کا ایک پہیہ ٹوٹ گیا اور صرف ایک نیم شکستہ پہیے سے اسے بنگلور سے سلّی گوڑی اور وہاں سے لکھنو تک گھسیٹتا پھر رہا ہوں۔ غالبؔ اسی عالم میں چیخ اٹھے تھے

''اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے''

اور مجھے برابر اپنا یہ شعر یاد آتا رہتا ہے۔

تسمہ پا بن کے ہے تو کب سے مسلّط مجھ پر

زندگی، اب تو بہت تھک گئے شانے میرے

اس عالم میں اگر زندہ رہنے کا کوئی سہارا ہے تو وہ شعر ہے، جو خواہ خود اپنا کلام ہو یا کسی دوسرے کا۔ میرے آخری مجموعۂ کہکشاں میں زیادہ تر وہ غزلیں اور نظمیں ہیں جو اسی جلاوطنی کے

زمانے میں عالمِ تنہائی میں کہی گئیں ہیں۔

اپنے شعر کے تصوّر کو غزالانِ خیال اور شعلۂ ادراک کے دیباچوں میں بیان کر چکا ہوں۔ غزل عشق و محبت کی داستان ہوا کرتی تھی لیکن اب اس میں زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے پھر بھی غزل کے اشعار کے مضامین محدود ہیں اور یہ کہنا محض نادانی ہے کہ غزل کے اشعار میں نئے مضمون پیش کیے گئے اس لیے کہ ہمیں علم ہو یا نہ ہو ہر مضمون ہم سے پہلے کوئی نہ کوئی شاعر ادا کر چکا ہے۔ نظم میں البتہ یہ بات نہیں ہے۔ ہر نظم شاعر کی اپنی ہوتی ہے جس پر کسی دوسرے شاعر کا اثر تو پڑ سکتا ہے لیکن اس کا توارد نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے نظم ایک وسیع تر صنف سخن ہے۔ لیکن اس سے غزل کی اہمیت پر اثر نہیں پڑتا۔ غزل کا شعر عموماً دل کی آواز ہوتا ہے جو دل تک پہنچ جاتا ہے یا اگر وہ دماغ کی پیداوار ہوتا ہے تو دوسرے دماغ کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ نثر بھی نظم ہی کی طرح اہم صنفِ ادب ہے اور کسی کو خود کو ادیب لکھوانے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ شعر کے میدان میں بھی قدم رکھے۔ نثر پر مشق کے ذریعہ قدرت حاصل کی جا سکتی ہے لیکن نظم کہنے کے لیے فطری موزونیتِ طبع ضروری ہوتی ہے اور جسے یہ نعمت ودِیعت نہیں ہوتی اسے زبردستی شاعر بننے کی کوشش میں ادب پر شبخون نہ مارنا چاہئے اور نثر کے میدان میں اپنی جولانیِ طبع کے جوہر دکھانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ یہاں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ نظم اور شعر کو ایک چیز نہ سمجھ لینا چاہئے۔ شعر دلی یا دماغی کیفیتوں کے شاعرانہ خوبصورت انداز میں اظہار کا نام ہے۔ اسے نثر میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور نظم میں بھی لیکن نظم ایک ایسا فن ہے جس کے خاص اصول ہیں جن میں میرے نزدیک وزن سب سے ضروری ہے اور وہی نظم کو نثر سے ممیّز کرتا ہے۔ میرے خیال میں نظم کے لیے مصرعوں میں ارکین کی برابری بھی ضروری نہیں ہوتی۔ اگر کسی مصرعے میں ایک رکن کی کمی کے باوجود مطلب پورا ہو جاتا ہے تو محض مصرعوں کو برابر کرنے کے لیے غیر ضروری الفاظ کا

اضافہ لازمی نہ ہونا چاہیے۔ ویسے ایک قادر الکلام شاعر کو اس کی ضرورت پیش نہیں آتی اور برابر کے ارکین کے ساتھ بغیر غیر ضروری الفاظ کو شامل کیے ہوئے بھی وہ اپنے خیالات کو ادا کر سکتا ہے۔ قصیدہ و غزل وغیرہ میں میں بحر کے ساتھ ردیف و قوافی کو بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ شعر، خصوصاً غزل کے اشعار اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اور یہ موسیقی مصرعوں میں مناسب الفاظ کے صحیح استعمال کے ساتھ ساتھ ردیف و قوافی کی تکرار سے بھی پیدا ہوتی ہے اور فارسی ناقدوں نے اسے موسیقیِ کناری کے نام سے یاد کیا ہے۔ اسی موسیقیت کے سلسلہ میں زحافات کے ذریعہ بحروں کو تبدیل کر کے فارسی اور اردو نظموں کے لیے مترنّم بنالیا گیا ہے۔ ردیف و قوافی غزل و قصیدے کے علاوہ رباعی اور مخمس، مسدس و مسمّط وغیرہ اصناف نظم میں بھی زور کلام اور نغمگی پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ میں نثری شعر کا قائل ہوں لیکن نثری نظم کی اصطلاح کو بے معنی سمجھتا ہوں۔ نثر اور نظم ادب کی الگ الگ شکلیں ہیں جن کو ایک نہیں بنایا جا سکتا۔ ان دونوں اصناف کے الگ الگ قوائد ہیں جن کی یکجائی ادب کی کسی نئی قسم کو وجود میں نہیں لا سکتی۔ ضروری نہیں کہ ہر ادبی تخلیق کو نظم کا نام دیا جائے۔ نثر بھی اتنی ہی اہم صنف ہوتی ہے جتنی نظم۔ اس لیے مناسب نہیں کہ اس کے جملوں کے ٹکڑے کر کے انھیں مصرعوں کی طرح لکھ کر ان پر نظم کا لیبل لگا دیا جائے۔

ادبی اصناف میں، خواہ وہ غزل ہو یا نظم کی کوئی دوسری قسم ہو یا نثر، میں ایسے ابہام کا قائل نہیں ہوں، جو مفہوم کی ادائیگی میں حائل ہوتا ہو۔ اگر شاعر یا افسانہ نگار اپنے خیالات کو اس طرح نہیں ادا کرتا کہ ایک اوسط درجے کی ذہنی صلاحیت رکھنے والا ان کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر ہو، تو میں اسے اس فنکار کی ناکامی سمجھوں گا۔ اس حیثیت سے میں ابلاغ کو ادب، خصوصاً شعر کے لیے، ضروری سمجھتا ہوں اور دنیا کے ہر عظیم ادبی شہپارے میں مفاہیم کو بالکل صاف انداز میں بغیر کسی ابہام کے پیش کیا گیا ہے۔

اُردو ہندی زبانوں کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہوں گا۔ جیسا کہ ہر علم دوست جانتا ہے، فورٹ ولیم کالج کے پہلے ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہندوی یا ہندی کہلاتی تھی اور یہ زبان دیوناگری اور فارسی دونوں رسومِ خط میں لکھی جاتی تھی۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ کی کوششوں سے اس کالج مس اس عام فہم زبان کو رسم الخط کی بنیاد پر دو مختلف زبانوں میں تقسیم کردیا گیا۔ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی زبان میں سرمایہ الفاظ سنسکرت سے حاصل کیا جانے لگا اور اسے ہندی کا نام دیا گیا اور فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی زبان ریختہ یا اردو کہلائی اور اس میں فارسی، ترکی، عربی وغیرہ زبانوں سے استفادہ کیا جانے لگا۔ میرے خیال میں ان دنوں زبانوں میں جن کی بنیاد ایک ہے کسی قسم کی رقابت نہ ہونا چاہیے۔ ایک مثال کے ذریعہ میں اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ آپ نے حلوائیوں کی دوکان پر دیکھا ہوگا کہ ایک بڑے کڑھاؤ میں لبالب بھرا ہوا دودھ پکتا رہتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کی سطح پر بالائی جمتی رہتی ہے اور ایک منزل وہ آجاتی ہے جب یہ بالائی کافی موٹی ہوجاتی ہے اور حلوائی اسے دودھ پر سے اتار کر تھال میں سجا دیتا ہے۔ یہ بالائی جب تک کڑھاؤ میں دودھ کی سطح پر تھی اس وقت تک وہ دودھ کا حصّہ تھی لیکن جب وہ دودھ پر سے اتار کر تھال میں سجادی گئی تو اس کا رشتہ دودھ سے منقطع ہوگیا اور اس کا اپنا الگ وجود قائم ہوگیا جو کڑھاؤ میں بچے ہوئے دودھ سے مقدار میں بہت کم تھی لیکن اس میں دودھ کی تمام لطافت کھنچ کر آگئی۔ میرے خیال میں یہی تعلق اُردو اور ہندی میں ہے۔ ہندی بڑے کڑھاؤ میں پکتا ہوا دودھ ہے جس پر اردو کی بالائی رفتہ رفتہ جمتی رہتی ہے اور فورٹ ولیم کالج کا وجود وہ وقت ہے جب ہندی کے اس دودھ پر جمی ہوئی اُردو کی بالائی کو تھال میں الگ سے سجادیا گیا۔ اس لحاظ سے اُردو کی حیثیت عظیم زبان ہندی کی خوبصورت بیٹی کی ہے اور ماں اور بیٹی میں کبھی رقابت یا تنفر ہو ہی نہیں سکتا۔ کاش ہندی اور اُردو کے پر جوش حامی اس نکتے کو سمجھ لیں۔

انیسواں باب

میرا مذہب اور سماجی سرگرمیاں

دہر ہے وہ انجمن جس میں ہے مذہب چراغ
اور بڑھے نور اگر مل کے جلیں سب چراغ

مذہب انسان کو انسانیت کی تعلیم دینے کے لیے وجود میں آیا لہٰذا اس کا اولین مقصد انسانوں میں بھائی چارہ پیدا کرنا ہے اور اس معنی میں اقبال سے لفظ بلفظ متفق ہوں کہ۔

''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا''

میں اسی مذہب کا پیرو ہوں جس کی تکمیل کا اعلان رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جبلِ رحمت پر فرمادیا تھا اور یہ دین دینِ ابراہیمی کی ایک تجدیدی شکل تھی اور دین ابراہیمی وہی تھا جس کے پہلے پیغمبر آدم علیہ السلام تھے اور جوان کی مناسبت سے دین آدم یا دینِ انسانیت کہا جاسکتا ہے اور جسے عرفِ عام میں مذہبِ اسلام کہا جاتا ہے اور جس کا مقصد انسان کو دنیا میں شائستگی کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھانا ہے۔ جہاں تک میں نے اس دین کو سمجھا ہے اس کی بنیادی تعلیمات میں اقرارِ وحدانیت ورسالت اور آخرت کے ساتھ حقوقِ عباد کی ادائیگی پر خاص زور دیا گیا ہے۔ میرے اس عقیدے کو اپنے تعلیمی ادوار میں جو کچھ پڑھا اس سے مزید تقویت حاصل

ہوئی۔ غالباً آٹھویں جماعت میں میں نے ایک انگریزی سبق Abu bin Adham پڑھا تھا۔اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک روز مشہور صوفی بزرگ ابراہیم بن ادھم نے عالم رویا میں ایک فرشتے کو نورانی کتاب لیے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے فرشتے سے کتاب کے متعلق استفسار کیا جس کے جواب میں فرشتے نے بتایا کہ اس میں ان لوگوں کے نام درج ہیں جو خدا سے محبت کرتے ہیں۔ ابنِ ادہم نے دریافت کیا کہ کیا ان کا نام بھی کتاب میں ہے۔ فرشتے نے کتاب دیکھ کرنفی میں جواب دیا۔ ابراہیم نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ میری خدا سے محبت کامل نہ ہولیکن میں اس کے بندوں سے محبت کرتا ہوں۔ فرشتہ چلا گیا لیکن دوسرے روز وہ مع کتاب کے پھر ابراہیم کونظر آیا اور ابراہیم نے پھراس سے وہی سوال کئے اور اس مرتبہ جب فرشتے نے کتاب کھول کر دیکھا تو ابراہیم کا نام سرِ فہرست تھا۔ حقوقِ عباد کا میں یہی مطلب سمجھتا ہوں یعنی بندگانِ خدا سے محبت اور ضرورت کے وقت ان کے کام آنا۔ مذکورہ قصّہ کے علاوہ اسی زمانے میں ایک عیسائی مذہبی رہنما کارڈنل نیومین کا تحریر کردہ ایک سبق Character of a Gentleman بھی پڑھا تھا جس میں ایک شریف انسان کی دوسری خصوصیات کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جن باتوں پر اس کا خود اعتقاد نہ بھی ہو لیکن دوسرے اس پر اعتقاد رکھتے ہوں تو ان کا احترام کرنا بھی اس کا فرض ہوتا ہے۔ اسی تعلیم کی مشہور فارسی شاعر عرفیؔ شیرازی یوں تبلیغ کرتا ہے: ؎

از رنگ و بودو رم ولی در روضہ بہر باغبان
بایاسمن و رزم ادب، تعظیم شمشادش کنم

ان کے علاوہ آئندہ تعلیمی دور میں گلستاں اور بوستاں میں سعدی شیرازی کی بیان کردہ اور مثنویِ معنوی میں مولانا روم کی پیش کردہ حکایتوں نے اسلامی تعلیمات پر غور وخوض اور ان کے مطابق اپنے عقائد کی تشکیل میں میری کافی مدد کی۔ میرے خیال میں مومنین اور اہلِ اسلام ایک

ہی گروہ کا نام نہیں ہے۔ مسلمان، جیسا کہ کچھ آیات قرآنی سے ظاہر ہے، تو ہر وہ شخص ہے جو ارا کینِ اسلام کا ظاہری پیرو ہو لیکن مومن وہ ہے جو روحِ اسلام کو سمجھتا ہو اور اس کی زندگی اس کا عملی نمونہ ہو۔ میرے خیال میں کفر اسلام کی ضد نہیں بلکہ ایمان کی ضد ہے اور اس حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص روحِ اسلام کے مطابق زندگی بسر نہ کرتا ہو وہ مسلمان تو ہو سکتا ہے لیکن مومن نہیں کہلایا جا سکتا اور اگر وہ مومن نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ اس حیثیت سے میں مسلمان ضرور ہوں لیکن خود کو مومن کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کبھی بقولِ غالب یہ سمجھتا ہوں کہ: ''آخر گنہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں''، اور کبھی بقولِ اقبالؔ خود کو ''کافرِ ہندی'' سمجھنے لگتا ہوں اور کبھی مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اسلام کی تعلیمات پر صحیح طور سے عمل نہ کرنے کی وجہ سے خود کو گروہِ منافقین کا ایک فرد سمجھتا ہوں۔ بہرحال کچھ بھی ہوں رحمتِ خداوندی سے ناامید نہیں ہوں اس لیے کہ بقولِ جوشؔ کبھی یہ سمجھتا ہوں:

ڈر آگ کا، دوزخ کی سزا کچھ نہیں
یہ دغدغۂ روز جزا کچھ بھی نہیں
اللہ کو قہار بتانے والو
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ نہیں

اور گوشِ ہوش سے کبھی ابوسعید ابوالخیر کے الفاظ میں عالم لاہوت سے آتی ہوئی یہ آواز سنا کرتا ہوں:

باز آ، باز آ، ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی، باز آ
درگاہِ ما درگاہِ ناامیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی، باز آ

(جوشؔ کی رباعی کا پہلا مصرعہ اور ابوالخیر کی رباعی کا دوسرا مصرعہ بھول گیا ہوں، جسے خود میں نے موزوں کر دیا ہے)

خدا مجھے معاف فرمائے۔ حقوقِ عباد کو دین کا بنیادی رکن سمجھتے ہوئے میرے نزدیک

سب سے بڑا گناہ مردم آزاری اور سب سے بڑی عبادت بندگانِ خدا کی خدمت ہے ع:

''دل بدست آور کہ حجِ اکبر است''

میرے عقیدے کے مطابق اسلام نے ایک فطری زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی ہے۔ نظامِ قدرت بھی عجیب ہے۔ ایک کی بقا کا انحصار دوسرے کی فنا پر ہے۔ زمین کا خون چوس کر نباتات نمو پاتی ہے۔ نباتات کے وجود کو ختم کر کے چرندے پروان چڑھتے ہیں۔ درندوں کے وجود کے لیے چرندوں کی بقا کا خاتمہ ضروری ہے اور انسانی زندگی کا انحصار نباتات و حیوانات کی زندگی کے خاتمے پر منحصر ہے۔ اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے بہت سے ادیان میں ''جیو ہتیا'' گناہِ عظیم ہے۔ لیکن اس سے بچا بھی کیسے جا سکتا ہے؟ زندگی صرف کیڑے مکوڑوں اور جانوروں ہی میں نہیں ہوتی بلکہ نباتات میں بھی ہے۔ (اور کچھ حد تک جمادات میں بھی) اور ان کے وجود کو ختم کیے بغیر انسان اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ میرے خیال میں اسی وجہ سے مخلوق پر رحم کرنے کی تلقین کے باوجود ان کے وجود کو ختم کر کے اپنے وجود کو برقرار رکھنے سے اسلام نہیں روکتا۔ چنانچہ گوشت خوری کی اسی بنیاد پر اجازت ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ معدوں کو جانوروں کے قبرستان نہ بناؤ۔ اسی طرح تجرّد اور سنیاس بھی غیر فطری ہیں اور اسلام ان کی ہمت افزائی نہیں کرتا۔

روحِ اسلام کی پیروی کے ساتھ ساتھ اسلام کے ظاہری ارا کین کی پیروی کو بھی میں سماجی زندگی کے لیے ضروری خیال کرتا ہوں اور اسی کو برقرار رکھنے کے لیے شرع وجود میں آئی ہے جسے نظر انداز کرنے کا مطلب میرے خیال میں سوسائٹی کو ایک غیر فطری اور خلافِ انسانیت سمت کی طرف لے جانا ہے۔ اسلام میں زنا کاری ایک ایسا گناہ ہے جس کے لیے سخت سزا مقرر ہے لیکن اس کے ثابت کرنے کے لیے گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اور گواہ اسی وقت مل سکتے ہیں جب یہ فعل برسرِ عام کیا جائے جس کا مطلب سوسائٹی میں بے حیائی پھیلانا ہے۔ اس لیے

میرے خیال میں زنا کی جو سزا شرع نے مقرر کی ہے وہ گناہ کی نہیں بلکہ سوسائٹی میں گندگی پھیلانے کی ہے۔ گناہ کی سزا تو دینے والا قادرِ مطلق ہے۔

میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ میں اس اسلام کا پیرو ہوں جس کی رسول کی زندگی میں تکمیل کی بشارت خود قرآنِ مجید نے دی ہے اور جس کی تصدیق رسول اکرمؐ نے اپنے آخری خطبہ میں کر دی تھی۔ لہٰذا اسلام کے بنیادی اصولوں میں اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ اگر حیاتِ رسول کے بعد کسی کمی بیشی کو دین کا جز سمجھ لیا جائے تو اس کا مطلب رسول کے اعلان کی کہ دین مکمل ہو چکا تکذیب ہوگی اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو میرے خیال میں وہ اسلام کا پیرو نہیں رہ جاتا۔ پھر رسولِ مقبولؐ کی وفات کے بعد جو اختلافات رونما ہوئے ان کی کیا حیثیت ہے؟ اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ اسلام کئی معاملات میں دنیا کے دوسرے مذاہب سے مختلف ہے۔ دنیا کے زیادہ تر مذاہب وجود میں آنے کے بعد مقبولیت اور پھیلاؤ کے لیے حکمرانوں کے مرہونِ منّت رہے۔ بدھ مذہب اس وقت پھیلنا شروع ہوا جب مگدھ کی سلطنت کے ابتدائی حکمراں بمبی سار نے اس کی سرپرستی کی اور بعد کو اسی سلطنت کے ایک دوسرے خاندان کے حکمراں اشوک نے اسے قبول کر کے چین سے لے کر سری لنکا تک پہنچا دیا۔ کچھ یہی حال عیسائیت کا بھی رہا۔ اس مذہب کو بھی فروغ اس وقت حاصل ہوا جب رومن شہنشاہوں نے اسے قبول کر لیا اور زرتشتی مذہب بھی ہخامنشی اور ساسانی خاندانوں کے حکمرانوں کے ذریعہ سرا سر ایران میں پھیلا۔ اسلام کی حیثیت ان تمام مذاہب سے جداگانہ ہے۔ اس دینِ ابراہیمی کے دوبارہ رسول اکرمؐ کے ذریعہ وجود میں آنے کے فوراً بعد ایک نئی ریاست بھی وجود میں آ گئی اور بانیِ مذہب کے ساتھ ساتھ رسولِ خدا کی حیثیت مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کے سربراہ کی بھی ہو گئی۔ ہر ریاست کے انتظام کے سلسلے میں سیاست کا وجود میں آنا بھی ضروری ہوتا ہے اور ایسا ہی کچھ مدینہ کی

اسلامی ریاست کے سلسلے میں بھی ہوا۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''معصومیت'' کے متعلق بھی اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کردوں۔ اس آیت کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ اے رسول کہہ دیجیے کہ میں بھی تمہاری طرح عام انسان ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ جب ختم رسل کی یہ پوزیشن تھی تو دوسرے رسولوں اور نبیوں کی بھی یہی پوزیشن ہوگی یعنی وہ عام انسانوں کی طرح ہوں گے سوائے اس کے کہ ان پر وحی آتی ہو یا وہ صاحبِ شریعت رسولوں کے ادیان کے مبلغ ہوں۔ عصمتِ پیغمبران کے سلسلے میں میرا یہ خیال ہے کہ جہاں تک پیغمبری کی حیثیت کا تعلق ہے یقیناً ان سے غلطی سرزد نہیں ہوسکتی تھی۔ بالفاظِ دیگر وہ معصوم تھے۔ لیکن جہاں تک ان کی عام انسانی حیثیت کا تعلق ہے، نادانستہ طور سے کسی وقت ان سے غلطی ہو جانا فطرتِ بشری کے مطابق ہے۔ حضرت آدمؑ سے غلطی سرزد ہوئی لیکن وہ ان کے دنیا میں آنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ لیکن حضرت زکریاؑ کا واقعہ میری بات کی تائید کرتا ہے۔ دشمنوں سے بچنے کے لیے انھوں نے خدا کے بجائے درخت سے پناہ مانگی اور اس کی سزا میں انھیں درخت کے تنے کے ساتھ دونیم ہونا پڑا۔ حضرت موسیٰؑ اور قبطی کی قتل کی داستان بھی ظاہر کرتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی حمایت میں قبطی کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا وہ درست نہ تھا۔ ان چند جملوں کے بعد میں پھر اصل مضمون کی طرف راجع ہوتا ہوں۔ پیغمبر اور بانی مذہبِ اسلام کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کی ہر بات مرضیٔ الٰہی کے مطابق اور درست ہوتی تھی اور ان معاملات میں انھیں کسی سے مشورے کی ضرورت نہ تھی لیکن مدینہ کی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے نازک مواقع پر انھوں نے مشوروں کی ضرورت سمجھی چنانچہ جنگِ خندق کے موقع پر انھوں نے ساتھیوں سے مشورہ طلب کیا کہ دشمنوں سے کس طرح دفاع کیا جائے اور حضرتِ سلمان فارسی کے

مشورے کے مطابق خندق کھود کر دشمنوں کو روکا گیا۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو خدا مجھے معاف فرمائے۔

مسلمانوں میں اختلافات رسولِ مقبول ﷺ کی وفات کے بعد شروع ہوئے۔ جیسا عرض کیا جا چکا ہے، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق دین ان کی حیات میں مکمل ہو چکا تھا اس لیے ان اختلافات کے دینی ہونے کا سوال نہیں۔ پھر ان کی نوعیت کیا تھی؟ میرے خیال میں ان کا تعلق مدینہ کی ریاست کی سربراہی سے تھا، اس لحاظ سے ان کی حیثیت دینی کے بجائے محض سیاسی تھی اور سیاست میں اختلاف ضروری ہوتا ہے۔ ہمیں سیاست یا مذہبی پروپگنڈے سے ہٹ کر دین کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور اپنا وہی مذہب ظاہر کرنا چاہیے جس نام سے اسے رسول کی زندگی میں پکارا جاتا تھا یعنی اسلام اور صرف اسلام۔ یہاں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں ہر کلمہ گو کو مسلمان تسلیم کرتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ ایک غیر مسلم ابھی مسلمانوں کے درمیان آتا ہے اور خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اقرار کرتے ہوئے کلمۂ شہادت پڑھ لیتا ہے اور فوراً مر جاتا ہے اس حالت میں کہ اس نے اسلام کا کوئی رکن ادا نہیں کیا۔ تو کیا وہ مسلمان مرا یا کافر میرے خیال میں اس کو کافر کہنا کسی مسلک میں جائز نہیں۔

یہاں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں اسلام نے کبھی غیر مسلموں کے ساتھ خراب برتاؤ کو پسند نہیں کیا۔ قرآنِ کریم کا فرمان ہے کہ تمہارا دین تمہارے ساتھ اور ہمارا دین ہمارے ساتھ۔ جہاں تک مسلمانوں کی ریاست کا تعلق ہے، اس میں غیر مسلموں کو مسلمانوں سے کم حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ ریاست کے اخراجات برداشت کرنا اس کے ہر شہری کا فرض ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو زکات کی شکل میں ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا اور غیر مسلمانوں کو جزیہ کی شکل میں۔ یہ جزیہ دینے والے فوجی سروس سے آزاد ہوتے تھے اور ان کے جان و مال کی

حفاظت کی ذمہ داری حکومت کی ہوتی ہے اور اس لحاظ سے انھیں ذمّی کا نام دیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ بائی زنٹائن حکومت سے جنگ کے دوران ایسے مواقع آئے جب ایک مفتوحہ علاقہ جس پر جزیہ لگا دیا گیا تھا، اس کے دوبارہ دشمن کے ہاتھوں کے چلے جانے کا خطرہ پیدا ہوا۔ ان حالات میں جزیہ واپس کر دیا گیا۔ اسلامی ریاست میں دوسرے مذاہب کے مذہبی پیشواؤں کا احترام کیا جاتا ہے اور وہ بچوں، بوڑھوں اور ناداروں کی طرح جزیہ سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا احترام بھی اسلامی ریاست کے لیے ضروری ہے۔ اس کی ایک عملی مثال محض جذبۂ امن پسندی کے تحت خلیفہ وقت حضرت عمرؓ بیت المقدّس گئے اور صلح نامہ کی تحریر کے وقت جب نماز کا وقت آ گیا تو پادریوں کی پیش کش کے باوجود گرجے میں نماز پڑھنا اس خیال سے مناسب نہ سمجھا کہ کہیں جاہل سپاہی گرجے کو مسجد نہ بنا لیں۔

مختصراً میں خود کو جس مذہبِ اسلام کا پیرو سمجھتا ہوں اس میں مسلکی اختلافات کی مذہبی حیثیت کچھ نہیں ہے اور:

(۱) وہ وہی ہے جو رسول کی زندگی میں مکمل ہو گیا تھا اور رسولِ کریمؐ کی زندگی کے بعد جو کچھ واقعات پیش آئے انھیں اصل دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کو مسلمانوں کی سیاست یا مذہبی تبلیغ سے متعلق سمجھنا چاہیے۔

(۲) یہ مذہب عین فطرت کے مطابق ہے اور اس لحاظ سے ہمیشہ قابلِ عمل ہے۔

(۳) جو صلہ رحمی کے ساتھ اس کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ اگر پڑوسی کے گھر کے چولہے سے دھواں نہ اٹھ رہا ہو تو خود شکم سیر ہونا درست نہیں۔

(۴) جس میں بغیر مذہبی قید کے ہر پاشکستہ کی دستگیری کی ہمّت افزائی کی گئی ہے۔

(۵) جس میں ہر بے گناہ کے قتل کو تمام انسانیت کے قتل کا مترادف قرار دیا گیا ہے۔

(۶) امن پسندی، اور بقائے باہمی اور دوسرے مذاہب کا احترام اس کے اصولوں ہی میں شامل ہے۔

(۷) جس میں ہر جبر و جور کی مخالفت کا حکم دیا گیا ہے خواہ اس سلسلے میں ہتھیار ہی کیوں نہ اٹھانا پڑیں۔

(۸) اس مذہب پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس کی شرح کی پابندی بھی ضروری ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی روح کو سمجھنے کے لیے اس کے شرعی احکام پر غور و خوض بھی ضروری ہے تا کہ ان کی پشت پر جو حکمت ہے وہ سمجھ میں آسکے۔

وؔلی دنیا میں سب کے ساتھ یوں رہئے کہ پس از مرگ
ہو گنگا جل سے غسل اور صحنِ مسجد میں بنے مدفن

اپنے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے مواقع مجھے ابتدائی زندگی ہی سے ملتے رہے۔ جوبلی کالج کی ابتدائی تعلیم کے دوران ابا جانی (منظور چچا) مجھے جیب خرچ کے طور پر ایک آنہ روز دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں میرے ایک عزیز شیخ قمر الحسن جو عمر میں مجھ سے تقریباً ڈھائی سال بڑے تھے تعلیم کے سلسلے میں ہمارے گھر میں رہتے تھے۔ وہ بھی جوبلی کالج ہی میں پڑھتے تھے اور ہم دونوں ساتھ اسکول جایا کرتے تھے۔ جبلی کالج کی عمارت کی پشت پر سڑک کے کنارے ایک کوڑھی فقیر بیٹھا رہتا تھا۔ چچا سے ملنے والی اکنّی کا ایک پیسہ اس فقیر کا حصّہ ہوتا تھا اور ایک پیسہ میرے عزیز میاں قمر وصول کر لیتے تھے اور بقیہ دو پیسوں کا یا تو انٹرویل میں پھل فروش چندی سے ایک بڑا اسنترہ یا ایک تکونہ لے کر کھا لیا کرتا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ منظور چچا کو شکار کا بھی بہت شوق تھا اور کچھ بڑے ہو کر عموماً میں بھی ان کے ساتھ شکار کو جایا کرتا تھا اور کبھی کبھی خود بھی ان کی بندوق کو استعمال کر لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں غالباً، بی۔اے کا طالبعلم

تھا، میں ان کے ساتھ ان کی سسرال سدھور (ضلع بارہ بنکی) گیا۔ وہاں کچھ فریادی کاشتکار آئے کہ نیل گائے ان کی فصل برباد کر رہے ہیں۔ منظور چچا فوراً ان کے شکار کے لیے روانہ ہو گئے اور میں ان کے ساتھ ہولیا۔ کھیت میں نیل گائے چرتے ہوئے نظر آئے۔ منظور چچا نے ان پر فائر کر دیا اور ان میں سے ایک گر گیا۔ میں اسے ذبح کرنے کے لیے دوڑ کر اس کے پاس پہنچا اور جب اسے ذبح کرنے لگا تو اس کی نظروں میں وہ بے بسی دیکھی جسے بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے سوال کر رہا تھا کہ میرا قصور تو بتاتے جاؤ۔ وہ شکار کے سلسلے میں میرا آخری دن تھا۔ اب بھی بقرعید میں قربانی کے وقت اس کی آنکھیں میرے سامنے آجاتی ہیں اور میں قربانی کرنے سے خود کو معذور پاتا ہوں اگرچہ قربانی کی حکمت کا مفہوم بھی میری سمجھ میں آچکا ہے۔

بندگانِ خدا کی خدمت کا موقع بھی مجھے جلد مل گیا اور اس کا سلسلہ خود اپنے گھر سے شروع ہوا۔ تحریر کر چکا ہوں کہ کچھ حالات کی بنیاد پر میری پھوپھی کے خاندان کی دیکھ بھال میرے والد کی ذمہ داری قرار پائی تھی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ان کے انتقال کے بعد یہ فرض مجھے نبھانا تھا اور چار سال کے بعد منجھلے چچا کے انتقال کے بعد ان کے خاندان کی دیکھ بھال کی مزید ذمہ داری میرے سر آپڑی اور خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے اس امتحان میں کامیاب رہا اور آج میرے یہ سب بھائی بہن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میرے وطن لکھنؤ کے حالات کچھ ایسے رہے کہ میں خلاف انسانیت باتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیشہ مجبور رہا۔ شیعہ سنّی منافرت لکھنؤ کی سماجی زندگی کا کینسر بن گئی تھی اور بد قسمتی سے اس کا آتش فشاں وہی مغربی لکھنؤ تھا جہاں میرا مکان ہے اور جو کبھی لکھنوی تہذیب کا مرکز تھا۔ ہر سال دو سال کے بعد شیعہ سنّی فساد ایک معمول بن گیا تھا۔ گھر جلتے رہتے تھے، بیگناہ

انسان قتل ہوتے رہتے تھے، کرفیو لگتا رہتا تھا اور یہ سب کچھ مذہب کے نام پر ہوتا تھا، اس مذہب کے ماننے والے جس میں ایک بیگناہ کے قتل کو تمام انسانیت کا قتل قرار دیا گیا ہے۔ مسجدوں تک میں بے گناہوں کے قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے لگے تھے اور ایک افسوسناک پہلو یہ بھی تھا کہ محض اپنے سیاسی مقاصد کی خاطر سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقہ کے حضرات بھی اس نفرت انگیزی میں ملوث رہتے تھے۔ لیڈروں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا تھا جن کا پیشہ اس نفرت کی آگ کو مشتعل رکھنا تھا۔ یہی حضرات فسادوں کے ذمہ دار ہوتے تھے اور ان کے بعد قیامِ امن کے سلسلے میں سرکاری حلقوں میں انھیں کی پذیرائی ہوتی تھی اور مسئلہ کو حل کرنے کے لیے انھیں حضرات کو منتریوں کے یہاں دعوتیں دی جاتی تھیں۔ اس مسلکی گتھی کو سلجھانے کے لیے دوسری جگہوں سے قومی لیڈر آتے تھے اور انھیں لوکل لیڈروں کی وجہ سے ناکام ہو جاتے تھے اس لیے کہ اگر مسئلہ حل ہو جاتا تو ان کی اہمیت ہی کہاں باقی رہ جاتی اور منسٹروں کے درباروں تک ان کی رسائی کیسے ہوتی۔ میرے مکان کے سامنے جلانے والی لکڑی کی بڑی بڑی ٹھیکیاں تھیں۔ ایک فساد میں ان کو نشانہ بنایا گیا۔ آسمان تک شعلے بلند ہو رہے تھے اور میرا مکان صرف اس لیے بچ گیا کہ ہوا کا رخ دوسری طرف تھا۔ اسی فساد کے دوران ایک شخص عبدالرشید کا چھوٹا سا اسٹال ان ہی ٹھیکیوں سے ملحق تھا۔ اس کا مکان تھوڑے ہی فاصلہ پر پاٹانالے میں اندر گلی میں تھا جس میں گھس کر بلوائیوں نے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ عبدالرشید نے اپنی دوکان کا سامان جلنے سے بچانے کے لیے میرے مکان کے باہری کمرے میں بھر دیا۔ میرے شناسا اور پیرا کی میں پیر بھائی میاں ناظر خیامی بھی اس بلوے میں پھنس گئے تھے اور میرے گھر کے اندر آ گئے تھے۔ انھوں نے رشید کے سامان سے اپنے مطلب کی سگریٹیں نکالنا شروع کر دیں۔ ایک دوسرے فساد کے موقع پر جب میرے دو شیعہ دوستوں کی بہن کے مکان کے جلنے پر میں ان کے خاندان

کو اپنے گھر لے آیا تو ایک حلقے کی نظر میں معتوب ہو گیا تھا اور ایک تیسرے موقع پر جب میں نے فساد روکنے کی کوشش کی تھی تو ایک خاص فرقہ کے کچھ حضرات کا ہدفِ ملامت بن گیا تھا اور سب صلہ مل رہا تھا مجھے اس کا کہ میں کوشش کیا کرتا تھا کہ بے گناہوں کا خون نہ بہے، غریبوں کے گھر نہ جلیں اور میرے اہلِ مذہب کا بلوائیوں کی حیثیت سے مذاق نہ اڑے۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ یہ مسئلہ حل ہوا اور انھیں لائنوں پر حل ہوا جن پر میں نے کبھی تجویز کیا تھا یعنی ''آنچہ بر خود نہ پسندی برای دیگران ہم مپسند'' اور یہ سبق مجھے شیخ سعدیؔ سے ملا تھا۔

چاہتا تو یہ تھا کہ ''میں سب وہ غم سمیٹ لوں جتنا جہاں میں ہے'' لیکن میرے پاس دوسروں کا غم بانٹنے کے لیے ہاتھ پیر اور دماغ کے علاوہ کبھی کچھ نہ تھا اور انھیں سے جو کچھ ہو سکا دوسروں کی مدد کرتا رہا۔ میری جو کچھ پونجی تھی وہ تھوڑا سا علم تھا جس کے بانٹنے میں میں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ خود اپنی طالبعلمی کے زمانے میں اس سلسلے میں اپنے ہمدرسوں کی مدد کرتا رہا۔ ایک معروف قانون داں خاندان کے ایک صاحبزادے وسیم الدین میرے کلاس فیلو تھے جو نقل کر کے امتحان پاس کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر وہ میری مدد کے خواستگار ہوئے۔ دوسرے دن سویرے امتحان تھا۔ وہ مجھے اپنے یہاں لے گئے۔ پوری رات میں انھیں پڑھاتا رہا اور اتنا تیار کرا دیا کہ وہ با آسانی پاس ہو جاتے۔ صبح کے وقت میں گھنٹہ بھر کے لیے سو گیا اور جب اٹھا تو دیکھا کہ وہ حضرت نقل کرنے کے لیے پرچے تیار کر رہے تھے۔ یہ بات اس وجہ سے تھی کہ ان میں خود اعتمادی (Self Confidence) کی کمی تھی ورنہ اتنا تو انھیں آ ہی گیا تھا کہ امتحان پاس کر لیتے۔ وسیم الدین پاکستان چلے گئے تھے اور فوج میں اعلیٰ عہدے تک پہنچے تھے۔ عرصہ ہوا وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ سرکاری ملازمتوں کے دوران بھی میرے پاس پڑھنے کے لیے آنے والوں کی کمی نہ تھی۔ انھیں میں سلطان المدارس کے ایک وہ طالبعلم بھی شامل تھے جنھیں میرے ایک دوست

حسن یاور نقوی میرے پاس انگریزی پڑھوانے کے لیے لائے تھے اور جو مجھ سے کئی سال پڑھتے رہے اور جنہوں نے مجھے اپنا نام اس وقت بتایا جب وہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں پروفیسر ہونے کے بعد لکھنؤ آئے تھے اور یونیورسٹی اسٹاف کلب میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ وہی دبلے پتلے مولانا تھے جو میرے پاس پڑھنے آیا کرتے تھے۔ اسی طرح جس زمانے میں Economics and Statistics Deptt. میں ملازمت کر رہا تھا میرے ایک ہمکار مہیش چندچترویدی مجھے اپنی بی۔اے۔کی طالبہ بہن کو انگریزی پڑھوانے کے لیے زبردستی اپنے گھر پکڑ کر لے جاتے تھے۔ انگریزی میں نے خود بی۔اے تک پڑھی تھی لیکن ایسی استعداد تھی کہ بی۔اے کی طالبہ کو بہ آسانی پڑھا سکتا تھا۔ اسی زمانے میں مذکورہ حسن یاور نقوی صاحب نے مجھے ایک اور صاحبہ سے جنہیں انھوں نے اپنی منھ بولی بہن بتایا تھا، ان سے ملوایا تھا جنھیں B.Ed. امتحان کے سلسلے میں میری مدد درکار تھی اور یہ وہ مضمون تھا جو میں نے خود کبھی نہ پڑھا تھا لیکن ان صاحبہ کی مدد کے سلسلے میں میرے علم میں کافی اضافہ ہوا۔ شیعہ کالج اور اس کے بعد یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران میرے گھر پر پڑھنے والوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور یہ سلسلہ رٹائرمنٹ کے مدّتوں بعد تک جاری رہا اور میرے آخری دور کے طلباء میں چند آج بھی قم میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

بندگانِ خدا کی خدمت میں میرے مذہب کی رو سے یتیم کی سرپرستی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اپنی یونیورسٹی کے آخری دنوں میں مجھے اس خدمت کا بھی موقع ملا۔ لکھنؤ کے مسلمانوں کے اداروں میں انجمن اصلاح المسلمین اہم ترین ادارہ ہے۔ یہ انجمن ۱۹۰۵ء میں میرے ہی خاندان کے ایک بزرگ شمس العلماء مولانا عبدالحمید صاحب کی سرپرستی میں قائم ہوئی تھی اور چند سال کے بعد ہی اس کے تحت ایک یتیم خانہ وجود میں آ گیا تھا اور یتیم بچوں کی تعلیم کے لیے ایک چھوٹا سا اسکول بھی کھول دیا گیا تھا۔ آج وہ معمولی یتیم خانہ ''ممتاز یتیم خانہ'' کی شکل میں

ہندوستان کے بزرگ ترین مسلم یتیم خانوں میں سے ایک ہے جہاں لڑکوں کے ساتھ ساتھ بے سہارا لڑکیوں کی رہائش کا بھی انتظام ہے اور وہ چھوٹا سا اسکول اب ممتاز پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج بن چکا ہے۔ اس انجمن کے کچھ ممبروں نے جن میں میرے کچھ شاگرد بھی شامل تھے مجھے اس کی مجلسِ منتظمہ کا رکن بنادیا تھا۔ اس وقت تک انجمن کی رکنیت محدود تھی اور اس کی منتظمہ میں شہر کے معزز ترین لوگ ہوا کرتے تھے لیکن بدقسمتی سے ان کا عوامی رابطہ کم تھا اور یہ چیز انجمن کے تحت چلنے والے اداروں کی ترقی میں حائل تھی۔ منتظمہ کی میٹنگوں میں اکثر کورم بھی پورا نہ ہوا کرتا تھا۔ عمائدین شہر کے پاس جن میں اکثر معمّر حضرات تھے اتنا وقت بھی نہ تھا کہ انجمن کے کاموں کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کر سکتے۔ سید محمد حسین صاحب ایڈوکیٹ کے دورِ صدارت میں حالات بدلے۔ نوجوان طبقہ نے انجمن میں دلچسپی لینا شروع کی۔ انجمن کی ممبر شپ بڑھی اور اسے عوامی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اسی زمانے میں حالات کچھ ایسے ہوئے کہ مجھے انجمن کا نائبِ صدر بنا دیا گیا اور محمد حسین صاحب کے استعفے کے بعد صدارت مجھے تفویض ہوئی۔ اس وقت تک کالج کے ڈگری کی سطح تک پہنچنے کے باوجود اس کی اس کے شایانِ شان عمارت نہ تھی۔ میری خواہش تھی کہ شہر کے ڈالی گنج کے علاقے میں جو انجمن کی زمین پڑی ہوئی ہے اس پر کالج کی عمارت بن جائے۔ میری یہ بات مان لی گئی اور آج اسی زمین پر کالج کی شاندار عمارت تعمیر ہو چکی ہے۔ میری دوسری خواہش یتیم بچّیوں کے لیے بھی یتیم خانے میں گنجائش نکالنا تھی۔ خدا کے فضل سے یہ خواہش بھی پوری ہو چکی ہے اور بیتِ نسواں کے نام سے یتیم بچیوں کی رہائش اور دیکھ بھال کے لیے انجمن کے تحت ایک اور ادارے کا اضافہ ہو چکا ہے۔ میری ایک اور خواہش تھی کہ بے سہارا بوڑھوں کے سر چھپانے کا بھی انجمن کی طرف سے انتظام کیا جائے لیکن اسے عملی جامہ پہنچانے کی کوشش سے قبل ہی میں نے لکھنؤ چھوڑ دیا۔ پھر بھی میں نے اپنی یہ تجویز انجمن کے سامنے پیش کر دی تھی۔

مسجدوں اور قبرستانوں کی دیکھ بھال بھی انجمن کی ذمہ داری ہے۔ ۲۰۰۰ء میں اہلیہ کی وفات کے بعد مجھے لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور میں نے اصلاح المسلمین کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ستمبر ۲۰۰۴ء میں جب میں دوبارہ لکھنؤ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ میں نے اگرچہ انجمن کو چھوڑ دیا لیکن انجمن نے مجھے نہ چھوڑا تھا اور میں اب بھی اس کی منتظمہ کا اعزازی ممبر ہوں۔

اس وقت جب زندگی کی آخری منزل میں ہوں تو کبھی کبھی اپنی مذہبی حیثیت پر غور کرتا ہوں اور یہ پاتا ہوں کہ میری مذہبیت محض زبانی جمع خرچ تھی۔ نماز گنڈے دار پڑھتا رہا اور جب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ صدقِ دل سے ایک نماز بھی ادا نہ ہوئی۔ روزہ رکھتا رہا لیکن اس زمانے میں عام دنوں سے زیادہ کھانے کا سامان ہوتا رہا۔ حج کیا لیکن سمجھ میں آتا ہے کہ زبردستی بلوالیا گیا تھا اور چلا گیا تھا۔ زکوٰۃ نہیں جانتا کہ کس حد تک ٹھیک سے ادا کرتا ہوں۔ سفرِ آخرت درپیش ہے اور زادِ راہ کے نام پر سوائے کچھ حد تک حقوقِ عباد کی ادائیگی کے اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن خدا سے امید لگائے ہوئے ہوں کہ وہ اپنے حقوق کی ادائیگی نہ ہونے پر بھی اپنے بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی بنیاد پر اپنے کرم سے نوازے گا۔

یارب از ابرِ ہدایت برساں بارانی
پیشتر زانکہ چو گردی زمیاں برخیزم

بیسواں باب

حلقۂ احباب و خوشہ چینانِ علم

تنہا بہ جہاں ماندم و یاران ہمہ رفتند

گذشتہ ابواب میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے قارئین کو اس بات کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میری عملی زندگی کے مختلف میدان تھے اور ان سب میں مجھے مختلف درجوں کے لوگوں سے سابقہ پڑا اس لیے حلقۂ احباب کافی وسیع تھا۔ ابتدائی تعلیمی دور کا ذکر اور اس دور کے کچھ ساتھیوں کا ذکر کر چکا ہوں۔ چوتھے درجے کے ساتھیوں میں اب صرف آصف جاہ اور میرے برادرِ نسبتی اخلاق احمد موجود ہیں۔ اس زمانے کا عزیز ترین ساتھی سید محمد سعید عرف غلام عباس گذشتہ سال ۲۰۰۵ء میں کینڈا کی برف کے راستے سورگ پہنچ گیا۔

اسی ابتدائی دور کے ساتھیوں میں پانچویں درجے کے ہمدرسوں میں مہیش چندر ماتھر اور مہدی عباس حسینی بھی میرے عزیز ترین دوستوں میں تھے جو اب دنیا میں نہیں رہے۔ حسین آباد اسکول کی تعلیم کے دوران میرے ساتھیوں میں خواجہ احمد علی، محمد یونس، افضال حسین رضوی، مجیب الدین قدوائی، مہدی علی خاں اور شاردا پرساد میرے قریبی دوست تھے لیکن اب ان میں سے دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے میرے ساتھیوں میں کچھ میرے عزیز ترین دوست تھے ان

میں جوبلی کالج کے ساتھیوں میں وسیم عون جعفری ابھی حیات ہیں اور پاکستان میں بہت بڑے عہدوں پر رہ چکے ہیں۔ان کے علاوہ اچل بہاری مہروترا، جو بسواں کے تعلق دار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ابھی لکھنؤ ہی میں حیات ہیں اور اسی زمانے کا ہمدرس کمار پرشاد مکرجی بھی کلکتہ میں زندگی کے آخری دور میں ہے۔ وسیم الدین کا ذکر کر چکا ہوں۔ وہ پاکستان ملیٹری کے بڑے عہدے سے رٹائر ہوئے تھے اور اب دنیا میں نہیں رہے۔ حیدر عباس، رفیع الرحمٰن، ڈی این بنرجی، اونکار ناتھ ماتھر، عزیز الحسن، سید محمد وحید، سید محمد سبطین (جو راجہ صاحب سلیم پور کے داماد ہو گئے تھے) وہ سب دنیا سے جا چکے۔ شیعہ کالج میں مَیں نے صرف ایک سال پڑھا لیکن وہاں مجھے اپنے عزیز ترین دوست شفاعت قاسم اور نصیر الدین ملے۔ اب دونوں دنیا میں نہیں ہیں۔ان کے علاوہ متقی حسین زیدی، دیال داس، گوریشور دیال بھٹناگر، بدر الحسن عابدی، خورشید حیدر کاظمی، ریاست قاسم قزلباش، ابوطالب اور شیش محل کے نوابی خاندان کے عسکری حسن بھی میرے شیعہ کالج کے ساتھیوں میں تھے۔ان میں صرف خورشید ابھی حیات ہیں لیکن اس عالم میں ہیں کہ ہر وقت موت کی دعائیں مانگتے ہیں۔ عسکری حسن کا بھی چند روز قبل یعنی ۱۵/مارچ ۲۰۰۷ء میں انتقال ہو گیا۔ اسی دور کے کچھ دوسرے ساتھیوں کا ذکر بھی مناسب ہے۔ نظامی پریس کے مالک مرزا محمد جواد صاحب کے بیٹے عالم حسین اور مقبول حسین اسی زمانے میں جب میں جوبلی کالج کے انٹرمیڈیٹ کلاسیز میں تھا تو یہ لوگ کرسچین کالج کے طالبعلم تھے لیکن ان کا اٹھنا بیٹھنا ہر وقت ہمارے گروپ میں تھا۔ عالم حسین کے بھائی عارف حسین جو آرٹس اسکول میں تھے وہ بھی میرے اچھے ساتھی بن گئے تھے۔ یہ تینوں بھی اب دنیا میں نہیں ہیں۔ جب غور کرتا ہوں تو یہ نظر آتا ہے کہ ان پرانے ساتھیوں میں تقریباً سبھی جا چکے ہیں۔ایک بشارت حسین بچے تھے سو وہ بھی چلے گئے۔ یونیورسٹی کے تعلیمی دور کے متعلق ذہن دوڑاتا ہوں تو صرف علی مہدی بقیدِ حیات نظر آتے ہیں اور سرکاری

ملازمت کے دور کا صرف ایک ساتھی آر۔ کے بھٹنا گر جو ڈپٹی سکریٹری کے عہدے سے رٹائر ہوا تھا ابھی زندہ ہے۔Economics and Statistics Deptt. کی ملازمت کے دوران ایک سینیئر اکنامکس انٹیلی جنس انسپکٹر کاظم رضا زیدی سے ملاقات ہوئی تھی جو جلد ہی دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ کاظم رضا نے بہت جلد ترقی کی اور Banking Service Recruiting Board کے صدر ہو گئے تھے۔ کاظم اور ان کے چھوٹے بھائی محسن رضا دونوں ہی کینسر کا شکار ہوکر دنیا سے جا چکے ہیں۔ کاظم رضا کے بیٹے طاہر رضا آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں اور برسوں سے میری آنکھوں کا علاج کررہے ہیں۔ یونیورسٹی کے اپنے تقریباً تمام ہمکار اب دُنیا میں نہیں ہیں۔ شعبۂ اُردو فارسی کے جانے والے ساتھیوں کی ابتداء ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی سے ہوتی ہے۔ ان کے بعد رغیب حسین گئے۔ پھر شجاعت علی سندیلوی نے داغِ مفارقت دیا۔ اس کے بعد شبیہ الحسن سِدھارے اور ان کے بعد نورالحسن ہاشمی بھی چلے گئے۔ عربی ڈیپارٹمنٹ میں اپنے دوست رضوان علوی تھے جو بہت پہلے جا چکے۔ یہ سب دنیا میں نہیں لیکن ان کی یادیں میرے دل میں محفوظ ہیں۔ اس دور کے یونیورسٹی کے ساتھیوں میں ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر نیر مسعود، اور شعبۂ ریاضی کے پروفیسر ڈاکٹر جے۔ پی۔ جیسوال ابھی بقیدِ حیات ہیں لیکن سوائے منظور صاحب کے کوئی بھی گھر سے باہر نکلنے کے لائق تک نہیں ہے۔ خدا ان تینوں کی عمریں دراز کرے۔ بحیثیت مجموعی جب غور کرتا ہوں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سوائے چند کے باقی سبھی حضرات اس عالمِ فانی سے سفرِ آخرت اختیار کر چکے ہیں اور بے ساختہ یہ شعر اکثر یاد آیا کرتا ہے:

گھروں پہ جا کر جو ہم پکارے، کہا خموشی نے سب سِدھارے
گرے ستوں نے کیے اشارے، مکیں ہمارے تہِ زمیں ہیں

اب مختلف میدانوں کے اپنے ساتھیوں کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ کرتا ہوں۔

اسپورٹس میں ہر میدان کے کھلاڑیوں سے میرے گہرے تعلقات رہیں ہیں۔فٹ بال میں شیخ عابد حسن اور محمد عابد اس میدان ہی کے میرے ساتھی نہ تھے بلکہ ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ میں میرے ہمدرس بھی رہ چکے تھے۔شیخ عابد جو میرے ایک دوسرے دوست کے بھتیجے بھی تھے انہوں نے فٹ بال میں کافی ترقی کی تھی اور محمڈن اسپورٹنگ کی ٹیم میں ان کا انتخاب ہو گیا تھا چنانچہ انہوں نے کلکتہ ہی کو وطن بنالیا تھا اور وہیں زیر خاک ہیں۔محمد عابد فٹ بال میں گول کیپر کھیلتے تھے لیکن کوتاہ دوڑوں میں وہ ہندوستان کے گنے چنے کھلاڑیوں میں تھے۔اسی وجہ سے حلقۂ احباب میں وہ عابد گھوڑا کہلاتے تھے۔اصل میں وہ میرے ایک رشتہ کے بڑے بھائی ڈاکٹر انور انصاری کے کلاس فیلو تھے لیکن دو تین سال فیل ہونے کے بعد ان کا میرا ساتھ ہوا تھا۔ خدا کے فضل سے آج بھی وہ زندہ اور تندرست ہیں۔انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں ملازمت کی اور اسی شہر کو وطن بنالیا۔ہاکی کے ساتھیوں میں ایم۔وائی۔اے کلب میں کچھ کا ذکر کر چکا ہوں۔اس کے اہم کھلاڑیوں میں طٰہٰ، مظفر، اور یحییٰ تینوں بھائی لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد محمد سلطان صاحب کے بھانجے تھے۔بعد کو تینوں بھائی پاکستان چلے گئے تھے اور ان میں سے غالبًا اب کوئی دنیا میں نہیں ہے۔اس میدان کا میرا عزیز دوست عابد علی رضوی بھی چند سال ہوئے دنیا چھوڑ چکا۔شفاعت قاسم قزلباش کا کچھ ذکر کر چکا ہوں۔وہ بھی ہاکی کے اچھّے کھلاڑی اور ایم۔وائی۔اے کے ممبر تھے۔وہ بھی مدّتوں پہلے جا چکے۔حلیم الدین صاحب ہمارے اسی کلب کے سکریٹری تھے۔مجھ سے عمر میں کچھ بڑے ہونے کے باوجود میرے بے تکلف دوست تھے۔ ان کا بھی انتقال ہو چکا۔عباس مرزا بھی میرے ایم۔وائی۔اے کے دوستوں میں تھے۔وہ بھی پاکستان چلے گئے اور ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ہے۔لے دے کر اب صرف خورشید حیدر اور وصی حیدر ایم۔وائی۔اے کے ساتھیوں میں رہ گئے ہیں۔خورشید حیدر کا ذکر کر چکا ہوں وصی

حیدر صاحب جوبلی کالج میں میرے سینئر تھے لیکن ایم۔ وائی کے ممبر کی حیثیت سے میرے بے تکلف دوست ہو گئے۔ اب اس پورے گروپ میں صرف وہی تندرست کہلانے کے مستحق ہیں اگرچہ ان کی بینائی بھی جواب دے چکی ہے۔ مخالفت میں کھیلنے والوں میں بی۔ وائی۔ اے کے بمبل چکرورتی اور ایل۔ وائی۔ اے کے کے۔ ڈی۔ سنگھ بابو میرے قریبی دوست تھے لیکن اب ان میں سے کوئی نہیں ہے۔ کرکٹ میں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں کھیلا لیکن لکھنؤ میں اس کھیل کے روحِ رواں عسکری حسن میرے کلاس فیلو اور عزیز دوست تھے۔ پول والٹ سے بھی میرا کوئی تعلق نہ رہا لیکن اس کے ملکی سطح کے کھلاڑی جنھوں نے ہندوستان کی نمائندگی بھی کی تھی، مشرف حسین کئی سال فیل ہو کر جوبلی کالج میں میرے ساتھی ہو گئے تھے اور فٹ بال میرے ساتھ کھیلتے تھے۔ پیراکی کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں کہ جب میں انٹرمیڈیٹ میں تھا تو اس کا شوق میرے ساتھی مشیر عباس نے دلایا تھا۔ وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ سے رٹائر ہوئے اور عرصہ ہوا الٰہ آباد میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے ساتھ شکلا گھاٹ پر جانے والوں میں اب صرف وجے مصرا اور محسن کے علاوہ کوئی زندہ نہیں ہے۔ استاد سید صاحب کا مدّتوں پہلے انتقال ہو گیا۔ ان کے قدیمی شاگردوں میں صفدر صاحب نظیر آباد میں ایک درزی خانے میں ملازم تھے۔ اب نظر نہیں آتے۔ محسن قومی آواز میں کاتب تھے۔ اب نہیں دکھائی دیتے۔ ڈاکٹر رگھوبیر سنگھ سیٹھ بلرام پور اسپتال میں آنکھ، کان، ناک، کے ڈاکٹر تھے۔ عرصہ ہوا مر چکے۔ خاندانِ اجتہاد کے بچوں میں ہمارے گھاٹ پر آنے والوں میں اب صرف میاں مسلم جو مولانا کلبِ صادق کے بہنوئی ہیں، حیات ہیں۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔ اسی خاندان کے ایک اور فرد میاں شفّو جو ناظر خیامی بن گئے تھے، مدّت ہوئی شراب کی نظر ہو گئے۔ فرنگی محل کے بچوں میں اب میرے بھائیوں کے علاوہ شکلا گھاٹ جانے والوں میں کوئی نہیں ہے۔ دوسرے گھاٹوں کے پیراکوں کا ذکر پہلے ہی کر چکا

ہوں۔ یونیورسٹی میں آنے کے بعد جن پیراکوں کا ساتھ ہوا ان میں رام کشن اوستھی ابھی حیات ہیں لیکن مدّتوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وادوانی جو کبھی اوستھی کے بہت قریب تھے لیکن بعد کو اختلاف ہو گیا تھا دلّی چلے گئے تھے اور اب ان کا کچھ حال معلوم نہیں۔ کیلاش ورما اس زمانے میں ہم لوگوں سے جونیر تھے لیکن اب All India Aquatic Association کے اعلیٰ عہدے دار ہیں۔ یونیورسٹی میں ہم لوگوں سے جونیر ایک پیراک دوارکا ناتھ کھنّا بھی تھے۔ وہ بعد کو سیشن جج ہو گئے تھے اور اب بھی ان سے برابر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ موجودہ دور میں بھی جن حضرات کا پیراکی سے تعلق ہے ان سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔ میرے جاننے والے حیدر صاحب اسٹیڈیم میں پیراکی کے استاد ہیں۔ شہر میں حسین آباد کے رہنے والے سید حسن صاحب موجودہ دور کے اچھے استادوں میں ہیں اور انھیں سے میں نے اپنے بیٹے اور بھتیجوں کو پیراکی سکھلوائی۔ استادِ محترم پروفیسر مسعود حسن صاحب کے تیسرے صاحبزادے ڈاکٹر انور مسعود ہمارے شکلا گھاٹ کے آنے والوں میں تھے۔ ان کا پیراکی کا شوق برقرار ہے۔ میں اپنے جسم سازی کے شوق کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ اس میں میرے خاص ساتھی آغا شفاعت قاسم قزلباش تھے۔ انٹرمیڈیٹ سے ہم دونوں ساتھ ورزش کرتے تھے، ساتھ دوڑتے تھے اور ساتھ سوئمنگ کرتے تھے۔ شفاعت بی۔ اے۔ نہ کر سکے اور محکمۂ پولیس میں انسپکٹر ہو گئے تھے۔ رٹائر ہونے کے بعد زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکے۔ عمر میں شفاعت مجھ سے کئی سال بڑے تھے۔ یونیورسٹی پہنچنے کے بعد صادق حسین زیدی، ڈاکٹر جے بی چالس، علی مہدی رضوی، اور گوپال کرشن باجپئی جسم سازی اور ورزش کے میرے دوسرے ساتھی تھے۔ ڈاکٹر چارلس فوجی ڈاکٹر ہو گئے تھے اور کئی سال ہوئے انتقال ہو گیا۔ گوپال کرشن باجپئی پولیس میں ایس۔ پی تھے۔ شیر کے شکار کے سلسلے میں زخمی شیر نے انہیں بری طرح مجروح کر دیا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ باجپئی

اپنے وقت کے معروف وزن اٹھانے (Weight Lifter) تھے اور ان کے مگدروں کو اٹھانا عام ورزشی انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ بھی یونیورسٹی میں مجھ سے سینئر تھے لیکن بہت ہی قریبی دوست تھے۔ صادق بھی مجھ سے سینئر اور عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ ان کا ایسا خوبصورت جسم کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ صادق کا اور میرا ساتھ سوئمنگ میں بھی ہوا کرتا تھا۔ ان کا بھی کئی سال ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔ لے دے کر اب صرف علی مہدی باقی بچے ہیں۔ لیکن سنا ہے کہ وہ بھی اب اسی حال میں ہیں جس میں مَیں ہوں۔ اپنی نوجوانی میں علی مہدی بہترین کشتی لڑنے والوں میں تھے اور اس فن میں اتر پردیش کی نمایندگی بھی کر چکے تھے۔ نبی حیدر کوتاہ دوڑوں کے کھلاڑی تھے۔ میرے اچھے دوستوں میں تھے۔ اب اس اتھلیٹک گروپ میں صرف میں، علی مہدی، اور نبی حیدر زندہ ہیں۔ یونیورسٹی میں جانے کے بعد ٹیبل ٹینس میں میری دلچسپی پیدا ہوئی اور کچھ عرصے کے بعد وہ جنون کی حد تک پہنچ گئی۔ اس کھیل میں یونیورسٹی کی منزل پر ہاکی کے پلیر عابد علی رضوی، (جنھوں نے ہندوستان کی نمایندگی کی تھی اور جن کا ذکر کر چکا ہوں)، سریندر گری، پی۔ این ہڑکولی (جو سیشن جج ہو کر رٹائر ہوئے)، رمیش شاہ، سلطان احمد، عسکری حسن، علی نقی وغیرہ میرے ساتھ کھیلنے والے تھے۔ یونیورسٹی کے بعد ان میں اضافہ ہو گیا۔ سکریٹریٹ کے آر۔ کے بھٹنا گر کا ذکر کر چکا ہوں۔ نسیم الحسنین بھی ایسے دوسرے کھلاڑی تھے۔ یہ دونوں بحیثیت ڈپٹی سکریٹری رٹائر ہوئے اور بقیدِ حیات ہیں۔ اسی زمانے میں میڈیکل کالج کے طلباء ڈاکٹر منصور قریشی اور وقار زیدی میرے بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔ وقار ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے اور منصور نے چھوٹی دوڑوں میں ہندوستان کی نمایندگی کی تھی۔ ان دونوں کو ٹیبل ٹینس کا شوق میری طرح جنون کی حد تک تھا۔ بعد کو جب میں خود ٹیبل ٹینس کلب چلا رہا تھا اس وقت دو جونیر بچے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک ونود چند مہتا اور دوسرا تپن بوس۔ ونود مہتا کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ اس

وقت وہ ہندوستان کے معروف جرنلسٹوں میں ہیں اور تپن بوس پٹیالہ میں ٹیبل ٹینس کوچ ہیں۔اسی دور میں طالب علمی کے دور کے ساتھی مرزا عالم حسین کے بھائی اور نظامی پریس کے مالک عارف حسین اور سلامت اللہ خاں اور سکریٹریٹ کے مظفر حسین بھی ہمارے ٹیبل ٹینس کے ساتھی تھے۔

ادبیات کے میدان میں بھی میرے ملنے والوں کی تعداد بہت کافی رہی ہے۔فارسی کے استادوں میں بہتوں کا ذکر کر چکا ہوں جن کا میں ممتحن رہا یا جن کی سلکشن کمیٹی کا ممبر تھا۔ان کے علاوہ کچھ دوسرے سینئر اساتذہ بھی تھے اور ہیں جن سے مجھ سے رشتۂ اخوت قائم ہے۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب اور پروفیسر امیر حسن عابدی صاحب کا کچھ ذکر کر چکا ہوں۔کہا جاتا ہے کہ پروفیسر کبھی رٹائر نہیں ہوتا۔اگر یہ صحیح ہے تو ہم تینوں یعنی پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر امیر حسن عابدی، اور میں اس وقت برصغیر کے سب سے سینئر پروفیسر ہیں اور ان تینوں میں مَیں ہی سب سے جونیر ہوں۔نذیر صاحب بغیر کسی شبہ کے موجودہ عہد کے سب سے اہم فارسی کے محقق ہیں۔ پروفیسر محمد صدیق صاحب سید حسن صاحب کے بعد پٹنہ یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر تھے اور میرے عزیز دوست۔کئی سال ہوئے ان کا انتقال ہو چکا۔ان کے بعد انوار احمد صاحب وہاں فارسی کے پروفیسر ہوئے۔ان سے آج تک میرے بیحد قریبی تعلقات ہیں۔ان کے بعد ڈاکٹر شرف عالم نے اس عہدے کو سنبھالا اور ریٹائر ہونے کے بعد اب مظہر الحق عربی، فارسی، یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں اور غفار صدیقی صاحب ان کی جگہ فارسی کے پروفیسر ہیں۔ پروفیسر فیاض الدین حیدر بھی میرے اچھے دوستوں میں تھے۔وہ عربک پرشین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے اور وہیں سے رٹائر ہوئے اور ان کے جونیر ڈاکٹر اطہر شیر بھی میرے اچھے دوستوں میں تھے۔اطہر شیر صاحب کا انتقال ہو گیا ہے لیکن فیاض الدین صاحب ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ میرے ہم عمروں میں پٹنہ میں صرف وہی باقی رہ گئے ہیں۔ڈاکٹر شرف عالم ان لوگوں میں تھے

جو اپنے ابتدائی دور میں ۱۹۷۶ء میں میرے ساتھ ایران گئے تھے۔ کشمیر یونیورسٹی میں میرے معاصرِ فارسی استاد شمس الدین صاحب تھے جو ایک متنازعہ شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ بہرحال میرے ان کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ ان کے جونیروں میں صدیق نیاز مند اور منور مسعودی صاحبان کا ذکر کر چکا ہوں۔ جس زمانے میں شمس الدین صاحب فارسی پروفیسر تھے ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا اور مرغوب بانہالی صاحبان اور ایک اور صاحب مسعود ان کے ہم کار تھے۔ مسعود صاحب پی۔ سی۔ ایس ہو گئے تھے۔ پنڈتا صاحب رٹائر ہو کر غالباً جموں میں آباد ہو گئے ہیں اور مرغوب صاحب شعبۂ کشمیری کے صدر کی حیثیت سے رٹائر ہو کر اب بھی سری نگر میں ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر شفیع بچھ سری نگر کے ایک ڈگری کالج میں پروفیسر تھے۔ میرے شاگرد رہ چکے ہیں اور اب رٹائر ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے ہم زلف غلام رسول شاہ اور ان کے دوسرے عزیزوں سے میرے بہت قریبی دوستانہ تعلقات تھے۔ کشمیر کے اُردو اساتذہ میں سب سے پہلے میری ملاقات اکبر حیدری صاحب سے ہوئی جو ایک لحاظ سے اب لکھنوی بن چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور ڈاکٹر حامدی کشمیری سے بھی میرے گہرے مراسم تھے۔ جموں یونیورسٹی میں عابد پیشاوری میرے اچھے دوست تھے۔ جگن ناتھ آزاد سے بھی اچھی شناسائی ہے۔ پنجابی یونیورسٹی کے پروفیسر گلونت سنگھ اور ان کے جانشین ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا ذکر کر چکا ہوں۔ دہلی کے تینوں یونیورسٹیوں میں فارسی کے ہر استاد سے میرے شگفتہ تعلقات رہے ہیں۔ عبدالودود اظہر صاحب جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے بحیثیت پروفیسر رٹائر ہو چکے ہیں لیکن اب بھی انجمن استادانِ فارسی کی روح رواں ہیں۔ ان کی جانشین پروفیسر ہویالا اور ان کے بعد ہونے والے پروفیسر محمود عالم صاحب کا کچھ ذکر کر چکا ہوں۔ دونوں رٹائر ہو چکے ہیں اور ان کے بعد ڈاکٹر عین الحسن اور ڈاکٹر ذاکرہ قاسمی اب وہاں پروفیسر ہیں۔ آخرالذکر صدر شعبہ

بھی ہیں۔ اختر مہدی صاحب اور غالباً اختر کاظمی بھی ریڈر ہیں۔ یہ دونوں بھی میرے اچھے ساتھی ہیں۔ دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر عابدی کے بعد ڈاکٹر نورالحسن، ان کے بعد ڈاکٹر مقبول فارسی کے پروفیسر ہوئے۔ ان دونوں سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے لیکن دونوں کا جلد انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے بعد ڈاکٹر شریف قاسمی اور ڈاکٹر اسلم خان فارسی کے پروفیسر ہوئے۔ آخرالذکران کا بھی انتقال ہوگیا ہے اور پروفیسر قاسمی رٹائر ہونے والے ہیں۔ قاسمی بھی ۱۹۷۶ء میں میرے ساتھ ایران جانے والوں میں تھے اور ان کے پورے خاندان سے میرے عزیز دارانہ تعلقات ہیں۔ دلّی یونیورسٹی کے موجودہ پروفیسر اور صدرِ شعبہ فارسی ڈاکٹر چندر شیکھر میرے چھوٹوں میں ہیں اور میرا ایک بڑے کی طرح لحاظ کرتے ہیں۔ ذاکر حسین کالج کے ہمکار ڈاکٹر محمد یوسف بھی ۱۹۷۶ء میں میرے ساتھ ایران جانے والوں میں تھے اور ہم دونوں تہران میں ایک ہی کمرے میں مقیم تھے۔ جامعۂ ملیہ کے پروفیسر شعیب اعظمی بھی میرے تہران جانے والے اسی گروہ کے ساتھی ہیں۔ مجھے ان کے پروفیسر شپ کی سلکشن کمیٹی کا ممبر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جامعہ کی موجودہ پروفیسر میرے دوست پروفیسر نبی ہادی کی شاگرد ہیں۔ دلّی کے اردو پروفیسروں میں ڈاکٹر محمد حسن لکھنؤ یونیورسٹی میں طالبعلمی کے زمانے سے میرے ساتھی ہیں۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن سے رشتہ داری کا تعلق ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے اردو اور فارسی شعبوں میں گندی سیاست کی وجہ سے میں نے ہمیشہ وہاں سے دور رہنے کی کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ حالات نہیں ہیں اور وہاں کے صدر شعبہ ڈاکٹر عبدالقادر جعفری اور دوسرے تمام اساتذہ سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔ الٰہ آباد کے اُردو شعبہ کے تمام پروفیسر میرے اچھے شناسا تھے۔ ان میں پروفیسر عقیل، پروفیسر جعفر رضا اور پروفیسر فضلِ امام صاحب الٰہ آباد میں اردو کی خدمت میں مصروف ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے بیشتر اساتذہ میرے سفارش پر پروفیسر

ہوئے ہیں۔ان کے علاوہ بھی جو حضرات وہاں رہے ہیں ان سے میرے تعلقات ہمیشہ خوشگوار
رہے ہیں ۔ پروفیسر نبی ہادی صاحب میرے عزیز دوست ہیں ، وارث کرمانی صاحب سے
میرے شاعرانہ تعلقات بھی ہیں اور ان کے بعد کے تمام حضرات و خواتین میرے چھوٹے ہیں
اور مجھے ان کی محبت ملتی رہتی ہے۔ بنارس یونیورسٹی کا بھی یہی حال ہے۔ڈاکٹر شمیم اختر کی سلکشن
کمیٹیوں کا میں ممبر رہا ہوں اور موجودہ صدر عمر کمال الدین میرے شاگرد ہیں۔اُردو کے ڈاکٹر
حنیف نقوی میرے اچھے دوست ہیں ان کی جانشین ڈاکٹر قمر جہاں میری اہلیہ مرحومہ کی عزیز
شاگرد رہی ہیں اور آج بھی میرا ایک بزرگ کی حیثیت سے احترام کرتی ہیں۔موجودہ صدر ڈاکٹر
نسیم احمد سے بھی ان کی طالبعلمی کے دور سے میرے مراسم ہیں۔ بہار کی تمام یونیورسٹیوں کا ذکر
کر چکا ہوں۔وہاں کے اُردو پروفیسروں میں پٹنہ کے ڈاکٹر ممتاز احمد اور مطیع الرحمان اور بھاگلپور
کے ڈاکٹر لطف الرحمٰن اور ڈاکٹر مظفر اقبال سے میرے خوشگوار تعلقات رہے۔آخر الذکر میرے
کرم فرما پروفیسر سید حسن صاحب کے داماد ہیں۔ بھاگلپور اور مظفر پور کے فارسی پروفیسران غفار
انصاری اور متین احمد صاحبان میرے بزرگ دوست سید حسن صاحب کے شاگرد تھے اور ان کے
دوست ہونے کی حیثیت سے میرا احترام کرتے تھے۔افسوس ہے کہ اب یہ دونوں بھی دنیا میں
نہیں رہے۔ مظفر پور یونیورسٹی کے دوسرے پروفیسر مجتبیٰ انصاری کی ترقی میں بھی میرا ہاتھ رہا
ہے اور وہ بھی میرا لحاظ کرتے ہیں اور رٹائر ہونے کے بعد اب وہ پورے طور سے پٹنہ میں قیام
پذیر ہیں۔ گیا یونیورسٹی میں اردو کے ریٹائرڈ پروفیسر ڈاکٹر حسنین میرے اچھے دوست ہیں۔ وہ
اب دہلی میں مقیم ہیں۔اسی یونیورسٹی کے فارسی استاد ڈاکٹر ابدالی اور طلحہ رضوی برق میرے
چھوٹوں میں ہیں ۔ جہاں تک میرا خیال ہے میرا لحاظ ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی کی
ڈاکٹر حمیرہ سے قاضی عبدالودود صاحب کے یہاں اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ جنوب کی

یونیورسٹیوں کے متعلق لکھ چکا ہوں بھوپال یونیورسٹی کے پروفیسر فدا عباس جو میرے خرُد ہیں رٹائر ہوکر اب لکھنؤ آچکے ہیں۔ان کی جانشین مسز طاہرہ عباسی میرے عزیزوں کی عزیزہ بھی ہیں۔ناگپور یونیورسٹی کے اساتذہ کا ذکر کر چکا ہوں۔موجودہ صدر شعبۂ فارسی خالدہ نگار بھی ان لوگوں میں ہیں جو مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔حیدرآباد کے تمام فارسی کے پروفیسروں سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے۔وہاں کے سینئر اساتذہ اب زندہ نہیں ہیں البتہ ڈاکٹر شریف النساء اوران کی جانشین بشیر النساء ابھی موجود ہیں لیکن غالباًان کی ادبی سرگرمیاں برقرار نہیں ہیں۔ڈاکٹر یعقوب عمر انتہائی ذہین فارسی کے اسکالر رہ چکے ہیں اوراُردو کے اچھے شاعر ہیں لیکن اپنی صلاحیتوں کو ہجوگوئی اور ہزل نگاری میں برباد کرتے رہتے ہیں۔وہ بھی میرے اچھے دوستوں میں ہیں لیکن کافی عرصہ سے علیل ہیں۔موجودہ صدر ڈاکٹر نجمہ صدیقی ایک خاموش خاتون ہیں اور ان کی میری صرف ایک ملاقات تہران میں ہوئی تھی ۔مدراس یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر وحید اشرف وہاں سے رٹائر ہونے کے بعد بڑودہ چلے گئے ہیں۔وہ بھی میرے خاص کرم فرما ہیں۔ بڑودہ یونیورسٹی کے پروفیسر محمود حسین صدیقی بھی اس گروہ میں شامل تھے جو۱۹۷۶ء میں تہران میں میرے ساتھ تھا۔گورکھپور یونیورسٹی میں فارسی کا شعبہ نہیں ہے لیکن وہاں کے تمام اُردو اساتذہ سے میرے خوشگوار تعلقات رہے ہیں۔ان میں سلام سندیلوی میرے کلاس فیلو تھے۔ان ہی کے معاصر پروفیسر محمود الٰہی میرے بہت اچھے دوست ہیں اوران کے جانشین احمر لاری بھی ان چھوٹوں میں ہیں جو میرا لحاظ ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ مجھے اختر بستوی بھی یاد آرہے ہیں۔وہ گورکھپور یونیورسٹی کے ایک اچھے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے۔افسوس ہے کہ موت نے ان کے غنچۂ استعداد کو کھلنے کا موقع نہ دیا۔ پروفیسروں کے علاوہ دوسرے اہلِ قلم سے بھی میرے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔افسانہ نگاروں میں رام لعل جو عمر

میں مجھ سے کچھ بڑے تھے، میرے عزیز دوست تھے۔ڈاکٹر بشیشر پردیپ میرے بالکل ہم عمر ہیں اور ان سے میرے برادرانہ تعلقات ہیں۔ احمد جمال پاشا، عابد سہیل اور رتن سنگھ میرے چھوٹے بھائی لطیف کے ساتھیوں میں تھے۔ احمد جمال اب دنیا میں نہیں ہیں اور رتن سنگھ لکھنؤ چھوڑ چکے ہیں۔ یہ سب مثل میرے چھوٹے بھائیوں کے ہیں۔ عائشہ صدیقی میری اہلیہ کی شاگردرہ چکی ہیں اور ایک برزگ کی حیثیت سے میرا احترام کرتی ہیں اور یہی حال صبیحہ انور کا بھی ہے۔صحافت سے میرا صرف اتنا تعلق رہا ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جب جمال میاں فرنگی محلی نے ہمدم اخبار کو خرید لیا تھا تو کچھ عرصہ تک اعزازی طور سے میں نے بھی اس میں کام کیا تھا۔موجودہ اردو صحافت کے بابا آدم حیات اللہ انصاری صاحب میرے رشتہ کے چچا تھے۔وہ ایک اعلیٰ پیمانے کے ناول نگار اور افسانہ نگار بھی تھے۔ان کے اخبار قومی آواز کے تمام اراکین سے میرے انتہائی اچھے تعلقات رہے۔اس گروپ میں اب صرف عشرت علی صدیقی صاحب بقیدِ حیات ہیں اور مجھ پر ان کی کرم فرمائی بدستور جاری ہے۔ میرے دو عزیز مفتی رضا انصاری اور محمد حسین قدوائی صاحبان نے بھی قومی آواز کے معیار کی بلندی میں کافی حصّہ لیا تھا۔ یہ دونوں جا چکے ہیں۔ان کے علاوہ حیات اللہ صاحب کے عہد کے قومی آواز کے صحافیوں میں صرف عثمانِ غنی باقی رہ گئے تھے۔ان کا بھی گذشتہ سال انتقال ہوگیا۔اس وقت کے قومی آواز کے نوجوان صحافی احمد ابراہیم علوی صاحب اب اردو کے سینئر صحافیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ میرے عزیز ہیں لیکن وہ خود کو میری بیوی ڈاکٹر ہاجرہ مرحومہ کا چھوٹا منہ بولا بھائی کہلوانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ حفیظ نعمانی صاحب میرے بھائی لطیف کے خاص دوستوں میں ہیں اور اس حیثیت سے میرا بھی احترام کرتے ہیں۔ یہ حضرات بھی میرے چھوٹوں اور کرم فرماؤں میں ہیں۔شہر کے تمام عمائدین سے میرے گہرے تعلقات ہیں اور اس میں مذہب و مسلک کی کوئی قید نہیں ہے۔

انجمن اصلاح المسلمین سے اپنے تعلقات کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس کی صدارت کے دوران مجھے اس کے تمام ممبروں سے مکمل تعاون حاصل رہا۔ انجمن میں میرے جانشین خواجہ رائق ایک زمانے کے میرے شاگرد ہیں۔ مشہور وکیل اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنویز ظفریاب جیلانی بھی ایک زمانے کے میرے شاگرد ہیں۔ ان کی سکریٹری شپ کے دوران انجمن اصلاح المسلمین نے بے پناہ ترقی کی۔ شہر کے سب سے سینئر مسلم وکیل شفیق مرزا صاحب جن کی صدارت میں اسلامیہ کالج ڈگری کالج ہوا، میرے خاص کرم فرما ہیں۔ یونٹی کالج کے بانی اور روح رواں اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر مولانا کلب صادق صاحب سے میرے ذاتی تعلقات کے علاوہ خاندانی تعلقات بھی ہیں۔ ان کے خسر مرزا رضا حسین صاحب بھی میرے دوست تھے اور ان کے داماد نجم الحسن میرے بیٹے کے خاص دوستوں میں ہیں۔ جسٹس مرتضیٰ حسین صاحب جو رٹائرمنٹ کے بعد اب ملّی اور قومی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں میرے عزیز دوستوں میں ہیں۔ جانے والے عزیز دوستوں میں صباح الدین عمر اور چودھری سبطِ محمد نقوی میرے مخلص ترین ہمدردوں میں تھے اور ان کی کمی بری طرح محسوس کرتا ہوں۔ ادبی دنیا میں ان کی حیثیت تھی۔ اوّل الذکر مدّتوں نیا دور کے ایڈیٹر اور اردو اکیڈمی کے سکریٹری رہے اور آخر الذکر ادیب کے علاوہ مستند صحافی تھے اور آخر وقت تک اپنا اخبار ہماری توحید نکالتے رہے۔ یہ دونوں حضرات وہ تھے جو ہر پریشانی کی گھڑی میں میرے کام آتے رہے اور آج جب میں اپنے کو بالکل تنہا محسوس کر رہا ہوں یہ دونوں بے انتہا یاد آرہے ہیں۔

لکھنؤ کے آفیشل حلقے سے میرے تعلقات صدیق حسن صاحب مرحوم کے زمانے سے قائم ہیں جب وہ لکھنؤ کے کمشنر اور اسپورٹس کونسل کے صدر تھے۔ اس وقت میں اس کونسل کا جوائنٹ سکریٹری تھا۔ اس کے علاوہ بزمِ شعراء کی وہ روح رواں تھے اور میں بھی اس کا ایک رکن

تھا۔ اے۔ این۔ جھا صاحب، کے۔ اے۔ پی۔ اسٹیونسن صاحبان کا ذکر اپنی گورنمنٹ سروس کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ یہ حضرات بھی ہر ضرورت کے وقت میرے کام آتے رہے۔ بی۔ کے مصرا کا جوبلی کالج کا ساتھ تھا۔ وہ بورڈ آف ریوینیو کے سینئر ممبر کی حیثیت سے رٹائر ہوئے تھے اور اب دنیا میں نہیں رہے۔ سید حامد صاحب ہاکی کے پلیر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے اور اسی سلسلے میں میرا ان کا تعارف ہوا تھا۔ بزمِ شعراء کی نشستوں میں میرا ان کا ساتھ ہوا کرتا تھا۔ ایسی ہی نشستوں کے سلسلے میں حبیب احمد صدیقی، آئی۔ اے۔ ایس، اطہر حسین آئی۔ اے۔ ایس اور غلام حسین آئی۔ اے۔ ایس سے میری مستقل ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ غلام حسین صاحب طالب علمی کے زمانے سے میرے ملنے والے تھے۔ آخری دور کے میرے آخری ساتھیوں میں سریندر موہن آئی۔ اے۔ ایس اور کے۔ کے بخشی آئی۔ اے۔ ایس قابلِ ذکر ہیں۔ کے۔ کے بخشی صاحب فارسی کے شوقین تھے اور بیحد پڑھے لکھے تھے۔ فارسی ادبیات ہم دونوں میں دوستی کی بنیاد تھی۔ سریندر موہن کو اودھ کلچر میں دلچسپی تھی اور اسی موضوع پر انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی۔ یہی کلچر ہم دونوں کی قربت کا باعث تھا۔ سلی گوڑی سے آنے کے بعد جب ان سے ملنے گیا تو وہ ہمیشہ کے لیے جا چکے تھے۔ اب اس حلقے کے صرف دو افراد باقی بچے ہیں۔ ایک پروین طلحہ اور دوسرے انیس انصاری۔ خدا انھیں تادیر سلامت رکھے۔ یہ سب حضرات آئی۔ سی۔ ایس یا آئی۔ اے۔ ایس تھے۔ پی۔ سی۔ ایس افسروں میں عنبر بہرائچی میرے اچھے دوست ہیں اور غالبًا اب آئی۔ اے۔ ایس ہو چکے ہیں۔ عزیز الجبار خان سے ملاقات ان کے اُردو اکاڈمی کی سکریٹری شپ کے دوران ہوئی۔ بیحد اچھے آدمی تھے لیکن شاید بیحد اچھے آدمی جلد بلا لیے جاتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی آل انڈیا پوسٹل سروس کے آدمی ہیں لیکن پوسٹل ڈیپارٹمنٹ سے زیادہ انھیں اردو ادب میں دلچسپی رہی اور اس ڈیپارٹمنٹ سے نجات

پانے کے بعد ہمہ تن اُردو ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ وہ میرے عزیز دوستوں میں ہیں۔
زندگی کے مختلف ادوار میں کچھ ہائی کورٹ کے ججوں سے بھی میرے گہرے مراسم رہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام جسٹس مبشّر حسین قدوائی صاحب کا یاد آ رہا ہے۔ جس زمانے میں میٹروپولیٹن ینگ مینس ایسوسی ایشن کا میں انتہائی فعال ممبر تھا، اس وقت موصوف اس ایسوسی ایشن کے صدر تھے اور اس سلسلے میں ان سے مسلسل ربط رہتا تھا جو ان کے انتقال کے وقت تک قائم رہا۔ ان کے بعد جسٹس آنند نرائن ملاّ اس ادارے کے صدر ہو گئے لیکن ان سے میرا اصل تعلق شعر و شاعری کا تھا۔ ملاّ صاحب کے لکھنؤ سے مستقلاً دہلی چلے جانے کے بعد ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ مبشّر صاحب اور ملاّ صاحب دوستوں سے زیادہ میرے بزرگ تھے۔ سپریم کورٹ کے رٹائرڈ جج سید صغیر احمد صاحب سے تعلق اس وقت سے ہے جب انھوں نے قانونی پریکٹس شروع کی تھی اور بحمد اللہ یہ تعلق آج بھی قائم ہے۔ صغیر صاحب کے والد سید محمد حسین صاحب کے پورے خاندان کے فرنگی محل سے روحانی رشتہ رہا ہے۔ موصوف کی دور صدارت میں مَیں انجمن اصلاح المسلمین کا نائب صدر بنایا گیا تھا اور ان کے مستعفی ہونے کے بعد وہ عہدہ مجھے تفویض ہوا۔ صغیر صاحب کے خاندانی تعلقات میری بیوی کے گھرانے سے بھی رہے اور میری اہلیہ ڈاکٹر ہاجرہ ولی کے پرنسپل شپ کے دوران بیگم صغیر صاحبہ ان کی ہم کار بھی رہیں۔ جسٹس حیدر عباس عہدِ طالب علمی سے میرے سسرالی عزیزوں کے پڑوسی تھے اور دوران وکالت ہی سے میرے شناسا رہے۔ آج بھی ان سے تعلقات برقرار ہیں۔ جسٹس اوما شنکر سریواستو یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے اور اسی حیثیت سے ان سے ملاقات ہوئی جو ذاتی دوستی میں بدل گئی۔ موصوف بھی اب دنیا میں نہیں ہیں۔ جسٹس مرتضیٰ حسین صاحب کا کچھ ذکر کر چکا ہوں۔ وہ ادب، خصوصاً شاعری کے دلدادہ ہیں اور عمر میں مجھ سے کچھ سال بڑے۔ مستقل طور

سے لکھنؤ میں مکین ہو جانے کے بعد میرے شاعرانہ حلقے کی رونق بنے رہے۔ یہ حلقہ ختم ہوگیا لیکن ہمارے تعلقات بدستور قائم ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ جسٹس ورما بھی میرے کرم فرما رہے، ان کی دختر شلپی اور میری بیٹی درِ ثمین ہمدرس رہیں اور اس تعلق سے ہماری ملاقات ہوئی اور ان کی زندگی کے آخر تک قائم رہی۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شکلا، ڈاکٹر افضال احمد ایڈوکیٹ کے یہاں شعری نشستوں میں تشریف لایا کرتے تھے اور وہیں سے ان سے شناسائی ہوئی جو دوستی میں تبدیل ہوگئی۔

لکھنؤ کے کچھ ڈاکٹر بھی میرے خاص کرم فرما رہے۔ پروفیسر وہال کا کچھ ذکر کر چکا ہوں۔ موصوف طالبعلمی کے زمانے سے میرے ساتھ شطرنج کھیلے ہوئے ہیں۔ انھیں کے کلاس فیلو جے۔ بی چارلس کا ذکر کر چکا ہوں۔ وہ جمنیزیم کے میرے ساتھی تھے۔ اسی گروپ کے ڈاکٹر رگھوبیر سنگھ سیٹھ کا پیراکی کے سلسلے میں ذکر کر چکا ہوں۔ چارلس اور سیٹھ بھی اب دنیا میں نہیں ہیں اور ڈاکٹر وہال میڈیکل کالج میں پیتھالوجی کے پروفیسر کے عہدے سے تقریباً بیس سال پہلے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ طالبعلمی کے زمانے کے ساتھیوں میں ڈاکٹر وقار اور ڈاکٹر منصور کا ذکر کر چکا ہوں۔ منصور انگلینڈ چلے گئے تھے، وقار پاکستان۔ پتہ نہیں اب حیات ہیں یا نہیں۔ انھیں کے ساتھیوں میں ڈاکٹر عبدالحلیم میڈیکل کالج میں تشریحِ اعضاء کے پروفیسر تھے اور شہر کے معروف معالج ہیں۔ ڈاکٹر منصور حسن ہارٹ اسپشلسٹ ہیں اور میرے خاص عنایت فرما۔ آج میڈیکل یونیورسٹی کے میرے سب ساتھی جن میں ڈاکٹر کیسری کشور، ڈاکٹر بھارگوا، ڈاکٹر آر کے سنگھ، سب ختم ہو چکے ہیں اور صرف پروفیسر مسز وادوانی ڈنٹل کالج میں ابھی کام کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر وقار اور ڈاکٹر منصور کے غالباً دو سال کے بعد کے گروپ میں ڈاکٹر مہدی حسن کا ذکر بھی ضروری ہے۔ موصوف غلام حسین آئی۔ اے۔ ایس کے چھوٹے بھائی ہیں اور علی گڑھ میڈیکل کالج میں

پروفیسر کے عہدے سے رٹائر ہوکر اب مستقلاً لکھنؤ میں آگئے ہیں۔ میرا بحیثیت بڑے بھائی کے خیال کرتے ہیں۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹروں میں اشتیاق حسین قریشی صاحب میرے اچھے دوستوں میں تھے۔ چند سال قبل ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ میرے استاد زادے ڈاکٹر انور مسعود لکھنؤ ہومیو پیتھک میڈیکل کالج میں استاد تھے اور اب رٹائر ہوکر اپنا مطب کرتے ہیں۔ لکھنؤ طب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کے کچھ معروف اطباء کا ذکر کر چکا ہوں۔ حکیم عبدالجلیل خاندانِ اطباء جھوائی ٹولہ کی آخری شمع تھے جو کئی سال ہوئے بجھ چکی۔ موصوف میرے خاص ملنے والے تھے۔ انھیں کے تکمیل الطب کے ساتھی حکیم فاروق حسن میرے عزیز تھے۔ مدّت ہوئی وفات پا گئے۔ میرے اس آخری زمانے میں حکیم بشیر احمد صاحب مرحوم کے بیٹے اور معروف حکیم عبدالحلیم صاحب کے شاگرد حکیم مشیر احمد خالص طبی انداز میں علاج کرنے والے رہ گئے تھے۔ دو سال ہوئے وہ بھی نہ رہے۔ شہر کے مشہور طبیب حکیم نقی صاحب کے نواسے اور جانشین حکیم صفدر نواب میرے خاص دوستوں میں تھے۔ وہ حکیم مشیر سے پہلے ہی چلے گئے اور طب کا مرکز لکھنؤ ان دونوں کی وفات کے بعد اب اطباء سے خالی ہوگیا۔ میرے دوست حکیم شکیل شمسی بہت پہلے ہی جا چکے تھے۔ چند مہینے ہوئے ان کے شاگرد حکیم خالد یوسف بھی ختم ہوگئے۔ مرحوم میرے شاگردوں میں تھے۔

لکھنؤ سماجی کارکنوں سے اپنے تعلقات کے سلسلے میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ خواجہ رائق ایک ایسے کارکن ہیں جو بیک وقت مختلف سماجی کاموں کی میٹنگ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ ۱۹۴۸ء کے میرے شاگردوں میں ہیں اور اس وقت جب ان کی عمر ۸۴ سال ہوگئی ہے، ان کی سماجی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ رئیس فاطمی صاحب خاکسار تحریک کے تنہا علمبردار لکھنؤ میں باقی رہ گئے ہیں۔ ان کی پوری زندگی سماجی خدمات میں صرف ہوئی۔ وہ میرے داماد

احمد شکیل کے سگے چچا ہیں۔ظفریاب جیلانی پیشے سے وکیل ہیں لیکن ان کا زیادہ وقت سماجی کاموں میں صرف ہوتا ہے جس میں اسلامیہ کالج اور انجمن اصلاح المسلمین کے تحت کام کرنے والے اداروں کی دیکھ بھال بھی شامل ہے۔ پروفیسر روپ ریکھا ورما میری یونیورسٹی کی جونیر ساتھیوں میں تھیں اور بہت جلد ترقی کر کے پروفیسر اور اس کے بعد وائس چانسلر ہوگئی تھیں۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد اب ہمہ تن سماجی کاموں خصوصاً خواتین سے متعلق مسائل کے حل کرنے میں پیش پیش رہتی ہیں۔ میرے ان کے یونیورسٹی کے قائم شدہ تعلقات آج بھی برقرار ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی نے بھی اپنی زندگی مسلم خواتین کی بہبود کے لیے وقف کر رکھی ہے۔موصوفہ بھی میری ایک زمانہ کی شاگرد ہیں۔

سیاست دانوں سے میں نے ہمیشہ دور رہنا پسند کیا پھر بھی کچھ ہستیاں ہیں جن سے میرا رابطہ رہا اور ان کا ذکر کرنا مناسب ہے۔محسنہ قدوائی صاحبہ اور اخلاق الرحمان صاحب کے ہمارے خاندانی تعلقات ہیں۔اس کے علاوہ محسنہ صاحبہ میرے داماد احمد شکیل کی خالہ اور اخلاق صاحب ماموں ہیں۔محسنہ صاحبہ کے خسر جمیل الرحمان صاحب میرے چچا منظور الحق صاحب کے ہم درس بھی تھے۔بیگم حامدہ حبیب اللہ جو کبھی ریاستی وزیر رہ چکی ہیں لیکن اب سیاست میں ان کا نام نہیں آتا میرے پھوپھا کے خالہ زاد بھائی شیخ حبیب اللہ کی بہو ہیں اور اسی رشتے کی وجہ سے ان کے شوہر جنرل عنایت حبیب اللہ کے رٹائر ہو کر مستقل طور پر لکھنؤ آنے کے بعد سینٹ جانس اسکول کے جلسے میں بلا کر ان کی عوامی زندگی کا آغاز کیا تھا۔نرائن دت تیواری صاحب سے میرا تعارف ان کے کلاس فیلو اور میرے دوست کاظم رضا زیدی مرحوم نے کرایا تھا۔ سیاست دانوں میں اتنے شریف لوگ میں نے کم ہی دیکھے۔ان سے میرے تعلقات آج تک جب ہم دونوں اسّی سال کی عمر سے متجاوز ہو چکے ہیں، برقرار ہیں۔سبطِ رضی صاحب اور ظفر علی

نقوی میرے چھوٹوں میں ہیں اور دونوں ہی حضرات میرا خیال رکھتے ہیں۔ متذکرہ بالا حضرات میں سب ہی وزارت، گورنری اور دوسرے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ کسی کا ممنون احسان نہیں ہوں۔

اپنے شعر و سخن کے ساتھیوں کا ذکر میں اپنی شاعری کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ اس دور کے میرے آخری دوست عمر انصاری تھے جو سالِ گذشتہ وفات پا گئے۔ اب جو حضرات ہیں وہ میرے چھوٹوں میں ہیں۔ ان سب کا بھی ذکر کر چکا ہوں اور یہی لوگ اب لکھنؤ کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں تسنیم فاروقی، نسیم اختر اور معراج فیض آبادی اچھے شعر کہنے والوں میں ہیں۔

اپنے شاگردوں کے سلسلے میں مجھے اپنے استاد۔ ڈی۔ پی مکھر جی صاحب کا ایک قول یاد آ رہا ہے۔ موصوف کہا کرتے تھے کہ میرا شاگرد وہی ہے جس نے مجھ سے کچھ حاصل کیا ہو اور اگر کسی کو ایسا ایک شاگرد بھی ہر سال ملتا رہے تو وہ پورے کیریر میں تیس پینتیس صحیح معنوں میں شاگردوں کا استاد کہا جا سکتا ہے اور یہ تعداد کچھ کم نہیں ہوتی۔ یہی کچھ میرا بھی خیال ہے۔ فارسی اور اردو عموماً وہ طلباء لیتے ہیں جنھیں دوسرے مضامین میں داخلہ نہیں ملتا۔ ایسے طلباء میں اگر کسی نے کچھ اچھے شاگر پیدا کر لیے تو اسے ناکامی نہ کہا جانا چاہیے۔ ابتدا، یعنی جب میں نے ۱۹۴۸ء میں ہائی اسکول کے بچوں کو پڑھایا تھا، اس وقت سے لے کر یونیورسٹی سے رٹائر ہونے تک مجھے بھی کچھ ایسے شاگرد ملے جنھیں نظر انداز نہ کیا جانا چاہیے۔ ہائی اسکول کے میرے شاگردوں میں دو قابلِ ذکر ہیں۔ پہلے ڈاکٹر اظہار حسین اور دوسرے ان کے ساتھی سید محمد وصی۔ اظہار انتہائی شائستہ بچوں میں تھے لیکن کلاس میں ان کی پوزیشن وصی کے بعد سکنڈ ہوتی تھی۔ عملی زندگی میں وہ وصی سے آگے نکل گئے۔ پیرس یونیورسٹی سے انھوں نے ریاضی (Maths) میں ڈاکٹریٹ کی۔ پہلے کشمیر یونیورسٹی میں اور اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں ریاضیات (Mathematics)

کے برسوں پروفیسر رہے اور کم عمری میں ہی فوت ہو گئے۔ وصی بھی علی گڑھ میں انجینئرنگ کالج میں ریاضی کے ریڈر رہ کر رٹائر ہو گئے اور علی گڑھ ہی میں مقیم ہیں۔ شیعہ کالج میں ایک سال بی۔ اے۔ کے طلباء کو پڑھانے کے دوران بھی دو طالبعلم ایسے ملے جنھیں بھول نہیں سکتا۔ ایک صاحب ولایت حسین کاظمی تھے جو لکھنؤ میونسپل کارپوریشن میں اکاؤنٹنٹ تھے اور عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ انتہائی شریف اور علم کے شوقین تھے۔ بعد کو اکاؤنٹ آفیسر کی حیثیت سے رٹائر ہوئے اور بہت عرصہ ہوا جب وفات پا چکے۔ دوسرے محسن عثمانی تھے جنھوں نے بعد کو علم اجتماع (Sociology) میں ایم۔ اے۔ کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی کے سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں لکچرر ہو گئے لیکن کچھ عرصے کے بعد شبلی کالج، اعظم گڑھ میں بحیثیت پرنسپل چلے گئے۔ وہاں مجلسِ انتظامیہ سے نہ بنی اور انھیں کالج چھوڑنا پڑا اور تبلیغی جماعت کے اہم رکن بن گئے۔ یونیورسٹی ملازمت کے دوران صرف چند نام سامنے آرہے ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں پہلا نام ڈاکٹر احسن الظفر کا ہے۔ وہ میرے تنہا شاگرد ہیں جن پر مجھے ناز ہے۔ انھوں نے اپنی محنت سے ایران کبھی نہ جانے کے باوجود فارسی تحریر و تقریر میں وہ مہارت حاصل کر لی ہے جو کم ہی لوگوں کے حصّہ میں آتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ پروفیسر ہونے سے پہلے ہی رٹائر ہو گئے۔ میرے دوسرے لائق شاگرد ڈاکٹر رفیع الدین کاظمی ہیں۔ ان کا ہمیشہ فرسٹ کلاس کیریر رہا اور محکمۂ زراعت میں ملازمت کے دوران انھوں نے حصولِ علم کو نہ چھوڑا اور فارسی میں ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور نقصان اٹھانے کے باوجود چند سال شبلی ڈگری کالج میں فارسی پڑھائی۔ اب رٹائر ہو چکے ہیں۔ ان کے اور احسن الظّفر صاحب کے فارسی زبان میں مضامین قندِ پارسی میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر اودھ بہاری سرن چوبے میرے ان شاگردوں میں ہیں جنھوں نے محض حصولِ علم کے لیے فارسی پڑھی۔ وہ شیعہ کالج میں ہندی کے لکچرر تھے اور عمر میں مجھ سے

زیادہ۔ انھوں نے فارسی میں پہلے ایم۔اے کیا اور بعد کو پی۔ایچ۔ڈی۔ کے لیے میں نے انھیں جو مضمون دیا اس پر کام کرنا محض فارسی داں کے لیے ممکن نہیں اگرچہ ان کے نتائج سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ان کی کتاب **Traces of Vedantic Philosophy in Persian Poetry.** شائع ہو چکی ہے۔ مجھے سید محمد زبیر بھی یاد آ رہے ہیں۔ وہ ان شاگردوں میں تھے جنھوں نے فارسی لکچرر تک محدود ہونا پسند نہ کیا اور انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں اب بھی اسٹنٹ کمشنر ہیں۔ ایسے ہی ایک دوسرے شاگرد ظفریاب جیلانی ہیں۔ شاید میرے وہ تنہا طالبعلم ہیں جنھوں نے کبھی کلاس نہیں چھوڑا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے **LL.M** کیا اور شیعہ کالج میں قانون کے صدر شعبہ رہے اور پریکٹس بھی کرتے رہے۔ آج شہر کے شہرت یافتہ وکیل اور اہم سماجی کارکن ہیں۔ بیگم نسیم اقتدار علی بھی ان ہستیوں میں ہیں جو علم کو صرف علم کے لیے حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو میں **Ph.D.** کیا ہے اور شہر کی اہم سماجی کارکن خواتین میں شمار ہوتی ہیں۔ ظفریاب جیلانی کی طرح وہ بھی انتہائی شائستہ ہیں اور دورۂ طالبعلمی میں انھوں نے بھی کبھی کلاس نہ چھوڑا۔ صاحبِ صلاحیت شاگردوں میں ڈاکٹر سلمان عباسی مرحوم اور مسلم شبنم نوری کو بھی شمار کرتا ہوں لیکن افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ان سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ سلمان آخری عمر میں لکچرر ہو گئے لیکن کچھ نہ کیا۔ مسلم نوری زندگی بھر ممتاز ڈگری کالج میں پڑھاتے رہے لیکن تقرر کے وقت جو مجھ سے وعدہ کیا تھا وہ نہ پورا کیا۔ حد یہ ہے کہ پی۔ایچ۔ڈی تک نہ کیا۔ اپنے چند اور شاگردوں کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک ادیب الہندی مرحوم تھے۔ شیعہ عالم دین تھے اور اپنے علمی ذوق کو تسکین دینے کے لیے فارسی پڑھ رہے تھے۔ ایم۔اے کے بعد پی۔ایچ۔ڈی کرنا چاہتے تھے لیکن موت نے فرصت نہ دی۔ دوسرے ڈاکٹر رئیس نعمانی ہیں جنھوں نے انتہائی معیاری تحقیقاتی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل

کی۔ یہ مقالہ خدا بخش لائبریری سے شائع ہو چکا ہے۔ اپنی آزاد فطرت اور صاف گوئی کی وجہ سے ترقی نہ کر سکے اور فی الحال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے منٹو سرکل اسکول میں فارسی پڑھا رہے ہیں۔ فارسی میں شعر کہتے ہیں اور میری سنجیدگی سے فارسی گوئی میں ان کے اصرار کا کافی حد تک ہاتھ ہے۔ اعجاز زیدی بھی میرے لائق شاگرد تھے۔ شیعہ کالج میں پارٹ ٹائم ٹیچر کی حیثیت سے مدّتوں پڑھایا۔ اب پتہ نہیں کہاں ہیں۔ شہر کے مشہور ماہر تعلیم خواجہ یونس بھی میرے شاگرد رہ چکے ہیں۔ انھوں نے ارم اسکولوں اور کالجوں کا شہر اور شہر کے باہر جال پھیلا دیا ہے۔ ساجد زید پوری کافی صاحبِ صلاحیت تھے۔ اپنی قناعت پسند طبیعت کی وجہ سے سلطان المدارس میں بحیثیت لائبریرین کام کرتے ہیں۔ فنِ تاریخ گوئی میں لکھنؤ میں اگر میرا کوئی جانشین ہوگا تو وہ ساجد ہوں گے۔ ان سب کے علاوہ شوقیہ علم حاصل کرنے والوں میں سردار پریم جیت سنگھ بھی یاد آ رہے ہیں۔ جیالوجیکل سروے آف انڈیا میں ملازمت کے دوران فارسی میں ایم ۔ اے ۔ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ بیرونِ ہند کے طالبعلموں میں محمد حسین شکوہیان سائنس کے طالبعلم تھے لیکن فارسی ادب پڑھنے کے لیے ایم ۔ اے ۔ میں داخلہ لیا تھا۔ ایرانی انقلاب کے دوران کچھ پریشانیوں میں مبتلا رہ کر ایران واپس چلے گئے۔ دو افغان شائقینِ علم بھی یاد آ رہے ہیں جو افغانستان کی خانہ جنگی کے دوران ہندوستان آ گئے تھے۔ ان میں عارف کا شعری ذوق بہت ستھرا تھا۔ ان کی شخصیت پر اصرار تھی اور کچھ لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے ایم ۔ اے ۔ کیے بغیر انھیں یونیورسٹی چھوڑنا پڑی۔ دوسری افغان طالبہ آدینہ تھیں۔ مجھے نہیں پتا اب یہ لوگ کہاں ہیں۔ وزیٹنگ پروفیسر (Visiting Professor) کی حیثیت سے کشمیر یونیورسٹی میں ایک سشن کے دو بیچوں کو پڑھانے کا موقع ملا تھا۔ ان میں ایک نہایت باذوق طالبہ تھیں۔ ان کا نام ذہن سے نکل گیا ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ کشمیر ریڈیو میں کام کر رہی ہیں اور ان کا کشمیر کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتا

ہے۔شعر گوئی کا شوق انھیں طالبعلمی ہی کے زمانے سے تھا۔کشمیر کے ایک کالج کے استاد محمد شفیع بچھ نے میرے تحت لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کیا تھا لیکن حالات نے انہیں کالج سے نکل کر یونیورسٹی نہ جانے دیا۔ غالبًا اسی زمانے کے میرے شاگردوں میں مظفر سلطان حسین ترابی بھی تھے جنھوں نے میری بیوی کے ساتھ فارسی میں ایم۔اے کیا تھا۔ صاحبِ استعداد تھے اور میں ان سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرانا چاہتا تھا جو وہ نہ کر سکے اور مراد آباد کے ایک ڈگری کالج میں پڑھا رہے ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے موجودہ صدر شعبۂ فارسی عارف ایوبی اور صدر شعبۂ علومِ مشرقیہ محمد تقی علی عابدی بھی میرے شاگردوں میں تھے۔ یہ دونوں ہم درس رہ چکے ہیں۔ تقی علی عابدی متعدد کتابوں کے مصنّف ہیں۔ بنارس یونیورسٹی کے موجودہ صدر شعبۂ فارسی ڈاکٹر عمر کمال الدین بھی میرے لائق شاگردوں میں تھے۔ ممتاز کالج میں پڑھانے والی فرزانہ بیگم میری شاگرد تھیں۔ انہوں نے ڈاکٹر احسن الظفر کے تحت پی۔ ایچ۔ ڈی کیا تھا۔ اب وہ ایک کتاب ''سید شاہ محمد حسن اشرف الٰہ آبادی حیات اور کارنامے'' کی مصنفہ ہیں۔ میری ایک اور شاگرد ماہِ ناز ہیں انہوں نے بھی ڈاکٹر احسن الظفر کے تحت ڈی۔ لٹ کیا ہے اور بحیثیت مہمان استاد کے لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہیں۔ اسی دور کے شاگردوں میں جبار علی رضوان بھی ہیں۔ انھوں نے شعبۂ علومِ مشرقیہ سے کئی ڈپلومے حاصل کرنے کے بعد فارسی اور اُردو دونوں میں ایم۔اے کیا اور میرے اردو کلام پر Ph.D بھی کیا لیکن ابھی تک قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ جبّار کی ساتھی ڈاکٹر صبیحہ انور نے بھی فارسی میں ایم۔اے کیا۔ وہ اس وقت کرامت حسین کالج میں اُردو پڑھا رہی تھیں اور بعد کو وہاں کی پرنسپل ہو گئیں۔ یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد بھی وقتاً فوقتاً جو طلباء میرے پاس حصولِ علم کے لیے آتے رہے ان میں رٹائرمنٹ کے گیارہ سال بعد کے بیچ کے ایک طالبعلم ڈاکٹر علی سلمان رضوی کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۹۸ء میں لکھنؤ سے ایم۔اے کرنے کے بعد وہ ایران چلے گئے

تھے اور وہاں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سالِ گذشتہ واپس آئے ہیں۔ اسی دوران انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کرلیا۔ حال ہی میں موصوف ''آزادیٔ ہند کے بعد ہندوستان میں فارسی شاعری'' پر ایک کتاب شائع کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر انیس اشفاق کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ اُردو کے طالبعلم ہونے کی حیثیت سے کبھی میرے شاگرد نہ رہے لیکن ایک استاد کی طرح میرا احترام کرتے ہیں۔ اس وقت وہ صدر شعبۂ اردو ہیں اور ہندوستان میں اہم اُردو پروفیسروں میں ان کا شمار ہے۔ اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں اپنے پڑھائے ہوئے شاگردوں کے علاوہ بھی کچھ حضرات ہمیشہ (یونیورسٹی ملازمت کے پہلے اور اس کے بعد بھی) میرے پاس حصولِ علم کے لیے آتے رہے۔ ان میں دو کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر اخلاق حسین کیفؔ کے والد اور چچا میرے بزرگوں میں تھے اور انھوں نے اخلاق کو میرے سپرد کر دیا تھا۔ میں انھیں سائنس کی طرف لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ ادبیات کے میدان میں آگئے۔ عربی ڈیپارٹمنٹ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد ڈی۔ اے۔ وی کالج میں ایشین کلچر کے لکچرر ہوئے اور بحیثیت ریڈر رٹائر ہونے کے بعد شعر و شاعری اور مریضوں کی خدمت میں وقت کاٹتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اپنے اشعار پر مجھ سے مشورہ لے کر حقِّ شاگردی ادا کر رہے ہیں۔ میرے گھر پر آکر پڑھنے والوں میں دوسرے صاحب میرے دوست حسن یاور نقوی کے ہمراہ آنے والے وہ صاحب ہیں جنہوں نے اپنا نام بہت بعد کو حسین علی جعفری بتایا تھا۔ ان کا ذکر کہیں پہلے کر چکا ہوں۔ وہ دو سال تک مجھ سے انگریزی پڑھتے رہے اور برسوں کے بعد جب پھر میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ ڈاکٹر جعفری کی حیثیت سے امریکن یونیورسٹی، بیروت کے پروفیسر تھے۔

مجھے فخر ہے کہ میرا ہر شاگرد، خواہ میں خود اسے بھول چکا ہوں، جسے میں نے کسی منزل میں پڑھایا ہو میرا آج بھی ویسا ہی احترام کرتا ہے جیسا اس وقت جب میں نے اسے پڑھایا تھا۔

اکیسواں باب

میرا گھر اور خاندانی عزیز

''فقط دودمانم جہانِ منست''

اپنے خاندان اور آباؤ اجداد کے متعلق ابتدا ہی میں میں لکھ چکا ہوں۔ قارئین کی یاددہانی کے لیے یہاں اتنا عرض کرنا ہے کہ میرے پردادا مولانا امان الحق صاحب، جن کا ذکر ہو چکا ہے، کے چار بیٹے اور ایک صاحبزادی تھیں۔ ان صاحبزادی کا عقد شیخ محمد شفیع صاحب کے ساتھ ہوا تھا جن کی صرف ایک بیٹی تھیں جنکا عقد قصبۂ بجنور (ضلع لکھنؤ) کے شیخ مہدی حسن کے ساتھ ہوا تھا۔ (شیخ مہدی حسن صاحب مولانا امان الحق صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا لمعان الحق صاحب کے داماد شیخ خورشید حسن صاحب کے چھوٹے بھائی تھے)۔ ان رشتے داریوں کے علاوہ اس خاندان سے پہلے کی بھی رشتہ داریاں تھیں۔ اس شادی سے مہدی حسن صاحب کی صرف ایک صاحبزادی صالحہ بانو تھیں۔ ان کی پیدائش کے بعد ہی ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور ان کی پرورش کے سلسلے میں شیخ مہدی حسن صاحب کے ساتھ میری سگی بڑی پھوپھی کی شادی کر دی گئی جو عمر میں ان سے بہت کم تھیں۔ اس شادی کے نتیجہ میں شیخ مہدی حسن صاحب کے کئی اولادیں ہوئیں لیکن صرف ایک بیٹی شاہدہ بانو زندہ بچیں اور خدا کے فضل سے آج بھی موجود ہیں۔ ان کی

شادی سید قمر الحسن صاحب کے ساتھ ہوئی اور ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں موجود ہیں۔ بڑے بیٹے ضیاء قمر بینک میں ملازم ہیں، ان سے چھوٹے شہاب قمر لکھنؤ میں پی۔ سی۔ او کھولے ہوئے ہیں اور سب سے چھوٹے سلمان قمر اعظم گڑھ میں تجارت کرتے ہیں۔ بڑی بیٹی صفیہ قمر کی شادی میرے چچازاد بھائی عبدالوہاب سے ہوئی اور چھوٹی بیٹی رعنا کی شادی سترکھ ضلع بارہ بنکی کے شوقؔ قدوائی کے پرپوتے طارق قدوائی کے ساتھ ہوئی۔ صالحہ بانو کی شادی ان سے عمر میں کافی بڑے ان کے چچازاد بھائی شیخ وحید حسن صاحب سے ہوئی لیکن دونوں لاولد رہے اور عرصہ ہوا دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ مولانا امان الحق صاحب کے چار بیٹے تھے۔ سب سے بڑے میرے دادا مولانا فضلِ حق، ان سے چھوٹے مولانا ضیاء الحق، ان سے چھوٹے مولانا منہاج الحق اور سب سے چھوٹے حکیم ممتاز الحق۔ میرے دادا بسلسلۂ ملازمت حیدرآباد چلے گئے تھے جہاں ان کے دو چچازاد بھائی مولانا شمس الحق بن مولانا لمعان الحق صاحب اور مولانا امتیاز الحق بن مولانا لمعان الحق بھی ان کے بعد پہنچ گئے تھے۔ ان میں دو بھائیوں کا انتقال حیدرآباد ہی میں ہوا اور تیسرے مولانا شمس الحق صاحب کو گردش تقدیر آخری دنوں میں پاکستان لے گئی اور وہ وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ مولانا لمعان الحق صاحب کے منجھلے بیٹے حکیم وہاج الحق صاحب لکھنؤ ہی میں رہے۔ ان کے بیٹے حکیم معراج الحق صاحب لاولد رہے۔ اس طرح مولانا لمعان الحق صاحب کا گھر بے چراغ ہو گیا اور چند ماہ قبل کی بارش میں گر بھی گیا۔ میرے دادا کے سگے چھوٹے بھائی ضیاء الحق صاحب کی پہلی بیوی زنِ بیرونی تھیں۔ ان کی موجودگی ہی میں انھوں نے دوسری شادی کی لیکن کسی بیوی سے اولاد نہ ہوئی۔ تیسرے بھائی منہاج الحق صاحب کی شادی میری بڑی خالہ کے ساتھ ہوئی تھی جن سے ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹے مصباح الحق

صاحب ہوئے۔ بیٹیوں کا انتقال بچپن میں ہوگیا اور والدین کے انتقال کے بعد مصباح الحق صاحب کی پرورش ان کے بڑے چچا ضیاء الحق صاحب نے کی۔ جیسا ذکر کر چکا ہوں، مصباح الحق صاحب کا عین جوانی میں لاولد انتقال ہوگیا۔ چوتھے بھائی ممتاز الحق صاحب کا طاعون میں پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ اس طرح مولانا امان الحق صاحب کی تیسری پشت میں صرف میرے دادا فضلِ حق صاحب کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں رہ گئیں۔ بڑی بیٹی کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ چھوٹی بیٹی کی شادی سید نپور میں شیخ محبوب علی صاحب کے ساتھ ہوئی جن کے چار بیٹے محمد لطیف، محمد الطاف، محمد حسیب اور محمد امین اور تین بیٹیاں شمیم فاطمہ، نسیم فاطمہ، اور صبوحی خدا کے فضل سے آج بھی موجود ہیں۔ لطیف کی شادی اناؤ میں ہوئی اور ان کی ایک بیٹی سارہ اور ایک بیٹے سیف ہیں۔ دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔ الطاف کی شادی ایک سید خاندان میں ہوئی ہے ان کے دو بیٹے اسامہ اور اویس ہیں۔ دونوں ملازم ہیں لیکن شادی کسی کی نہیں ہوئی ہے (اسامہ کی شادی حسیب کی بیٹی آمنہ کے ساتھ طے ہوگئی ہے)۔ تیسرے بیٹے محمد حسیب کی دو بیٹیاں آمنہ اور فاطمہ ہیں۔ چوتھے بیٹے محمد امین کی تین بیٹیاں سعدیہ، صوبیہ، اور عائشہ ہیں۔ یہ پانچوں بیٹیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ فضلِ حق صاحب کے بیٹوں میں سب سے بڑے ذکا الحق کی اولاد زندہ نہ رہی اور وہ اپنی والدہ کی زندگی ہی میں ہمیشہ کے لیے لاپتہ ہوگئے۔ ان سے چھوٹے میرے والد مولانا وجیہ الحق صاحب تھے۔ ان کی شادی سرسنڈے ضلع بارہ بنکی میں رزّاق بخش صاحب کی صاحبزادی فرحت النساء کے ساتھ ہوئی جو میری والدہ تھیں۔ میرا ایک اور بھائی وسیم الحق تھا جو ماں کے مرنے کے بعد زندہ نہ رہ سکا۔ اس طرح وجیہ الحق صاحب کی تنہا اولاد میں رہا جس کی عمر والدہ کے انتقال کے وقت ڈھائی سال تھی۔ تیسرے بھائی وحید الحق صاحب کی شادی

خیرآباد ضلع سیتاپور میں ولی النساء بیگم سے ہوئی جن سے پانچ بیٹے ہوئے لیکن صرف تین زندہ بچے۔ محمد شعیب فرید الحق، محمد زبیر رشید الحق، اور محمد طلحہ شفیق الحق۔ شعیب بِرلا کی المونیم فیکٹری HINDALCO میں انجینئر تھے اور اب رٹائر ہو کر لکھنؤ آ گئے ہیں۔ ان کی شادی ان کی پھوپھی زاد بہن نسیم فاطمہ کے ساتھ ہوئی۔ ان کے دو بیٹے فرخ نور الحق اور زہیر ازہار الحق ہیں۔ ایک بیٹی صبا ہے جس کی شادی سندیلہ کے عاصم ہاشمی کے ساتھ ہوئی ہے جو میرے داماد احمد شکیل ہاشمی کے چچا کے بیٹے ہیں۔ فرّخ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے M.D کیا ہے اور اب سعودی عرب میں ملازمت کر رہے ہیں اور زہیر لکھنو یونیورسٹی میں فنونِ لطیفہ (Fine Arts) میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر فرّخ کی شادی لکھنؤ کے مشہور وکیل شعیب صاحب کی پوتی سے ہوئی ہے اور ایک بیٹے علی کے باپ ہیں۔ وحید الحق صاحب کے دوسرے بیٹے محمد زبیر رشید الحق ڈاکٹر ہیں اور انگلینڈ تعلیم حاصل کرنے گئے تھے اور وہیں کے ہو رہے۔ ان کی شادی ان کے ننہالی عزیزوں میں ہوئی۔ ایک بیٹی گُل اور ایک بیٹے عمیر امان الحق ہیں۔ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ زبیر سے چھوٹے طلحہ ہیں۔ وہ انجینئر اور M.B.A ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا میں بہت اونچی پوسٹ پر ہیں۔ ان کی شادی دریاباد کے قدوائی خاندان میں ہوئی۔ دو بیٹے ہیں۔ بڑے احمد فضل حق انجینئر ہیں اور ملازمت کر رہے ہیں۔ فی الحال امریکہ میں ہیں۔ چھوٹے بیٹے یاسر برہان الحق ابھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وحید الحق صاحب سے چھوٹی میری بڑی پھوپھی تھیں جن کا ذکر کر چکا ہوں۔ ان سے چھوٹے مولانا منظور الحق صاحب تھے جو گورنمنٹ اسکولوں میں عربی کے استاد رہے۔ اپنی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ان کا بھی کچھ ذکر کر چکا ہوں۔ یہاں صرف اتنا اور لکھنا ہے کہ مجھ سے محبت کرنے میں وہ اور چچی حسینہ بیگم ماں باپ سے کم نہ تھے۔ چچی کے پورے خاندان

(نانہال اور دادیہال) نے مجھے وہ محبت دی جس سے زیادہ اگر میری ماں کے خاندان میں کوئی ہوتا تو وہ بھی نہ دیتا۔ یہ سلسلہ ہنوز برقرار ہے۔ منظور چچا کی متعدد اولادوں میں صرف آخری دو زندہ بچیں۔ بڑی بیٹی عابدہ اور ان سے چھوٹے بیٹے عبدالوہاب خدا کے فضل سے حیات ہیں۔ عابدہ کی شادی سہسوان ضلع بدایوں میں ہوئی۔ ایک بیٹے انس واجد اور ایک بیٹی ماریہ واجد ہیں۔ انس کی شادی ایک عباسی خاندن میں ہو چکی ہے۔ عبدالوہاب چیف انجینئر کے عہدے سے رٹائر ہوئے۔ ان کی شادی میری بڑی پھوپھی کی نواسی صفیہ قمر کے ساتھ ہوئی۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ محمد اسعد، محمد سعد اور محمد سعید۔ اسعد نے ایم۔ بی۔ اے کیا ہے اور دہلی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ ان کی شادی کاکوری میں صدف کے ساتھ ہوئی ہے۔ ایک بیٹی یاسمین کے باپ ہیں۔ محمد سعد کی شادی اپنی خالہ زاد بہن کے ساتھ ہوئی ہے اور اس وقت دوبئ میں ملازمت کر رہے ہیں۔ سعید جن کی حیثیت میرے دوسرے بیٹے کی ہے زیرِ تعلیم ہیں اور M.B.A کر رہے ہیں۔ میرے سب سے چھوٹے چچا ظہور الحق صاحبؒ نے شادی نہ کی۔ میرے باپ چچاؤں میں کوئی حیات نہیں۔ چھوٹے چچا سے ایک چھوٹی بہن تھیں جو میری چھوٹی پھوپھی تھیں جن کا اور جن کی اولادوں کا ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن جیسا لکھ چکا ہوں، حالات ایسے رہے کہ سب بھائیوں بہنوں کی اولادوں کو ساتھ مل کر رہنا پڑا جس کی وجہ سے وہ اخوت قائم رہی جو عموماً سگے بھائی بہنوں میں بھی نہیں ہوتی ہے۔ میرا میرے سب ہی Cousins بہت احترام کرتے ہیں۔ میں نے کسی کو سگے بھائی بہن سے کم نہیں سمجھا لیکن کچھ واقعات ایسے ہوئے جن سے اندازہ ہوا کہ قانونِ قدرت نہیں بدلتا۔ سگا سگا ہوتا ہے اور Cousins, Cousins ہی ہوتا ہے۔ بہت محبت اور احترام سے ملنے کے باوجود میں تنہا ہوں اس لیے کہ میں صرف ایک Cousin ہوں۔ بہرحال

جتنا کچھ میرے بھائی کررہے ہیں اسی کے لیے میں ان کا شکرگزار ہوں ورنہ خود خاندان ہی میں دوسرے گھروں میں سگے عزیزوں میں جو کچھ ہورہا ہے وہ باعثِ عبرت ہے۔ اگر ممکن ہوا تو خود فریبی سے حقیقت شناسی تک پہنچنے پر کچھ روشنی ڈالوں گا۔

میری شادی ۱۹۵۹ء میں ایک سید خاندان میں ہوئی لیکن اس سے پہلے کافی دلچسپ واقعات پیش آئے جن میں کچھ کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ابھی میں نے ایم۔اے بھی مکمل نہ کیا تھا کہ والد مرحوم کو میری شادی کی فکر ہوئی اور باندے کی ایک عزیزہ کی صاحبزادی انھیں پسند آئیں اور انھوں نے پھوپھی کو اس سلسلے میں خط لکھا لیکن پھوپھی نے اس بنیاد پر مخالفت کی کہ ان صاحبزادی کی عمر مجھ سے زیادہ تھی۔ ابھی یہ خط و کتابت چل ہی رہی تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا اور پھر شادی کا سوال ہی نہ رہ گیا۔ میرے ایل۔ایل۔بی کرنے کے دوران میرے ایک کلاس فیلو لطیف میرے پیچھے پڑ گئے کہ ان کے ملنے والے ایک پنجابی خاندان میں شادی کرلوں۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح ان سے جان چھڑائی۔ سکریٹریٹ میں فائننس ڈیپارٹمنٹ کی ملازمت کے دوران میرے ایک ساتھی دانش علی خان نے جو تعلیمی دور میں مجھ سے دو سال سینئر تھے ایک صاحب کو میرے پیچھے لگادیا۔ غالباً شادیاں کرانا ان کا پیشہ تھا۔ کچھ عرصے پہلے لکھنؤ کے ایک کشمیری خاندان کی صاحبزادے کی شادی ایک دولتمند ٹمبر مرچنٹ کے یہاں ہوئی تھی اور سنا ہے کہ انھیں ایک لاکھ روپیہ سے ٹمبر کا کاروبار کرادیا گیا تھا۔ اس زمانے میں ایک لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ مجھے یہ سبز باغ دکھایا گیا کہ اگر اسی خاندان کے ایک دوسرے فرد کی صاحبزای سے میں شادی کرلوں تو اس سے بھی زیادہ مجھ کو ملے گا۔ میں بات ٹالتا رہا لیکن وہ بری طرح میرے پیچھے پڑے رہے۔ آخر میں نے صاف کہہ دیا کہ میری شادی وہیں ہوگی جہاں میرے

چچا چاہیں گے۔ اس زمانے میں میرے چچا کی پوسٹنگ سیتاپور میں تھی۔ وہ حضرت ان کے پاس پہنچ گئے اور انھیں یقین دلا دیا کہ مَیں شادی کے لیے تیار ہوں، صرف ان کی رسمی منظوری کی ضرورت ہے۔ میرے چچا کا خط آیا جس میں انھوں نے مجھے یاد دلایا کہ خاندانِ فرنگی محل میں سوائے شیوخِ لکھنؤ کے اور کسی لکھنوی خاندان میں شادی نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی انھوں نے لکھا کہ اگر میں نے وہاں شادی کرنا طے ہی کرلیا ہے تو ان کی منظوری کی بھی کیا ضرورت۔ مجھے ان حضرت کی دروغ بیانی پر سخت غصہ آیا اور میں نے دانش علی خان صاحب سے صاف کہہ دیا کہ انھیں آئندہ مجھ سے ملنے سے سختی سے منع کر دیں۔ اس کے بعد چچا نے ایک نہایت شریف خاندان میں میری شادی طے کردی لیکن میرے حالات ایسے نہ تھے کہ یہ مزید ذمہ داری سنبھالتا۔ میں نے انکار کر دیا۔ پھر زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ میں سکریٹریٹ سے ڈائرکٹریٹ آف اکنامکس اینڈ اسٹیٹسٹکس چلا گیا جس کا ذکر کر چکا ہوں کہ وہاں کے تین سال میرے سخت ذہنی دباؤ کا وقت تھا۔ اس وقت ۴۸-۱۹۴۷ء میں حسین آباد اسکول میں میرے ساتھ پڑھانے والے میرے ایک دوست حسن یاور نقوی نے اپنے یہاں ایک خاتون زاہدہ صاحبہ سے مجھے ملایا جنھیں انھوں نے اپنی منہ بولی بہن بتایا۔ نقوی نے بتایا کہ وہ سخت دھوکے کا شکار ہو چکی تھیں جس کی وجہ سے دماغی انتشار میں مبتلا تھیں اور اسی سبب سے یکسوئی سے تعلیم حاصل نہیں کر پا رہی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے ان کی تعلیم میں مدد کرنے کو اور اگر مناسب سمجھوں تو شادی بھی کرنے کے لیے غور کرنے کو کہا۔ وہ محترمہ معمولی شکل وصورت کی تھیں اور عمر میں یقیناً مجھ سے بڑی تھیں لیکن مجھے ان سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ ایجوکیشن میرا کبھی مضمون نہ تھا لیکن میں نے اس کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور انھیں پڑھا کر بی۔ ایڈ کروا دیا۔ میرا خود یہ فائدہ ہوا کہ اس مضمون (تعلیم)

میں بھی کچھ دخل ہو گیا۔ وہ ہر حال میں مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھیں جب کہ ایک اور صاحب یوسف قریشی جو مشہور اُردو مقرر اور علی گڑھ یونیورسٹی کے اردو استاد نسیم قریشی کے بھائی تھے ان سے شادی کرنے کے متمنّی تھے۔ میں نے ان سے یوسف صاحب سے شادی کر لینے کو کہا لیکن وہ مجھ ہی سے شادی کرنے کو بضد رہیں اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بے مروّتی میری فطرت میں نہیں ہے اور بہت ممکن تھا کہ میں ان کی ضد کے آگے سپر انداز ہو جاتا لیکن ایک اور واقعہ پیش آ گیا۔ میرے مختلف عزیز چچا پر میری شادی کے لیے زور ڈال رہے تھے۔ انھیں میں میری چچی کے بھتیجے عتیق بھائی بھی تھے جن کے تعلیمی دور میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ میں رہنے کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس وقت عتیق بھائی ماشاء اللہ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ عتیق بھائی کے زور دینے پر چچا نے انھیں اجازت دے دی کہ وہ لڑکی تلاش کریں۔ اس وقت عتیق بھائی کی پوسٹنگ کانپور میں تھی۔ یہ وہ دور تھا جب میرا ٹیبل ٹینس کا شوق پورے شباب پر تھا۔ میرے مکان کے قریب ہی نظامی پریس بلڈنگ میں ہم لوگوں نے ٹیبل ٹینس کھیلنے کا انتظام کر لیا تھا۔ ایک روز حسبِ معمول میں وہاں ٹیبل ٹینس کھیل رہا تھا کہ میرے پھوپھی زاد بھائی لطیف وہاں پہنچے اور کہا کہ عتیق بھائی آئے ہوئے ہیں اور ماموں نے فوراً آپ کو بلایا ہے۔ میں گھر پہنچا۔ حکم ملا کہ فوراً شیروانی پہنو۔ مسولی میں تمہارے نکاح کا انتظار ہو رہا ہو گا۔ میں سخت حیران تھا کہ یہ کیسی شادی ہے جس پر غور کرنے کے لیے مجھے پانچ منٹ کا وقت بھی نہیں مل رہا ہے۔ بہر حال یہ معلوم ہوا کہ عتیق بھائی نے اپنی بیوی کی ماموں زاد بہن سے میری شادی طے کر دی تھی اور اس سلسلے میں انھوں نے چچا کو خط بھی لکھا تھا جو انھیں نہ ملا۔ عتیق بھائی کی کار پر میں اور چچا مسولی کے لیے روانہ ہو گئے۔ گھر میں سب سخت حیران تھے کہ یہ کس قسم کی بارات جا

رہی ہے اور کیسی شادی ہو رہی ہے جس میں دلھن کے متعلق کچھ بھی نہیں معلوم۔ ہم تین آدمیوں کی بارات مسولی پہنچی اور میرا نکاح ہو گیا۔ رخصتی آئندہ کسی تاریخ کے لیے طے ہوئی۔ رات وہیں بسر ہوئی اور صبح کو ہم تینوں آدمی لکھنؤ واپس آ گئے۔ تین چار روز کے بعد ایک روز ایک شخص میرے مکان کے قریب کی سڑک سے مجھے پوچھتا ہوا آیا اور کہا کہ ایک خاتون مجھے بلا رہی ہیں۔ میں گیا تو زاہدہ یعنی حسن یاور نقوی کی منہ بولی بہن میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انھیں اس شادی کا علم ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا کیسے۔ البتہ اس کا ضرور اندازہ ہوا کہ انھیں میری ہر ہر بات کا علم رہتا تھا۔ اس وقت ان کی سنجیدگی کچھ اور زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ راستے میں کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ گھر پہنچ کر صرف اتنی گفتگو ہوئی کہ مجھے آپ کی مجبوری کا علم ہے۔ خدا کو یہی منظور ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے جدا رہیں۔ وہ زاہدہ کی میری آخری ملاقات تھی۔ چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان چلی گئیں۔ ان کے خطوط البتہ کافی دنوں تک آتے رہے۔ وہ لکھنؤ سے بی۔ ایڈ کر چکی تھیں اور کراچی کے دو اسکولوں میں انھوں نے ملازمت کر لی تھی۔ سال بھر سے زیادہ یہ خطوں کا سلسلہ جاری رہ کر بند ہو گیا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ انھوں نے شادی کر لی۔ اب مسولی کا قصہ سنیے۔ عتیق بھائی کے سالے اشرف بھائی اپنے ماموں عبدالحلیم قدوائی صاحب پر رخصتی کے لیے زور دیتے رہے لیکن وہاں کچھ اور ہی تماشا ہو رہا تھا۔ وہاں خبر پہنچی تھی کہ میں اپنی پوری تنخواہ پھوپھی کو دے دیتا ہوں (جو غلط تھا) لہٰذا بیوی کو کیا دوں گا۔ عبدالحلیم صاحب کی بیگم کے رشتے دار شادی کے خلاف تھے۔ اس سلسلے میں مسولی کے ایک پیر حبیب احمد صاحب عتیق بھائی سے خط و کتابت کر رہے تھے۔ عتیق بھائی ان لوگوں کے روّیہ سے سخت پریشان تھے۔ شادی کے فوراً بعد ہی میرے ہم درس اور بڑے بھائی کی طرح محترم

اور عزیز دوست بانسے شریف کے جمال احمد رزاقی نے بتایا کہ میں کہاں پھنس گیا۔ اگر مسولی ہی میں شادی کرنا تھی تو ان پیر صاحب (یعنی حبیب احمد صاحب) کی صاحبزادی سے شادی کی ہوتی جن کے فرنگی محل سے تعلقات بھی تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ صاحبزادی نہ صرف جاہل محض ہیں بلکہ بدصورت بھی ہیں۔ مسولی میں اسی زمانے میں لڑکیوں کا اسکول کھلا تھا اور محض یہ دکھانے کے لیے کہ محترمہ اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں ان کا نام بھی چوتھے پانچویں درجے میں لکھوا دیا گیا تھا۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ میں اپنے کھیل کود میں مست تھا اور ان تمام باتوں کی طرف غور کرنے کا میرے پاس وقت نہ تھا۔ یکا یک ایک روز منظور چچا نے خطوط کا ایک چھوٹا بنڈل مجھے دیا۔ یہ وہ خط و کتابت تھی جو عتیق بھائی اور عبدالحلیم صاحب کے پیر حبیب احمد صاحب کے درمیان ہوئی تھی۔ خطوط سے یہ معلوم ہوا کہ عبدالحلیم صاحب رخصتی سے انکار کر کے طلاق چاہتے ہیں۔ بہانہ یہ تھا کہ صاحبزادی ماشاءاللہ بقول مرزا سودا

"بولے کہ سعادت ہے پر وہ ابھی بالی ہے"

صاحبزادی کی عمر چودہ سال بتائی گئی جبکہ عبدالحلیم صاحب کے بھانجے اشرف میاں نے خود قبولا تھا کہ دس سال قبل جب میں ایک مہینہ کے لیے اشرف بھائی کے ساتھ حیدر گڑھ میں عارضی ملازمت کے سلسلے میں رہ رہا تھا، موصوف نے اپنے بھانجے سے کہا تھا کہ یہ لڑکا جانے نہ پائے اور اسی پر اشرف بھائی نے عتیق بھائی کے ذریعہ عمل کر دکھایا تھا۔ حبیب صاحب کے آخری خط میں مجھے حکم دیا گیا تھا کہ مجھے چاہیے کہ عمر کے اس فرق کی وجہ سے طلاق دے دوں۔ ان خطوط کو دیکھ کر میری غیر سنجیدگی سنجیدگی میں بدل گئی۔ میں خود بے جوڑ شادیوں کے سخت خلاف تھا اور ہوں لیکن اب مسئلہ میرے وقار کا بن گیا تھا۔ چچا اور عتیق بھائی کو اطلاع

کیے بغیر میں نے حبیب صاحب کو جواب لکھا کہ میں آپ کا حکم ماننے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ اسی بات پر اپنے مرید عبدالحلیم صاحب سے عمل کروائیں۔ (میرے علم میں آچکا تھا کہ محترمہ ان کی دوسری بیوی تھیں جوان سے عمر میں کم از کم بیس سال چھوٹی تھیں)۔ میرا یہ خط اعلانِ جنگ تھا۔ میں پورے طور سے سمجھ چکا تھا کہ عتیق بھائی کی شرافت سے فائدہ اٹھا کر مجھے شکار کر لیا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک کنویں میں گر گیا تھا۔ لیکن بعض کنویں ایسے ہوتے ہیں جن میں اگر کوئی زندہ شخص گر جائے تو وہ اُبل کر خود اسے اچھال دیتے ہیں اور وہ کنواں بھی ایسا ہی کنواں تھا۔ لیکن مجھے بھی ضد پیدا ہوگئی تھی کہ خواہ زندگی خراب ہو جائے لیکن ان لوگوں کو بھی اپنے ساتھ اسی کنویں میں غرق کر دوں گا۔ اس وقت کرشن چندر کے ''گدھے'' (ملاحظہ فرمائیے ''ایک گدھے کی سرگذشت'' یہ گدھا کوئی فرضی گدھا نہیں تھا) نے بھی کنویں کے اندر مجھ پر دولتیاں جھاڑنا شروع کر دیں جن سے اچھل اچھل کر میں خود کو بچاتا رہا لیکن ایک مرتبہ ایسا اچھلا کہ کنویں کی جگت پر آ گرا۔ منظور چچا، عتیق بھائی اور تمام عزیز میرے اس روّیہ سے سخت پریشان تھے کہ ایک مرتبہ پھر جمال رزاقی صاحب میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ عبدالحلیم صاحب تشریف لائے تھے اور قدموں پر ٹوپی رکھ دی کہ وہ انھیں میرے عذاب سے نجات دلائیں۔ منظور چچا کی پریشانی میرے لیے سوہانِ روح تھی۔ میں نے جمال بھائی کی بات مان لی اور حلیم میاں کی شیر خوار بچی کو آزاد کر دیا۔ لیکن موڈ اتنا خراب ہو چکا تھا کہ طے کر لیا کہ آئندہ اپنی آزادی کو کسی قیمت پر فروخت نہ کروں گا۔ میری ایک پھوپھی جدّے میں اپنے بھانجے کے پاس جا رہی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے بمبئی تک پہنچانے کو کہا۔ عتیق بھائی کا کلکتہ تبادلہ ہو گیا تھا۔ بھابھی جان نے مجھ سے کلکتہ آنے کا وعدہ لے لیا۔ دورانِ سفر پھوپھی نے ایک اور رشتہ بتایا لیکن میں ٹال گیا اور

بمبئ سے حیدر آباد ہوتا ہوا کلکتہ پہنچ گیا۔ عتیق بھائی اور بھابھی جان نے مسولی ہی کی کچھ اور لڑکیاں بتائیں لیکن میں نے انکار کر دیا اور لکھنؤ چلا آیا۔ پتہ نہیں عتیق بھائی اہلِ مسولی سے کیوں اتنا مرعوب تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی، جمیل بھائی، اسی وجہ سے ان سے سخت نالاں تھے۔ چند سال اسی طرح رہا اور پھر پوری توجہ کھیل کود کی طرف ہو گئی۔ آج سوچتا ہوں کہ یہ سب تماشا کیوں ہوا تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ تائیدِ خداوندی ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ اگر مجھ سے خود کچھ غلط فیصلے ہوئے یا میرے متعلق غلط فیصلے کیے گئے تو ان کے مضر اثرات سے قدرت کی طرف سے مجھے بچالیا گیا۔ میری تھیسس کے اکزامنر بظاہر مجھے نقصان پہنچانے کے لیے مقرر کیے گئے تھے لیکن وہی میرے مددگار ثابت ہوئے۔ قاضی عبدالودود مقالہ رد کرنے کے لیے مقرر ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے اسے اس حد تک درست کروا دیا کہ کسی دوسرے صاحب کو اس پر اعتراض کرنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ مقالہ کو رد کرانے کے لیے ایرانی ممتحن مقرر کیے گئے تھے لیکن انھیں میں سے ایک کی توجہ سے وہ تہران یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔ موجودہ تماشے کے سلسلے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ مسولی کے شعبدہ بازی کا مقصد مجھے زاہدہ بیگم سے بچانا تھا۔ وہ مقصد پورا ہو گیا اور یہ کھیل ختم ہو گیا۔ بعض اوقات سوچتا ہوں کہ اگر ان جاہلوں کے چکر میں پڑا رہتا تو میرا کیا حشر ہوتا۔:

مجھ کو بچالیا مرے پروردگار نے

متذکرہ واقعات کے بعد میرے گھر میں شادی کے لیے کسی نے مجھ سے نہ کہا لیکن منظور چچا نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ انھوں نے معاملہ میرے رشتے کے چچا حیات اللہ صاحب کے سپرد کر دیا۔ میری چچی بیگم سلطانہ حیات عورتوں کی ایک انجمن بزمِ خواتین چلاتی

تھیں اور اس سلسلے میں ان کا خواتین سے مسلسل رابطہ رہتا تھا جن میں اچھے خاندانوں کی تعلیم یافتہ غیر شادی شدہ لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ میں سلطانہ چچی سے کافی بے تکلف تھا۔ وہ مجھے ہر پانچویں چھٹے روز بلا لیا کرتی تھیں۔ اُردو کے مسائل کے سلسلے میں ان سے اور حیات اللہ چچا سے میری گفتگو ہوا کرتی تھی لیکن اکثر مواقع پر کوئی نہ کوئی لڑکی بھی وہاں موجود ہوا کرتی تھی۔ چچا حیات اللہ اور چچی پہلے خود ہی میرے شادی کے سلسلے میں آپس میں گفتگو کرتے تھے لیکن عموماً حیات اللہ چچا خود ہی لڑکیوں کو رد کر دیتے تھے اس لیے کہ منظور چچا نے ان سے ''ہڈی'' کا خیال رکھنے کو کہا تھا جس کے جواب میں انھوں نے کہا تھا کہ ''جی ہاں'' گوشت کا بھی خیال رکھوں گا۔ ''ہڈی'' اور ''گوشت'' دونوں کی کوئی لڑکی ان کے سامنے نہ آ رہی تھی۔ ایک روز میری موجودگی میں تین لڑکیاں ان کے یہاں آئیں۔ ایک کا نام ہاجرہ، دوسری کا عائشہ، اور تیسری کا صفیہ بتایا گیا۔ یہ لڑکیاں حیات اللہ چچا کے معیار پر پوری اتر رہی تھیں یعنی ان میں ہڈی بھی تھی اور گوشت بھی۔ تینوں سید خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور خاصی قبول صورت بھی تھیں۔ حیات اللہ چچا نے مجھ سے کہا کہ ان میں سے کسی کا انتخاب کر لو۔ شادی کی طرف سے میرا خراب موڈ اثر کھوتا جا رہا تھا۔ ان میں سے سب سے بڑی مجھے پسند آ گئیں اس لیے کہ مجھے اندازہ ہوا کہ عمر کے لحاظ سے وہ میرے لیے مناسب رہیں گی۔ معلوم ہوا کہ ان کا نام ہاجرہ ہے اور وہ تعلیم گاہِ نسواں کے انٹر میڈیٹ سکشن میں اُردو لکچرار رہیں۔ اس سلسلے میں چند باتیں اور لکھنا چاہتا ہوں۔ ہمارے انٹرمیڈیٹ کے خاندانِ اجتہاد سے تعلق رکھنے والے ایک کلاس فیلو یوسف حسین نقوی تھے۔ نام یوسف تھا لیکن تھے سیاہ فام۔ کیونکہ سانولا رنگ بھی ایک اپنا حسن رکھتا ہے اس لیے حلقۂ احباب میں کالے یوسف کے نام سے جانے جاتے تھے۔ کالے یوسف کی بہن فاطمہ بھی تعلیم گاہ نسواں

میں ہندی کی لکچرر اور ہاجرہ خاتون کی جگری دوست تھیں۔ فاطمہ کو ان کی شادی کی فکر تھی۔ یوسف نے مجھ سے ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ یہ بات میرے گھر والوں سے کہو۔ چنانچہ انھوں نے پھوپھی سے بات کی جنھوں نے پوچھا کہ وہ لوگ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ یوسف نے بتایا کہ لکھنؤ کے۔ پھوپھی نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ہمارے یہاں اہلِ لکھنؤ سے شادی نہیں ہوتی۔ دوسری طرف فاطمہ نے میرا ذکر ہاجرہ کی والدہ سے کیا۔ انھوں نے پوچھا کون لوگ ہیں۔ فاطمہ نے کہا کہ انصاری جیسے آپ کے انصاری صاحب۔ ہاجرہ کی والدہ نے انکار کردیا کہ ہمارے یہاں انصاریوں میں شادی نہیں ہوتی۔ (علی گڑھ یونیورسٹی کے اختر انصاری کے بھائی اصغر انصاری سے ان لوگوں کے خاندانی تعلقات تھے لیکن اصغر انصاری صاحب کا تعلق مومن انصار گروپ سے تھا۔ انکار کی یہی وجہ تھی)۔ یوسف نے ہاجرہ کی جو خصوصیات مجھے بتائی تھیں وہ یہ تھیں کہ ہر وقت ہنستی رہتی ہیں اور خاندانی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ بہر حال اس وقت دونوں طرف سے انکار ہو گیا تھا لیکن خدا کی مرضی کے مطابق یہ شادی ہونا تھی۔ سلطانہ چچی نے ہمارے گھر والوں کو بتایا کہ ہاجرہ اہلِ لکھنؤ میں نہیں ہیں بلکہ ان کے خاندان کا تعلق گوپامئو ضلع ہردوئی کے ایک معتبر خاندان سے ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ہاجرہ کی والدہ کی یہ غلط فہمی دور کردی کہ میرا تعلق مومن انصار گروپ سے ہے۔ ہماری شادی ۱۳/اکتوبر ۱۹۵۹ء کو ہوگئی۔ اس وقت ہاجرہ اُردو میں ایم۔ اے تھیں۔ میری خواہش کے احترام میں انھوں نے نہ صرف اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرلیا بلکہ فارسی میں بھی ایم۔ اے کیا۔ میں نے ہاجرہ کو زاہدہ بیگم کا سارا قصّہ بتادیا ساتھ ہی ان کے بھیجے ہوئے خطوط بھی دے دیے۔ انھوں نے بتایا کہ اس پوری کہانی سے یوسف قریشی صاحب ان کے اہلِ خاندان کو پہلے ہی آگاہ کر چکے تھے۔ ہم زندگی میں سوائے اس عرصے کے

جب میں ایران میں ہوتا تھا کبھی جدا نہیں ہوئے اور صرف ۱۸راپریل ۲۰۰۰ء کو موت ہی ہمیں ایک دوسرے سے الگ کرسکی۔ یوسف نے بالکل صحیح کہا تھا کہ ہاجرہ ہر وقت ہنستی رہتی ہیں۔ حسنِ صورت کے علاوہ حسنِ سیرت اور شگفتہ طبعی میں ان کی ایسی خواتین کم ہی ملتی ہیں۔ میری بیٹی ثمین کی ایاّمِ شیر خوردگی ہی سے انھیں تکالیف شروع ہوگئی تھیں لیکن ان کی خوش مزاجی میں اس وقت تک فرق نہ آیا جب تک کینسر نے انھیں صاحبِ فراش نہ کر دیا۔ ان کو جاننے والے ابھی موجود ہیں اور میرے اس قول کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

ہاجرہ سے میری شادی طے ہونے کے بعد ان کے بڑے بھائی اخلاق جو کبھی میرے ہم درس رہ چکے تھے میرے پاس آئے۔ میں نے ان سے صاف بتا دیا کہ تم اپنی بہن کی شادی تو مجھ سے کر رہے ہو لیکن یہ تمھیں بتا دوں کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور نہ آئندہ کچھ مہینے ہو سکے گا۔ اخلاق نے کہا کہ تم سے کوئی مطالبہ نہ ہوگا۔ دوسری طرف یعنی میرے گھر میں میرے عزیز دوست نصیر الدین (جن کا ذکر کر چکا ہوں) کے ذریعہ شادی کے سلسلے میں خرچ کے لیے تقاضا کیا گیا۔ میں نے نصیر کو بتا دیا کہ وہ خود اور گھر کا ہر فرد میری آمدنی اور خرچ سے واقف ہے اس کے علاوہ کہاں سے لاؤں۔ قرض سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی اور کسی حالت میں بھی میں نے ایک پیسے کا مقروض رہنا پسند نہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت تک ہمارے اقتصادی حالات درست نہ ہوئے تھے اور یہی وجہ میری شادی نہ کرنے کی تھی۔ نصیر ہی نے مجھے بتایا کہ انھوں نے میری والدہ کے زیورات کے متعلق میرے گھر میں دریافت کیا لیکن پتا چلا تھا کہ ان پریشان کن حالات میں وہ بھی ختم ہو چکے تھے اور صرف ایک گلوبند بچا تھا جو بعد کو مجھے دیا گیا تھا کہ بیوی سے ملاقات کے وقت انھیں پہنا دوں۔ بہر حال شادی میں کچھ نہ کچھ تو خرچ ہی ہوا۔ ممکن ہے کہ

میری منجھلی دادی (ضیاء الحق صاحب کی بیوہ) کا وہ تھوڑا سا زیور بکا ہو، جوان کے انتقال کے کچھ عرصے کے بعد ان کی بہن نے ایک چھوٹی سی پوٹلی کی شکل میں مجھے دیا تھا اور جسے میں نے لاکر منظور چچا کے حوالے کر دیا تھا۔ ہاجرہ نے نہ مجھ سے کچھ بتایا کہ انھیں سسرال سے کیا ملا اور نہ کبھی شکایت کی۔

شاعرانہ طبیعت رکھنے کے باوجود میرا حسن و عشق کا تصوّر دوسروں سے جدا ہے۔ میں حسن پسند ضرور ہوں لیکن حسن پرست بالکل نہیں۔ حسن صرف طبقۂ نسواں تک محدود نہیں۔ ہر شئ کا شباب اسے ایک رعنائی عطا کرتا ہے۔ یہ حسن و رعنائی مجھے گلمرگ کے سبزہ زار پر پھیلے ہوئے بے شمار پھولوں میں بھی نظر آیا، خن چن زونگا کی چمکتی ہوئی رنگین برف میں بھی دکھائی دیا، بنگلور کے خوبصورت پھیلے ہوئے درختوں میں بھی اسے دیکھا، چنئی میں سمندر کی اٹھتی ہوئی لہروں میں بھی وہ جلوہ فرما نظر آیا، برہم پتر اور گنگا کے پرشوکت دھاروں میں بھی وہ موجزن دکھائی دیا، مردوں کے کثرتی جسموں میں بھی اس کا نور دیکھا، بچّوں کے معصوم چہروں میں بھی اس کی طلسماتی کیفیت نظر آئی اور خواتین کی پاکیزہ فطرت میں بھی اس کی جلوہ نمائی دیکھی۔ یہ حسن خواہ کسی شکل میں ہو انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور جب اس کا اثر حد سے بڑھ جاتا ہے تو وہی عشق کہلاتا ہے۔ ایک شاعر کو فطرتی مناظر سے عشق ہوتا ہے، ایک عالم کو کتابوں سے، ایک کھلاڑی کو اپنے کھیل سے اور ایک فنکار کو اپنے فن سے۔ الغرض اگر حساس آنکھ اور پُر گداز دل ہے تو وہ ہر چیز میں موجود نظر آئے گا۔ اپنے ان تصوّرات کے تحت عشق کے عام تصوّر کو میں بھی غالبؔ کی طرح خلل دماغ سمجھتا ہوں۔ مرد اور عورت میں ایک دوسرے کی طرف کشش فطری ہے اس کا سبب ظاہری خوبصورتی کے علاوہ فطری صلاحیتیں، اچھی عادتیں، حسنِ اخلاق، اور

بہت سی دوسری باتیں ہوتی ہیں اور بقولِ حافظؔ شیرازی ''بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست''۔ یہی کشش باہمی محبت اور ہمدردی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ جذبہ صنفِ مخالف کی جوانی تک محدود نہ رہ کر زندگی بھر قائم رہتا ہے۔ میرا ایک شعر اس کی ترجمانی یوں کرتا ہے۔

رفتارِ زندگی نے بگاڑے تو خال و خد　　　چہرے پہ اس کے آج بھی جو نور تھا سو ہے

اپنی شادی کے سلسلے میں یہ بھی لکھ دوں کہ وہ میری پسند کی ضرور تھی لیکن اس میں عشق وشق کا کوئی دخل نہ تھا۔ جسمانی بیماریوں کی طرح روایتی عشق کے مرض سے بھی خدا کے فضل سے میں ہمیشہ محفوظ رہا۔ اس کے لیے نہ میرے پاس پیسہ تھا اور نہ وقت، البتہ میرا جو عشق کا تصوّر رہے اس کا مفہوم ہے انسانی ہمدردی کا بڑھا ہوا جذبہ۔ اس میں میں ہمیشہ مبتلا رہا اور آج بھی مبتلا ہوں اور یہ وہ عشق نہیں ہے جسے بقولِ سعدیؔ ''دمشق کی قحط سالی'' یا بقولِ نظیر اکبر آبادی کی ''شہر آشوبی'' ختم کرا سکے۔ ہمارے شاعروں نے عشق کے مختلف تصوّر پیش کئے ہیں۔ جرأت کے قسم کے شاعروں نے اس کا وہ تصوّر پیش کیا ہے جسے میر تقی میرؔ نے ''چوما چاٹی'' سے تعبیر کیا ہے۔ غالبؔ نے ہوس اور عشق میں تمیز کی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار　　　کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

یا

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اور اس معاملے میں ذوقؔ بھی ان کے ہم نوا نظر آتے ہیں جب وہ کہتے ہیں۔

تھا بوالہوس کے دل میں بھی ایک آبلہ مگر　　　نشتر کا نام سنتے ہی منھ زرد ہو گیا

میر تقی میرؔ اور اقبالؔ نے جو عشق کا تصوّر پیش کیا ہے وہ مافوق الفطرت عشق ہے اور

اسے اس قوتِ جذب وانجذاب سے تعبیر کر سکتے ہیں جو کائنات کی ہر شے کو ایک دوسرے سے مربوط رکھتی ہے۔صوفی شاعروں نے جو عشقِ الٰہی کا تصوّر پیش کیا ہے اس کو سمجھنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ خالق ومخلوق کے رشتے کو عبد ومعبود کے تعلق کے بجائے عاشق ومعشوق کے رشتے کی نظر سے دیکھنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ المختصر حسن میرے خیال میں کائنات کے ذرّے ذرّے میں موجود ہے اور اگر حسّاس دل ودیدہ ہیں تو اسے دیکھ کر اس سے حظ اُٹھایا جا سکتا ہے اور عشق وہ پاکیزہ جذبہ ہے جس کے عناصر ہمدردی، احترام اور قربانی ہیں اور یہ جذبہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ میں نے اپنا تصوّرِ عشق اپنے مندرجہ ذیل شعر میں پیش کر دیا ہے۔

حسن کچھ بھی نہیں پاکیزہ شمائل کے سوا
عشق ہمدردیِ کامل کا فقط ہے اِک نام

اس کے برخلاف ہوس وہ وقتی جذبہ ہے جو صنفِ مخالف کے ظاہری حسن کو دیکھ کر پیدا ہو جاتا ہے اور اس حسن میں کمی آنے کے ساتھ ساتھ گھٹتا رہتا ہے اور اس کا خاص عنصر جنسی خواہش ہے۔

میری بیوی کے دو بڑے بھائی اشتیاق احمد صاحب اور اخلاق احمد صاحب تھے۔ اخلاق میرے کلاس فیلو بھی رہ چکے ہیں اور اشتیاق صاحب علی گڑھ یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران کینسر میں مبتلا ہو کر وفات پا گئے۔ ہاجرہ کے تیسرے بھائی اشفاق احمد ان سے چھوٹے تھے۔ اخلاق اور اشفاق ماشاء اللہ حیات ہیں۔ ان کی بڑی بہن زبیدہ جن کی شادی لہرپور میں ہوئی تھی۔ دو سال قبل وفات پا گئیں۔ ان کی سب سے چھوٹی بہن عائشہ حیات ہیں۔ بڑی بہن زبیدہ کے تین بیٹے صغیر احمد، بصیر احمد اور قدیر احمد ہیں۔ ان کی ایک بیٹی صفیہ غیر شادی شدہ ہیں، دوسری کا جوانی میں انتقال ہو گیا اور تیسری ماشاء اللہ صاحبِ اولاد ہیں۔

ہمارے دو اولادیں ہوئیں۔ بڑے بیٹے محمد سلیم انوار الحق ہیں اور چھوٹی بیٹی دُرِّ ثمین ہے۔ سلیم خدا کے فضل سے ریلائنس کمیونی کیشنس میں مشرقی یو پی کے سرکل ہیڈ ہیں۔ ان کی شادی مچھلی شہر کے کلیم اطہر صاحب جعفری کی دختر سُمیرہ جعفری سے ہوئی ہے جن کی ایک بیٹی آفرین اور ایک بیٹے حمزہ وجیہ الحق ہیں۔ دونوں تعلیم کے ابتدائی مدارج میں ہیں۔ سلیم دل کے بہت اچھے ہیں۔ ہر عزیز کی، خواہ وہ دور کا ہو یا قریب کا، مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور نہ جانے کتنے نوجوانوں کو ملازمت دلا چکے ہیں۔ یہ مدد صرف عزیزوں تک محدود نہیں ہے۔ سلّی گوڑی میں نہ جانے کتنے ضرورت مندان سے فیض اٹھایا کرتے تھے۔ لکھنؤ میں بھی یہی حال ہے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ ذاتی ڈرائیور نے ملازمت کے وقت ڈھائی ہزار ماہانہ تنخواہ مانگی لیکن کہا گیا کہ موجودہ مہنگائی میں وہ کم ہے اور تین ہزار روپیہ تنخواہ دی جانے لگی۔ بیٹی دُرِّ ثمین کی شادی شرفائے سندیلہ کے ہاشمی خاندان میں احمد شکیل ہاشمی سے ہوئی ہے جن کے دو بیٹے زید ہاشمی اور کامران ہاشمی ہیں۔ دونوں اپنے ماں باپ کے ساتھ بنگلور میں مقیم ہیں اور تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ سلیم انوار الحق، دُرِّ ثمین اور شکیل تینوں ایم۔ بی۔ اے ہیں۔ میری بہو سمیرہ کی دلچسپی کمپیوٹر سائنس میں ہے۔

بیوی میری تھی خوش رُو خوش طبع و باضمیر　　ہر پا شکستہ کے میرے بچے ہیں دستگیر

اپنے خاندانی گھروں کے سلسلے میں بھی کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ فرنگی محل کی دو عمارتیں ہمارے اجداد کو دی گئی تھیں۔ فرنگی کی اصل رہائش گاہ ملا نظام الدین کے بھتیجے ملا احمد عبدالحق بن ملا سعید کے حصّے میں آئی اور ان کے بعد ان کے فرزند مولانا انوار الحق کی رہائش گاہ بنی۔ ان کے فرزند اکبر میرے جد مولانا نور الحق صاحب نے والد کی زندگی ہی میں وہ مکان بنالیا جس کے

ایک حصّہ میں اب میرا قیام ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا علاء الدین ملا عبدالعلی بحرالعلوم
کے پاس مدراس چلے گئے تھے جن کی چھوٹی دختر ان سے منسوب تھیں۔ تیسرے بھائی مولانا
اسرارالحق کا والد کے سامنے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ مولانا انوارالحق صاحب کی دوسری بیوی سے
بھی ان کے دو بیٹے تھے، مولانا محمد احمد اور مولانا عبدالصمد۔ مولانا انوارالحق صاحب کے انتقال
کے بعد مولانا نورالحق صاحب نے آبائی مکان سب سے چھوٹے بھائیوں مولانا محمد احمد اور مولانا
عبدالصمد کو دے دیا اور اپنے بھانجے مولانا عبدالوالی صاحب کو باپ کا روحانی جانشین بنا دیا۔
تذکرۂ علمائے فرنگی محل سے پتہ چلتا ہے کہ بعد کو یہ طے پایا کہ اگر کوئی حصّہ دار اس مکان میں اپنا
حصّہ لینا چاہے تو تعمیری خرچ ادا کر کے لے سکتا ہے۔ مولانا نورالحق صاحب کی اولاد ان کے
بنا کردہ مکان میں رہتی تھی۔ ان کے بیٹے مولانا برہان الحق صاحب کا حصّہ ان کے دونوں بیٹوں
مولانا امان الحق صاحب (یعنی میرے پردادا) اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا لمعان الحق
صاحب میں تقسیم ہوا۔ اس طرح موجودہ مکان ۲۷۔ فرنگی محل کے وارث میرے دادا اور ان کے
تینوں چھوٹے بھائی ہوئے۔ میرے دادا فضلِ حق صاحب بہ سلسلۂ ملازمت حیدرآباد میں رہے
اور میری دادی مولانا انوارالحق صاحب کے بھتیجے مولانا ظہورالحق صاحب کے مکان ۲۲۔ دلالی
محلّہ میں رہیں جن کی وہ اپنی والدہ اور لاولد خالہ کی طرف سے تنہا وارث تھیں۔ مولانا امان الحق
صاحب کا مکان (موجودہ ۲۷۔ فرنگی محل) ان کے تینوں چھوٹے بیٹوں کی رہائش گاہ بنا۔ میری
پیدائش سے قبل ہی ان میں سے دو مولانا ممتاز الحق صاحب اور مولانا منہاج الحق صاحب کا
انتقال ہو چکا تھا اور ان سے بڑے تیسرے بھائی مولانا ضیاء الحق اس پورے مکان میں مقیم تھے
جس کے دو حصّے تھے۔ وہ بھی لاولد تھے۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی منہاج الحق صاحب کی

تنہا اولاد مصباح الحق صاحب کی پرورش کی تھی۔ مولانا فضلِ حق صاحب کی تمام اولادوں کا قیام اپنی والدہ کے ساتھ ان کے مکان ۲۲۔ دلالی محلّے میں تھا جو دو حصّوں میں تقسیم تھا۔ میری پیدائش اپنی دادی کے اسی مکان میں ہوئی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اس کا بڑا حصہ ۱۹۲۳ء کی شدید بارش میں گر کر کھنڈر ہو چکا تھا اور اس کا بچا ہوا ایک خستہ حال کمرہ شیخ جمن صاحب کی رہائش گاہ تھا۔ شیخ جمن صاحب انتہائی بچپن میں کہیں پائے گئے تھے اور میری دادی کے ساتھ ہی ان کی پرورش ہوئی تھی اور اس رشتے سے انھیں میرے باپ چچا سب جمن ماموں کہتے تھے۔ وہ زیرپائیوں کے تاجر تھے اور انھوں نے میری دادی کے مکان کے قریب میں ایک چھوٹا سا مکان بنالیا تھا لیکن زندگی بھر وہ میرے باپ چچا کے ساتھ ہی رہے اور ہمارے خاندان کے اس حد تک وفادار تھے کہ میرے دادا کے یکا یک انتقال کے بعد جب میری دادی کے یہاں کبھی کبھی فاقہ کشی کی نوبت آتی تھی تو وہ بھی فاقہ کرتے تھے۔ مکان کے بڑے حصّے کا یہ حال ہونے کی وجہ سے ہمارے خاندان کے رہنے کے لیے صرف اس کا چھوٹا حصہ بچا تھا۔ میرے ہوش سنبھالتے وقت میرے والد ملازمت کے سلسلے میں باہر رہتے تھے۔ ان سے بڑے بھائی پہلے ہی غائب ہو گئے تھے۔ چوتھے بھائی منظور الحق صاحب بھی ملازم تھے اور لکھنؤ سے باہر تھے۔ تیسرے بھائی وحید الحق صاحب بھی میری یادداشت کے ابتدائی دور میں حیدرآباد چلے گئے تھے۔ لے دے کر چھوٹے چچا ظہور الحق صاحب اور چھوٹی پھوپھی اس چھوٹے حصہ میں رہنے والے رہ گئے تھے۔ وہ حصّہ بھی کافی بوسیدہ تھا۔ منظور چچا کے لکھنوآنے کے بعد بڑے حصّے کا گلی کے طرف کا دو منزلہ حصہ جو گر چکا تھا اس کی جگہ ایک دالان تعمیر ہوا۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ بعد کو میری بڑی پھوپھی کی بیٹی نے جو مجھ سے بڑی ہیں بتایا کہ اس کی تعمیر کے لیے میرے والد نے روپیہ دیا تھا۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد اس دالان کے مقابل ایک دوسرا دالان تعمیر ہوا جس کا خرچ میرے چچا منظور الحق صاحب نے اٹھایا تھا اور اس دالان کی نکلی ہوئی دھنّیوں سے چھوٹے حصّے کا گلی کی طرف کا چھوٹا سا دالان جو باورچی خانہ کا کام دیتا تھا اسے پاٹ کر چھوٹے سے کمرے کی شکل دی گئی جو گھر کا ڈرائنگ روم بنا۔ اس ڈرائنگ روم کا کل فرنیچر دو ہتّھے دار کرسیاں اور پڑھنے کی ایک میز کرسی تھے۔ میں جب تھوڑا سا بڑا ہوا تو اسی میں میرا پلنگ بچھا دیا گیا اور شادی سے قبل تک یہی کمرہ جس میں پلنگ بچھنے کے بعد تین طرف چھ انچ کی بھی گنجائش نہیں بچتی تھی میرا بڈ روم بنا رہا۔ میز کرسی جس کا ابھی ذکر کیا ہے سنجھلے چچا وحید الحق صاحب کی طالبعلمی کے دور کی یادگار تھے اور اس وقت میرے پڑھنے لکھنے کے کام آتے تھے۔ منظور چچا نے لکھنؤ تبادلے کے بعد بڑے حصّے کے بچے ہوئے کمرے کے اوپر اپنے لیے ایک چھوٹا کمر بنا لیا تھا لیکن اس کے چوکھٹوں میں دروازے کبھی نہ لگ سکے۔ اس کمرے کے بغل میں ایک چھوٹا سا شکستہ کمرہ تھا۔ اس کی بھی مرمت کرائی گئی اور ۱۹۵۱ء میں جب وحید چچا کا حیدر آباد میں انتقال ہوا تو چچی مع اپنے تینوں بیٹوں کے اسی کمرے میں مقیم ہوئیں جس میں صرف دو پلنگوں کی گنجائش تھی۔ چھوٹے حصّے کا پچھلا حصّہ جو ایک شکستہ کمرے اور اس کے آگے دالان پر مشتمل تھا اس وقت اسٹور روم بن گیا تھا۔ میری ملازمت میں آنے کے وقت یہ حال تھا اس گھر کا جس میں مَیں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اسی زمانے میں میرے دادا کا مکان ۲۷۔ فرنگی محل جس میں ان کے چھوٹے بھائی ضیاء الحق صاحب رہتے تھے گرنے لگا تھا اور ان کی بیوہ کا ان کی بہن کے یہاں قیام کے دوران ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا تھا اور ساتھ ہی بارش میں یہ مکان بھی گر گیا۔ 1951ء میں وحید چچا کی فیملی کے لکھنؤ آنے کے بعد گھر کا خرچ کافی بڑھ گیا تھا اور آمدنی تھی صرف میری اور منظور چچا کی تنخواہیں (اس

سلسلے میں پہلے ہی کچھ روشنی ڈال چکا ہوں۔) والد مرحوم کے پراویڈنٹ کے پانچ ہزار روپیہ کا کچھ
حصّہ حیدرآباد کے سفروں پر خرچ ہوا تھا۔ گھر کی آمدنی بڑھانے کے لیے ایک عزیز کی تجارت میں
شرکت کرنا چاہی اور ڈیڑھ ہزار روپیہ سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بہر حال آمدنی بڑھانا ضروری تھی
چنانچہ بقیہ روپیہ سے موجودہ گھر کو بنوا کر کرایہ پر اٹھانے کا پلان بنایا۔ اس روپیہ سے جتنا بھی
مکان بن سکتا تھا منظور چچا کی دیکھ ریکھ میں بنا لیا گیا لیکن ایک عزیز کی مہربانی سے ایک داروغہ
شکلا نے اس پر قبضہ کر لیا۔ بہر حال وہ تیس روپیہ مہینہ کرایہ دینے کو تیار ہوا۔ جھگڑا مناسب نہ سمجھا
گیا اور اسی قلیل رقم پر یہ سمجھ کر قناعت کر لی گئی کہ جب اس کا تبادلہ ہوگا تو گھر خالی ہو جائے گا۔
لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ جاتے وقت دوسرے داروغہ چوہان کو مکان دے گیا اور اس نے جانے کے
وقت اپنے بھائی کو گھر میں ٹھہرا دیا۔ کرایہ ملنا بھی بند ہو گیا۔ اسی زمانے میں میں نے کہیں نہ کہیں
سے روپیہ کا انتظام کر کے اسی مکان کے دوسرے حصّے کے دو کمرے نئے سرے سے بنوائے جو
بیس روپیہ مہینہ پر کرایہ پر اٹھا دیے گئے۔ اس وقت مولانا امان الحق صاحب کے نام کی مناسبت
سے میں نے اس پورے گھر کا نام دارالامان رکھ دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میری شادی کی سب کو فکر
تھی اور مسولی والا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ شادی کی سب کو فکر تھی لیکن رہا کہاں جائے گا اس کا خیال
کسی کو نہ تھا۔ کسی نہ کسی طرح، کچھ روپیہ کا انتظام کر کے دلالی محلّہ کے مکان کے چھوٹے حصّے کو
جس کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ اسٹور بن چکا تھا ایک کمرے اور دالان اور ایک کوٹھری کی شکل میں
درست کرایا۔ ہاجرہ مرحومہ سے شادی کے بعد اسی حصّہ میں میرا قیام ہوا۔ سڑک والے گھر
(۲۷۔ فرنگی محل) کو پولیس والوں سے خالی کرنے کے لیے تمام ذرائع اختیار کرنا پڑے لیکن
ناکامی ہوئی۔ بالآخر مقدمہ بازی کی نوبت آئی جس میں بی۔ اے آنرس کے ایک کلاس فیلو وکیل

ہادی حسین مرحوم نے بہت مدد کی۔ مقدمہ تو جیت گئے لیکن مکان خالی کرانے میں خاصی معرکہ آرائی کرنا پڑی۔ اس کے بعد مکان خالی چھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور میں دلالی محلّہ والے مکان سے اس ۲۷۔ فرنگی محل میں منتقل ہوگیا اور آج بھی سلّی گوڑی سے واپسی کے بعد اسی میں مقیم ہوں۔ دلالی محلّہ والے مکان کے بننے کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے برادرم عبدالوہاب سے اس مکان میں ڈرائنگ روم بنوانے کو کہا۔ انھوں نے خرچ پوچھا۔ میں نے کہا کہ فی الحال پندرہ سو روپیہ دو بعد کو دیکھا جائے گا کہ کتنا اور چاہیے ہوگا۔ منے میاں نے یہ روپیہ بھیج دیا اور برادرم الطاف کی نگرانی میں کام شروع ہوگیا۔ روپیہ ختم ہونے کے بعد میں نے برادرم عبدالوہاب سے مزید ڈیڑھ ہزار روپیہ بھیجنے کو کہا جو انھوں نے بھیج دیئے لیکن اب اپنے پرائے کا دور شروع ہوا۔ ہماری بہن صاحبہ نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ یہ رویّہ میرے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ میں نے الطاف سے روپیہ لے کر ان کو دے دیا اور منے کو لکھ دیا کہ تمہارا روپیہ تمہاری بہن کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ بارہ بنکی میں ہمارے منجھلے دادا ضیاء الحق صاحب کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ میرے کرم فرما صدیق احمد صاحب وکیل کے کہنے سے اس کے لیے مقدمہ بازی شروع ہوئی جس کا پورا خرچ مجھی کو اٹھانا پڑ رہا تھا۔ مجبوراً مجھے پندرہ سو روپیہ لے کر صلح کرنا پڑی۔ اس رقم سے زیادہ میں مقدمہ پر خرچ کر چکا تھا۔ اس پندرہ سو روپیہ سے میں نے کسی نہ کسی طرح اور کچھ روپیہ اپنی طرف سے ملا کر اس ڈرائنگ روم کو جس میں مجھے کبھی نہ بیٹھنا تھا مکمل کیا۔ ساتھ ہی میں نے اس کے برابر والے دالان کو کمرے کی شکل دی۔ ان حالات میں مجھے دو سو روپیہ برادرم شعیب سے اور اتنی ہی رقم برادرم الطاف سے مانگنی پڑی۔ کچھ عرصے کے بعد برادم عبدالوہاب کا لکھنؤ تبادلہ ہوگیا اور ان کے لیے اسی ڈرائنگ روم پر کمرہ تعمیر کرا دیا گیا جس کے لیے مجھے سخت کوفت کا سامنا

کرنا پڑا تھا۔ اس تعمیر میں میرا کچھ حصّہ نہ تھا۔ اس عرصے میں میاں لطیف کی شادی ہوگئی تھی اور وہ میرے چھوڑے ہوئے کمرے دالان میں مقیم ہوگئے تھے۔ اب الطاف کی شادی ہونے جا رہی تھی لیکن دلھن کہاں رہے گی اس کی کسی کو فکر نہ تھی۔ الطاف نے مجھ سے کہا کہ ڈرائنگ روم کے برابر کے کمرے اور غسل خانے کے چھت کی دھنّیاں گر چکی ہیں اور اسی پر سے منے میاں نیچے آتے ہیں اگر میں کہوں تو وہ اسے بنوا دیں۔ میں نے انھیں منع کر دیا اور گھر کی تین کوٹھریوں کو ملا کر خود اپنے لیے کمرہ بنوانے کے لیے کہا۔ میں نے ان سے بتا دیا کہ جن چھتوں کو تم بنوانے کو کہتے ہو انھیں میں بنوا دوں گا۔ چنانچہ کام شروع ہوگیا۔ میں نے اپنی بھانجی یعنی وہاب میاں کی بیوی کو آٹھ سو روپیہ دیئے کہ چھت بنوالیں۔ کچھ دن کے بعد انھوں نے اطلاع دی کہ روپیہ ختم ہوگیا۔ میں نے چھ سو روپیہ اور انھیں دے دیے اور کمرے اور موجودہ باورچی خانے کی چھتیں بن گئی۔ یہ چھتیں کیسے بنیں اس کا علم اب تک میرے اور صفیہ کے علاوہ کسی کو نہیں۔ میرے کہنے کے مطابق الطاف نے اپنے لیے کمرہ بنوالیا۔ ساتھ ہی اس سے متصل پرانے کمرے دالان کو بھی درست کرایا۔ بعد کو برادرم امین نے شادی کے وقت الطاف کے کمرے کے اوپر اپنے لیے کمرہ بنوایا۔ میں نے تکلیفیں اٹھا کر ان گھروں میں جو کچھ بنوایا اس کا مقصد باپ دادا کے کھنڈروں کو مکان کی شکل دینے کے علاوہ دیگر اہلِ خاندان کو ممکنہ آرام پہنچانا تھا۔ میں نے زندگی میں جو کچھ کمایا وہ سب ان مکانوں میں لگا دیا لیکن خود مجھے کیا ملا؟ لکھنؤ آنے کے بعد منے (عبدالوہاب) دلالی محلّہ کے مکان کے ڈرائنگ روم کے اوپر والے کمرے میں اور نیچے ڈرائنگ روم کے برابر والے کمرے میں رہ رہے تھے لیکن اندور سے ملازمت ختم ہونے کے بعد عماد صاحب کا خاندان بھی آ گیا تھا اور منے صرف اوپر والے کمرے تک محدود ہوگئے تھے۔ مجھے ان کی تکلیف کا

احساس تھا۔ میں نے ۲۷۔ فرنگی محل کے اس حصّہ کو خالی کرانا چاہا جس میں ایک نہایت شریف کرایہ دار سردار حیدر رہ رہے تھے۔ نوبت مقدمہ بازی کی آئی جس کا پورا خرچ مجھے برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس حصّے کے باہر کی دوکان ایک بسکٹ والے کے پاس تھی۔ اسے بھی مقدمہ لڑ کر خالی کرایا اور اس میں پہلے عابدہ صاحبہ کا اندور سے آنے والا سامان رکھوایا اور بعد کو وہی منے میاں کا گیرج بنا۔ کرایہ داروں سے مکان خالی کرانا تقریباً ناممکنات میں سے ہے اور اس سلسلے میں مجھے کیا کیا کرنا پڑا اس کا احساس کرنے کی کسی نے ضرورت نہ سمجھی۔ مکان خالی ہوا اور منے سے پہلے ہی عماد صاحب نے آنے کی تیاری شروع کر دی لیکن بقولِ صفیہ کے منے اس پر راضی نہ ہو سکے۔ میں اور منے دو بھائیوں کی طرح دونوں حصّوں میں رہنے لگے۔ بغیر منے کے عماد صاحب دلالی محلّہ میں نہ رہ سکے اور اپنے بڑے بھائی کے پاس کوچ چلے گئے اور بیکاری میں جہاں تک میرا علم ہے ان کے پورے گھر کا بار ان کے بڑے بھائی رشاد صاحب اور ان کی بیوی اٹھاتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد عماد صاحب لکھنؤ آئے۔ میرے دوست کے۔ کے بخشی آئی۔ اے۔ ایس گورنر کے سکریٹری تھے۔ میں ان سے ملنے جا رہا تھا، موصوف بھی ساتھ ہو لیے۔ تعارف کے دوران میں نے بتایا کہ ان کی سروس اندور میں ختم ہو گئی ہے۔ اس شریف آدمی نے جس آئی۔ اے۔ ایس افسر نے ان کی ملازمت ختم کی تھی اسے خط لکھا اور کئی مہینہ بیکار رہ کر عماد صاحب کو نوکری جوائن کرنے کی اجازت مل گئی۔ (عماد صاحب نے ایک موقع پر اس سے انکار کر دیا اور ان سے امید بھی کیا کی جا سکتی تھی۔ بہرحال کے۔ کے۔ بخشی ابھی حیات ہیں اور اس بات کے گواہ ہیں)۔ بات پھر کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ منّے دلالی محلے کے مکان سے تو زیادہ آرام سے تھے۔ پھر بھی جگہ کم تھی۔ باہر کی تین دروں کی دوکان خالی تھی۔ میں نے ان سے متعدد

بار کہا کہ وہ اسے بنوالیں لیکن وہ ٹال گئے۔ سڑک والے گھر میں صرف یہی وہ حصّہ تھا جسے میں نہ بنوا سکا تھا۔ منّے مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ جب انھیں اس گھر میں زیادہ رہنا ہی نہ تھا تو کیوں اپنا پیسہ پھنساتے۔ عماد صاحب ریٹائر ہو کر بیٹی کی تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ چلے گئے اور وہاں سے چار سال کے بعد جب لکھنؤ تشریف لائے تو منّے سے مکان کا وہ حصّہ جس میں منّے رہ رہے تھے خالی کرا کر قیام پذیر ہوئے۔ اس زمانے میں ان کی میرے یہاں آمد و رفت بہت کافی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری بیوی سے مسلسل میری بہن یعنی اپنی بیوی کی برائیاں کیا کرتے تھے مثلاً ایک موقع پر میں نے سنا کہ وہ فرما رہے تھے کہ آداب (وہ اپنے والد کو آداب کہتے تھے) نے حکم دیا تھا کہ عابدہ کو چھوڑ دو۔ ویسے ہی ایک دوسرے موقع پر میں نے سنا تھا کہ فرما رہے تھے کہ میرے گھر میں دو ملحد ہیں ایک میرے بڑے بھائی رشاد اور دوسری عابدہ۔ ایک تیسرے موقع پر میں نے سنا تھا کہ میری بیوی سے فرما رہے تھے کہ میں نے نماز پڑھنا شروع کی تھی جسے دیکھ کر عابدہ نے کہا کہ اچھا اب یہ کام بھی ہونے لگے گا۔ اس قسم کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ عابدہ کی طرف سے میری بیوی کا دماغ پھیرنا چاہتے تھے اور اب مجھے یقین ہے کہ دوسری طرف بھی ایسا ہی کیا جا رہا ہوگا۔ موصوف کی ذہنیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی ان بھاوج کی موت کا ذکر جنھوں نے مہینوں ان کے پورے گھر کا خرچ اٹھایا تھا ان الفاظ میں کیا تھا ''شہناز مر گئیں، مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا''۔ لکھنؤ آنے کے بعد ان لوگوں کا رویہ میری طرف سے یکسر بدل گیا۔ میرے بیٹے کی شادی کے موقع پر میں نے رات کو محض چند گھنٹے کے لیے اپنی (اور ان کی بھی) ایک عزیزہ کو ٹھہرانے کے لیے ایک کمرہ مانگا لیکن انکار کر دیا گیا۔ اپنے ہی بنوائے ہوئے کمرے سے یہ بے دخلی میرے لیے جس تکلیف کا باعث ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ لکھنا بھول گیا ہوں کہ منّے کے جانے کے بعد گیراج میں سامان کے علاوہ میں نے اپنے بیٹے کی گاڑی رکھوانا شروع کر دی تھی۔ کنجی ایک خاص جگہ رکھی رہتی تھی اور جس کو بھی ضرورت ہوتی تھی وہ گیراج کھول لیتا تھا۔ ایک روز مجھ سے کہا گیا کہ میں گیراج کی دوسری کنجی دے دوں۔ میں نے معاملہ کو بالکل غیر اہم سمجھتے ہوئے کہا کہ پرانے قفل کی دوسری کنجی نہیں ہے تم بنوالو۔ میری غلطی یہ ہوئی کہ میں نے اپنی بیوی سے یہ نہیں بتایا کہ میں نے ان لوگوں سے دوسری کنجی بنوانے کو کہہ دیا تھا۔ کیونکہ قفل بالکل پرانا تھا اس لیے میری بیوی نے آلہ آباد سے لایا ہوا نیا قفل اس کے بجائے ڈال دیا اور کنجی جہاں رہتی تھی وہیں رکھ دی۔ چند روز کے بعد میں نے اس قفل پر دوسرا قفل پڑا ہوا دیکھا۔ یہ گویا مجھ سے اعلان جنگ تھا۔ میرے بیٹے کی گاڑی گیراج کے اندر ہی بند رہ گئی۔ بجائے اس کے کہ ان لوگوں سے پوچھا جاتا کہ قفل پہ دوسرا قفل ڈالنے کی کیا ضرورت ہے مجھ ہی سے کہا گیا کہ بھائی جان آپ ہی اپنا قفل کھول لیجیے۔ کیونکہ میرا کبھی بھی اس حصہ پر قبضہ کرنے کا ارادہ نہیں تھا لہٰذا میں نے قفل کھول دیا گاڑی نکال دی جو سڑک پر پڑی رہنے لگی اور اس کی دیکھ بھال کے لیے مجھے ڈیوڑھی میں سونا پڑتا تھا اس لیے کہ ماروتی گاڑی ہر کنجی سے کھل جاتی ہے۔ اپنی ان بہن صاحبہ کا جو مجھے بیٹی سے کم عزیز نہ تھیں یہ رویہ میرے لیے جتنا تکلیف دہ تھا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جھگڑوں کا سلسلہ جاری رہا۔ دونوں گھروں کو بنواتے وقت میں نے پائپ اس طریقے سے لگوایا تھا کہ دونوں گھروں میں برابر پانی جاتا رہے۔ مجھے حکم ملنے لگا کہ فلاں سے فلاں وقت تک میری طرف پانی کا پمپ نہیں چلے گا اور اس سلسلہ میں پمپ کے پائپ کو کاٹنے کی دھمکیاں بھی ملتی رہیں۔ میں سب خاموشی سے برداشت کرتا رہا لیکن مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ میرے وہ بھائی بہن جو میری محبت کا دم بھرتے تھے

ان میں سے بڑے سے لے کر چھوٹے تک کسی نے اس کی ضرورت نہ محسوس کی کہ بند الفاظ ہی میں سہی موصوفہ کو سمجھائیں۔ بہر حال کیوں کوئی ایسا کرتا جب کسی کا کوئی نقصان نہیں ہو رہا تھا۔ بھگتنا مجھے تھا میں بھگت رہا تھا۔ میری بیوی سال بھر دماغی کینسر میں مبتلا رہی لیکن پڑوس میں کسی نے بھی ان کی خیریت پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ میری بیوی کا انتقال ہو گیا اور پڑوس سے کسی نے اس موقع پر بھی آنے کی زحمت نہ فرمائی اور ایک عزیز نے اس کا دفاع یوں کیا کہ اگر وہ آتیں تو ان کے ساتھ خراب برتاؤ کیا جاتا جس سے حالات خراب ہو جاتے۔ گویا کہ نہ آنے سے حالات اچھے رہے۔ اختلاف ہر گھر میں ہوتے ہیں میرے بچپن میں ہمارے گھر سے اور میرے منجھلے دادا ضیاء الحق صاحب کے گھر سے آمد و رفت بند تھی لیکن ان کے مرض الموت میں میرے گھر کا ہر فرد شریک تھا اور ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ کو بے سہارا نہیں چھوڑا گیا۔ میرے دادا کے چچا زاد بھائی حکیم وہاج الحق صاحب ؒ کے گھر سے بھی ہمارے گھر کی آمد و رفت بند تھی جس کا سبب ان کی بڑی بہن کا غلط رویہ بتایا جاتا تھا لیکن ان کے انتقال میں بھی ہمارے گھر کا ہر فرد شریک تھا۔ میری بیوی کے انتقال کا واقعہ غالباً پہلا موقع تھا کہ اسی گھر کے ایک حصے میں رہنے والے ان کی تجہیز و تکفین میں شامل نہ ہوئے۔ بیوی کے انتقال کے بعد میں سلّی گوڑی چلا گیا۔ پتہ چلا کہ گیراج کی جگہ ڈرائنگ روم بنا لیا گیا ہے گیراج میں میرے باورچی خانے والے دالان کی دھنیاں اور لمبے شہتیر رکھے تھے اور گیراج کی چھت جن ٹین کی چادروں سے بنی تھی وہ میری بیوی کے خریدے ہوئے تھے۔ اب واپسی پر مجھے کچھ نہیں ملا اور لکڑی کے سلسلے میں یہ کہہ دیا گیا کہ پڑوس کے کھنڈر سے لوگ اٹھا لے گئے۔ میں حیران تھا کہ وہ لمبے شہتیر جن کے اٹھانے کے لیے کم از کم چار آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی کیسے دیوار پھندا دیئے گئے۔ بہر حال مجھے قطعاً

اس نقصان کا کوئی افسوس نہیں ہوا۔ چھیڑ چھاڑ کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیا جاتا تھا۔ گلی میں پائپ لائن پڑنے کے بعد نیا پانی کا کنکشن لے لیا گیا لیکن میرا پائپ جس کا میں ہمیشہ ٹیکس ادا کرتا تھا اس کو بھی اس میں جوڑ لیا گیا۔ اس کا مقصد سوائے مجھے تکلیف دینے کے کچھ نہیں تھا اور محض مجھے یہ دکھانا تھا کہ وہ پائپ ان کا ہے ہمارا پورا گھر خاموشی سے اس تماشے کو بھی دیکھتا رہا۔ میری بہن صاحبہ کو بعد میں ہوش آیا لیکن وہ اس وقت جب سب برباد ہو چکا تھا۔ بہر حال میں آج بھی ان سے اس طرح ملتا ہوں اور شاید زندگی بھر ملتا رہوں گا جس طرح چچا کے انتقال کے بعد ان کا خیال رکھتا تھا لیکن میری اولادیں اس بات کو شاید نہیں بھول پا رہی ہیں کہ ان کی ماں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔ کاش وہ بھی پچھلے واقعات کو بھلا کر آگے کی طرف دیکھیں۔ دنیا میں تو یہ سب ہوتا ہی رہتا ہے اور اسی کا نام دنیا ہے۔ زندگی بہت تھوڑے سے وقفہ کی ہوتی ہے کاش کہ یہ تھوڑا سا وقفہ سکون سے بسر کیا جائے اور دوسروں کو بھی بسر کر لینے دیا جائے لیکن اس بات کو سمجھتا کون ہے۔ لڑائی میں کسی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مجھے زندگی کے ابتدائی دور کی یہ حکایت یاد آ رہی ہے جو شاید میں نے بہارستانِ جامی میں پڑھی تھی کہ دو لوگ حضرتِ عیسیٰؑ کے پاس زمین کا جھگڑا لے کر گئے۔ ان میں سے ہر ایک یہ کہہ رہا تھا کہ زمین میری ہے۔ حضرتِ عیسیٰؑ نے کہا کہ زمین تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔ دونوں نے پوچھا کہ زمین کیا کہہ رہی ہے۔ حضرتِ عیسیٰ نے کہا کہ زمین کہہ رہی کہ دونوں میرے ہیں۔ گیراج چھیننے پر یہ قصہ مجھے بے تحاشہ یاد آیا تھا۔

بہر حال زندگی کے آخری دنوں میں جب مجھے کل کے متعلق بھی نہیں بھروسہ کے زندہ رہوں گا یا نہیں مجھے یہ تمام باتیں زبان پر نہ لا کر دل میں اسی طرح دبائے رکھنا چاہیے تھیں جیسی اب تک دبائے رکھیں لیکن جب زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ لکھ رہا ہوں تو مجبوراً یہ تکلیف دہ ذکر

بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ مکانوں کے متعلق تفصیل سے اس لیے لکھنا پڑا کہ پائپ پر قبضے کے سلسلے میں یہ اندازہ ہو گیا کہ خاندان میں باہر سے شامل ہونے والوں کا یہ خیال ہے کہ یہ سب بنے بنائے مکان اسی حال میں باپ دادا سے ملے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ صرف گھروں کی زمین مشترکہ ہے نہ کہ عمارتیں۔ ان سب کے باوجود جیسا لکھ چکا ہوں، میرے سب ہی بھائی بہن مجھ سے اور میری اولاد سے بہت ہی اچھی طرح پیش آتے رہے ہیں اور یہی بہت ہے۔

فرنگی محل نہ صرف ایک علمی مرکز کی حیثیت سے ختم ہو چکا ہے بلکہ اس کے افراد بھی بکھر چکے ہیں اور جو لکھنؤ میں رہ بھی گئے ہیں وہ بھی اتنی دور دور آباد ہیں کہ مدتوں ملاقات نہیں ہوتی۔ فرنگی محل میں چند گنتی کے افراد رہ گئے ہیں اور ان سب سے میرے تعلقات برادرانہ ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد جو حضرات باہر چلے گئے تھے ان میں صرف دو یعنی جمال میاں اور اصغر انصاری زندہ ہیں اور دونوں عمر کی ستاسی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ ان کی اور دیگر ترکِ وطن کرنے والوں کی اولاد کے ناموں سے میں تو واقف ہوں لیکن یقین ہے کہ اس نسل کے لوگ میرے نام تک سے واقف نہ ہوں گے۔:

از دیدہ دور از دل دور

ضمیمہ

''ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا''

آج زندگی کے بیاسی سال، چھ مہینے اور کچھ روز طے کر چکا ہوں لیکن شوق تماشا اور ذوق تجسس میں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اپنے حالات زندگی تقریباً دس ماہ قبل مکمل کر لیے تھے اور خیال تھا کہ ان میں کچھ اور اضافہ نہ ہوگا لیکن چند روز قبل جب میرے بیٹے سلیم انوار الحق نے شملہ چلنے کی تجویز میرے سامنے رکھی تو میں اسے رد نہ کر سکا۔ اس دس ماہ کے عرصے میں نہ صرف بینائی مزید کمزور ہوگئی ہے اور ٹانگیں سو گز تک ساتھ دینے سے معذور ہو چکی ہیں نیز تنفس کی شکایتیں بھی شروع ہوگئی ہیں اور چند سیڑھیاں چڑھنا بھی دشوار ہے۔ پھر بھی ہمالیہ کی دلفریبیوں کی کشش میں میرے لیے کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ چنانچہ ۱۴رجون ۲۰۰۷ء کو گیارہ بجے شملہ جانے کے لیے لکھنؤ۔ چندی گڑھ اکسپریس سے ہم لوگ روانہ ہوگئے۔ ۱۵رجون کی دوپہر کو چندی گڑھ پہنچے اور فوراً شملہ کے لیے روانہ ہوگئے جس کا فاصلہ چندی گڑھ سے ۱۲۵ کلومیٹر ہے۔ ہماری پہلی منزل Yodavindra Graden,Pinjora ہوئی۔ پنجورا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پانڈو نے جلاوطنی کے ۱۲ سال یہاں ہی گزارے تھے اور بعد کو اپنی حکومت کے ۳۶ برسوں کے دوران وہاں آتے جاتے رہے۔ موجودہ پنجورا باغ جو سات طبقوں پر مشتمل ہے اورنگ زیب کے معتمد پنجاب کے گورنر اور شاہی مسجد لاہور کے بنوانے والے فدائی خان نے بنوایا تھا۔ باغ کا انداز کشمیر کے شالیمار باغ سے ملتا جلتا ہے لیکن اب بیچ کی نہر کے فورے غائب ہو چکے ہیں۔ پنجورا

سے تقریباً ایک گھنٹہ کے کار کے سفر کے بعد چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا شہر کالکا ملا جو براڈ گیج ریلوے لائن کا آخری اسٹیشن ہے۔ کالکا کے بعد ہی پروانو کی خوبصورت تفریح گاہ ہے جہاں دو پہاڑیوں کو ملانے کے لیے Rope way بنا دیا گیا ہے جس کا کرایہ -/300 روپیہ فی کس ہے۔ Parwanoo سے ہمالیائی کوہستانی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور یہی مقام ہماچل پردیش کی پہلی بستی ہے۔ ہر پہاڑی سڑک کی طرح جیسے جیسے پر پیچ راستے سے بلندی کی طرف بڑھتے ہیں، قدرتی حسن اور سبزے کی کثرت میں اضافہ نظر آتا رہتا ہے یہاں تک کہ سولن(Solan) پہنچ جاتے ہیں۔ یہ وہی شہر ہے جو اپنی Whisky کی کشید گاہ کے لیے مشہور ہے۔ کم ہی لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ یہ کشید گاہ کسی زمانے میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے سلسلہ میں بدنام زمانہ جنرل ڈائر کے اخلاف کی ملکیت تھی۔ سولن کے بعد دیودار کے جنگلوں سے ڈھکے پہاڑوں کی بلندیوں اور نشیب میں وادیوں کا اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ ایسا نظارہ پیش کرتے ہیں کہ ان کے دیکھنے سے طبیعت سیر ہی نہیں ہوتی۔ ایسے ہی خوبصورت منظر راستے کے ایک چھوٹے شہر کیاری گھاٹ کے قریب کنڈا گھاٹ(Kandaghat) میں دیکھنے کو ملتا ہے جہاں کئی پہاڑیوں کی جنگلوں سے ڈھکی ڈھلانیں ایک بہت خوبصورت وادی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اس طلسماتی ماحول سے گزرتے ہوئے پانچ گھنٹے کا ٹیکسی کا سفر اس طرح ختم ہو جاتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔ ۱۵ر جون ۲۰۰۷ء کو تقریباً چار بجے ہم لوگ شملہ پہنچے اور Victory Tunnel کے قریب سرکلر روڈ پر ہوٹل بلجیز ریزیڈنسی میں ٹھہر گئے جس کے تین کمرے میرے بیٹے کے ہمکاروں اجے راج اور بسنت ترپاٹھی نے پہلے ہی سے بک کروا لیے تھے۔ یہ جگہ شملہ کے مشہور مارکیٹ اور سماجی فعالیت کے مرکز Mall Road کے بالکل نیچے

تھی۔ چنانچہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میرے بیٹے اور دوسرے عزیز مال کی سیر کے لیے نکل گئے اور میں تنہا اپنے کمرے میں آرام کرتا رہا۔

دوسرے روز یعنی ۱۶ر جون کو شہر شملہ اور اس کے مضافاتی علاقے دیکھنے کا پروگرام بنا۔ شہر شملہ سات مختلف چھوٹی پہاڑیوں پر آباد ہے اور ان میں ہر ایک کی چوطرفہ ڈھلانیں پوری طرح جنگلوں کے درمیان آباد ہیں اور انھیں پہاڑیوں کی بلندیوں اور ڈھالوں سے بنتی ہوئی وادیاں شملہ کے حسن کی ذمہ دار ہیں۔ ۱۸۲۰ء سے قبل تک یہ علاقہ گورکھوں کے قبضے میں تھا لیکن اس کے بعد اس پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا اور انھیں میں کے دو اشخاص نے اس جگہ کو دریافت کیا جہاں موجودہ شملہ آباد ہے۔ انگریزوں کو یہ مقام بے حد پسند آیا اور یہاں انھوں نے انگلینڈ میں بنی ہوئی عمارتوں کے طرز پر عمارتیں بنوانا شروع کر دیں اور شملہ انگریزوں کے لیے اپنے وطن کا ہی ایک حصہ معلوم ہونے لگا۔ ایسی عمارتیں آج بھی جابجا نظر آتی ہیں۔ جب تک میں نے شملہ نہیں دیکھا تھا میں گینگ ٹاک کو خوبصورت ترین پہاڑی شہر سمجھتا تھا اور کچھ معنی میں یہ تصور آج بھی قائم ہے لیکن بحیثیت مجموعی شملہ شہر اپنی کچھ خصوصیات میں اس سے کم نہیں ہے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ اس سے کافی بڑا ہے اور موجودہ شہری آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے، سرسبزی اور شادابی میں یہ گینگ ٹاک سے بھی بڑھ کر ہے اور گینگ ٹاک کے برخلاف، جو صرف ایک ہی تیغ کوہ (Ridge) کے دونوں طرف آباد ہے، اس کی سات پہاڑیاں مختلف Ridges اور وادیاں بناتی ہیں۔ البتہ یہاں چشمے، ندیاں اور آبشار کہیں نظر نہیں آتے جو سکم اور مغربی بنگال کی خصوصیت ہیں۔ شہر کی بلندی تقریباً دو ہزار دو سو میٹر (سات ہزار فٹ) ہے اور یہی بلندی اس کی صحت بخش آب و ہوا کی ذمہ دار ہے۔ کشمیر کی طرح یہاں بھی چیڑ اور دیودار کے

جنگل پہاڑی حسن میں اضافہ کرتے ہیں ۔ کالکا سے شملہ تک آنے والی شاہراہ تمام دوسری پہاڑی شہروں تک جانے والی سڑکوں سے زیادہ کشادہ اور محفوظ ہے۔ دارجلنگ کی طرح یہاں بھی کالکا سے شملہ تک Toy Train چلتی ہے۔

شملہ میں ٹھہرنے کے لیے ہمارے پاس صرف دو روز تھے اس لیے صرف شہر اور مضافات کے کچھ علاقے دیکھنے کے لیے ۱۶ر جون کو دس بجے ہم لوگ ہوٹل سے نکلے۔ ہم مال روڈ کے بعد لکڑ بازار سے ہوتے ہوئے آکلینڈ کے علاقے میں پہنچے۔ وہاں سے تھوڑے فاصلے پر منڈی جانے والی سڑک سے سنجولی شہر آ گئے۔ اس کے آگے سمنڑی ہے جہاں ایک بلند Ridge کو ایک سرنگ سے پار کرنا ہوتا ہے۔ سرنگ کے اس پار سیبوں کے باغوں کی وادیاں ہیں ۔ سرنگ کے دوسرے طرف شملے کی منڈی ہے اور اس سے گذر کر ڈھلّی کا علاقہ ہے جہاں سے ایک راستہ کفری (Kufri) جاتا ہے اور دوسرا منڈی اور اسی دوسرے راستے پر شملہ سے تقریباً ۲۶ کلومیٹر آگے نال دہرا سے جو دیودار کے جنگل کے درمیان بلندی پر گالف کورس کے لیے مشہور ہے۔ سڑک سے گالف کورس کی طرف جانے کے لیے گھوڑے ملتے ہیں، چنانچہ ہمارے کچھ ساتھی اسی سواری پر اوپر بلندی تک گئے جہاں سے کافی فاصلہ پر دریائے ستلج کا پانی نظر آتا ہے اور وہاں ہی گندھک کے صحت بخش پانی کے چشمے بھی ہیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے ہم آگے نہ جا سکے اور ڈھلّی تک واپس آ کر ہم لوگ کفری جانے والی سڑک پر مڑ گئے (کفری سے شملہ ۱۶ کلو میٹر دور ہے) اور اسی سڑک کے کنارے ہمیں وہ خوبصورت مناظر دیکھنے کو ملے جن کے دیکھنے کی تمنّا لے کر ہم شملہ گئے تھے۔ ڈھلی سے گزر کر ہم لوگ امری پہنچے۔ کفری کے راستے میں یہ ایک انتہائی خوبصورت مقام ہے۔ سڑک سے اوپر بلندی سے دیودار کا جنگل شروع ہوتا ہے اور اس کا

سلسلہ نیچے انتہائی گہری وادی تک چلا جاتا ہے۔ یہ وادی تین طرف سے بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے جن پر کے گھنے جنگل وادی میں جا کر مل جاتے ہیں اور اوپر سے دیکھنے میں لاجواب منظر پیش کرتے ہیں۔ یہ تمام علاقہ جو Reserve Forest ہے جو عرف عام میں گرین ویلی کہلاتا ہے۔ اس کے قریب ہی شملہ کا سب سے مہنگا اور برائے ہوٹل Wild Flower House ہے۔ کفری سے چائل جاتے ہوئے راستے پر کچھ فاصلہ پر چینی بنگلہ ملتا ہے جہاں سے پہاڑی چوٹی تک جانے کے لیے گھوڑے اور یاک ملتے ہیں۔ ہم لوگ چینی بنگلہ سے آگے نہ جا سکے۔ سنا ہے کہ پہاڑ کی چوٹی سے مناظر بے حد خوب صورت نظر آتے ہیں۔ (چائل جس کا فاصلہ شملہ سے تقریباً ۴۵ کلومیٹر ہے کسی زمانے میں مہاراجہ پٹیالہ کا موسم گرما کا مستقر تھا اور سنا ہے کہ اپنے حسن میں سوئٹزر لینڈ کو شرماتا تھا)۔ کیفے للت میں لنچ کے بعد ہم لوگ شملہ واپس آ گئے اور پھر میں ہوٹل سے باہر نہ نکلا اگرچہ میرے ساتھی شام کو مال روڈ کی سیر کے لیے نکلے تھے۔ ۱۷ جون کو میرے بیٹے کے مذکورہ دونوں ساتھی ہمیں سیر کرانے لے گئے۔ ہم پھر سنگرولی ہوتے ہوئے کفری کی سمت گئے اور گرین ویلی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چینی بنگلے سے پہلے ہی بائیں طرف بلندی کی طرف مڑ گئے اور کچھ دور موٹر کے سفر کے بعد Helipad پہنچ گئے۔ میرے خیال میں شملہ کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس سے بہتر جگہ نہیں ہے۔ پہاڑ کی چوٹی کو ہموار کر کے ایک وسیع میدان بنایا گیا ہے اور یہی وہ ہیلی پیڈ ہے جہاں اہم شخصیتیں ہیلی کاپٹر سے اترتی ہیں۔ اس بلندی سے نیچے گرین ویلی کا حسن دوبالا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہیلی پیڈ سے واپسی کے بعد ہمارے میزبان ہمیں سرنگ پار کر کے سنگرولی کے راستے واپس لانے کے بجائے Bye Pass سے لے چلے اور اس راستے پر چل کر ہم نے پورے شملے کو گھیرے

میں لے لیا۔ راستے میں بسنت وہار پڑا جہاں ان حضرات کے فلیٹ تھے۔ کچھ دیر وہاں قیام کرنے کے بعد ہم پھر چلے اور شہر کے دوسری طرف وائسرائیکل لاج پہنچ گئے جہاں اب سینٹر آف ہائر اسٹیڈیز ہے۔ پاس ہی پرندوں کا ایک زو بھی ہے جسے دیکھنے بچے گئے۔ آگے بڑھ کر ملٹری کا میوزیم دیکھا اور اس سے آگے بڑھ کر Mall Road کی ابتدا ہو جاتی ہے لیکن وہاں کار لے جانے کی ممانعت ہے۔ لہٰذا میں وہاں سے اپنے ہوٹل واپس آ گیا اور میرے ساتھی رات تک کے لیے مال کی سیر کو نکل گئے۔

آئندہ روز ہماری واپسی کا دن تھا۔ تقریباً دس بجے ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ راستے کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہماچل کی آخری بستی Parwanoo پہنچے اور وہیں دن کا کھانا کھایا گیا اور میرے بیٹے اپنے ہم زلف کے ساتھ Rope way پر بیٹھنے چلے گئے۔ تقریباً تین بجے ہم لوگ کالکا ہوتے ہوئے چنڈی گڑھ پہنچے اور سکٹر ۹ میں ریلائنس کے دفتر میں چلے گئے۔ وہاں کے انچارج نے ہمارے لیے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا انتظام کر دیا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے ہم لوگ سکٹر ۱۷ کا بازار دیکھنے کے لیے نکلے۔ خواتین دوکانیں دیکھنے چلی گئیں اور میں کار لے کر شہر کو دیکھنے نکل گیا۔ سب سے پہلے چنڈی گڑھ کی جھیل پہنچے جہاں بوٹ کلب بھی ہے۔ انتہائی پر فضا علاقہ ہے۔ اسی سے ملحق Rock garden ہے جس میں ٹوٹے ہوئے چینی کے برتنوں سے بنی ہوئی زمین پر پتھر کی تراشی ہوئی مورتیاں نظر آئیں۔ گارڈن کی چہار دیواری بھی پتھر ہی سے بنائی گئی ہے۔ باہر ایک بڑے بلاک پر بنانے والے صناع کا نام نظر آیا۔ جھیل کے سامنے ہی گورنر کی قیام گاہ ہے۔ میرے داماد شکیل کے ماموں اخلاق الرحمٰن قدوائی اسی روز حیدر آباد سے واپس ہوئے تھے لیکن میرے پاس ان کے یہاں جانے کا وقت نہ تھا۔ راک

گارڈن سے آگے ہائی کوٹ کی عمارت ہے اور اس کے متصل ہی سکریٹریٹ ہے۔ ان تمام جگہوں کو دیکھتا ہوا میں چندی گڑھ یونیورسٹی کا کیمپس دیکھنے نکل گیا۔ خود شہر چندی گڑھ کی طرح یہ کیمپس بھی انتہائی قرینے سے بنایا گیا ہے۔ بہر حال شام کے وقت کیمپس میں سناٹا تھا اور جون کی تعطیل کی وجہ سے وہاں مکمل خاموشی تھی۔ واپسی میں چندی گڑھ کا روز گارڈن بھی دیکھنے کا موقع ملا اور ان تمام جگہوں کو دیکھتے ہوئے ہم سکٹر ۱۷ کے بازار واپس آ گئے جہاں میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے تھے۔ ہم لوگ سیدھے اسٹیشن آئے اور ساڑھے آٹھ بجے شب کو چندی گڑھ لکھنؤ میل سے لکھنؤ واپس آ گئے۔

یہ ہے مختصر حال ہماچل پردیش کے اس مختصر سفر کا۔ اندازہ ہوا کہ شادابی اور حسن میں یہ علاقہ بھی پڑوسی کشمیر سے کم نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ میں دھرم شالہ، کلو، منالی، دلہوزی وغیرہ نہ جا سکا لیکن ان کی خوبصورتی کا کچھ تصور قائم ہو گیا۔ شملے سے کلو جانے میں تین کلومیٹر کی سرنگ سے گزرنا ہوتا ہے جو ہندوستان کی سب سے بڑی سرنگ ہے۔ کلو ویلی کشمیر کے بعد سیبوں کے باغوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ سیب کے علاوہ آلوچہ (Plum)، خوبانی، آڑو، ناسپاتی بھی ہماچل کے خاص پھل ہیں۔ گرین ویلی کے قریب جتنے رس دار اور شیریں Plum اور خوبانی کھانے کو ملے ویسے زندگی میں کبھی نہیں ملے۔ بلا شبہ آم پھلوں کا بادشاہ ہے لیکن ہماچل کے خوبانی اور آلوچے، کشمیر کے سیب، مدینے کی کھجور، مشہد (خراسان) کے انگور اس کی سیادت کو تسلیم کرتے نظر نہیں آتے۔

اختتامیہ

میں نے ۱۱ دسمبر ۱۹۲۴ء کو اس دنیائے آب و گل میں آنکھ کھولی تھی اور آج ۱۱ ستمبر ۲۰۰۶ء کو اکاسی سال، نو ماہ کی عمر میں اپنی اس سرگذشتِ حیات کو مکمل کر رہا ہوں۔ یہ بھی کچھ اتفاق ہے کہ یہ وہ تاریخ ہے کہ جب کہا جاتا ہے کہ ایک بےنوا نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور آج پانچ سال گزرنے کے بعد بھی وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت دنیا کی دوسری بڑی طاقتوں کے تعاون سے دو ملکوں کو مکمل طور سے تباہ کرنے اور لاکھوں بے گناہوں کا خون بہانے کے باوجود اس بےنوا کو نہ پکڑ سکی۔ سبب یہ ہے کہ اس بڑی طاقت کے حکمرانوں نے مسئلہ کو سمجھا ہی نہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں ہے۔ اس کے سربراہ محض دہشت گردی کے تحت وجود میں آنے والے ایک ملک کی مدد میں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں اور خود اپنے ملک کو دُنیا کی سب سے بڑی دہشت گرد طاقت کے طور پر دُنیا بھر میں بدنام کر دیا ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ بموں سے اور زیادہ آگ لگتی ہے، بجھائی نہیں جاسکتی۔ افسوس اس کا بھی ہے کہ اس بےنوا نے اپنی اس ذاتی سیاسی جنگ کو دینی جنگ بنا دیا ہے اور دشمنانِ اسلام کو اسلام کو بدنام کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اگرچہ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ انسانیت کے علمبردار ہونے کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود عیسائی دنیا یہودیوں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ تفریق برت رہی ہے جس کے ثبوت ترکی کو یورپین یونین میں جگہ نہ دینا اور بوسینیا میں مسلمانوں کے قتلِ عام

کے سلسلے میں قاتلوں کے ساتھ عالمی عدالت کا نرم گوشہ ہے۔ وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے جب بربادی کر کے دنیا کے ممالک کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ اب ہر برباد ہونے والے ملک کے عوام ہر قیمت پر اپنی آزادی حاصل کرنا اپنا قومی اور ملّی فرض سمجھتے ہیں۔ خواہ چیچنیا ہو یا افغانستان یا عراق، ان ممالک کو بزورِ طاقت زیادہ عرصے تک غلام بنا کر نہیں رکھا جاسکتا۔

خانۂ آزادگان رہ نہ سکا نور بن
شعلے فروزاں ہوئے جل نہ سکے جب چراغ

میں عمر کے بیاسی سال مکمل کر رہا ہوں۔ میرے سب ساتھی جا چکے ہیں اور پتا نہیں میں خود کس وقت رختِ سفر باندھ لوں۔ اس لمبے عرصے میں اس دنیا میں جو کچھ دیکھا یا محسوس کیا اسے اس لیے صفحۂ قرطاس پر لے آیا کہ پڑھنے والے کچھ نصیحت حاصل کریں۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

❁❁❁❁❁

ہم خاک میں ملنے پہ بھی ناپید نہ ہوں گے
دُنیا میں نہ ہوں گے تو کتابوں میں ملیں گے

اُردو شعری تخلیقات

۱۔ غزالانِ خیال
۲۔ فروغِ شعلۂ دل
۳۔ شاہدانِ معانی
۴۔ نقوشِ زیبا
۵۔ گلزار
۶۔ انفاسِ گرم
۷۔ کہکشاں

فارسی منظوم تخلیقات

۱۔ شعلۂ ادراک
۲۔ خرمنِ گل
۳۔ شبچراغ